احمدیہ کلچر

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

احمدیہ کلچر

اور

دوسرے مضامین

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

اوریئنٹل پبلشرز ٹورنٹو

2414 Major Mackenzie Drive, P.O. Box. 96512

Maple, Ontario, L6A 1B0, Canada

First published by the Oriental Publishers in May 2005

Canadian Cataloguing-in-Publication Data

Perwazi, Pervez,

Ahmadiyya kalchar auwr dosare mazameen / by Pervez Pervazi. Maple, Ontario: Oriental Publishers, c2005.

viii, 307 p.

Cover title InUrdu

Ahmadiyya culture and other articles.

ISBN 1-882494-24-5

1.Ahmadiyya -- Culture 2. Ahmadiyya -- India -- History -- Contemporary literature 3. Ahmadiyya -- Pakistan -- History -- Contemporary literature

4. Ahmadiyya -- Literature -- India -- History -- Contemporary studies

5. Ahmdiyya -- Literature -- Pakistan -- History -- Contemporary studies I. Title. II. Ahmadiyya culture and other articles.

297.86 - - 21st ed. BP 195.5A5 P471 2005

Cover designed by : Nabeel Rana (Nabeel@Canada.com)

Published by : Oriental Publishers, P.O. Box. 96512

2414 Major Mackenzie Drive, Maple, ON L6A 1B0, Canada

Telephone/Fax: 905-814-4987 (Oriental_Pulishers@yahoo.com)

Printed by : Fazl-i-Umar Press, 31 Sycamore Street,

Chauncey, Athens, OH 45710, USA

Tel : 740-797-4811 (bmm@intelliwave.com)

انتساب

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے اساتذہ، طلبا، کارکنان اور درودیوار کے نام!

کہ

اس ادارہ سے وابستگی نہ ہوتی تو اتنی بھرپور زندگی کاہے کو نصیب ہوتی۔

فہرست مضامین

وفیات

سفرنامچے

اظہار سپاس

اس کتاب کی تیاری کے مختلف مراحل میں عزیزی نسیم مہدی، ملک لال خان صاحب، استاذی المکرم مبارک احمد انصاری، کرنل راجہ محمد اسلم، جناب عبدالماجد صدیقی، عزیزی ہدایت اللہ ہادی، جناب نبیل رانا، عزیزی شفیق اللہ اور ڈاکٹر بشارت منیر نے میرا ہاتھ بٹایا۔ ربوہ سے کچھ مضامین کی نقول منگوانا مطلوب تھیں میں نے استاذی صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب مدظلہ کے ذریعہ عزیزی حبیب الرحمن زیروی سے درخواست کی انہوں نے الفضل والوں سے کہا ہوگا الفضل والوں کی طرف سے وہ مضامین ای میل کے ذریعہ موصول ہوئے۔ عزیزہ ساجدہ جوئیہ نے ان مضامین کی کمپیوٹر پر دوبارہ کتابت کر کے میری مشکل کو آسان کر دیا۔ میں ان سب کا از حد شکر گزار اور احسان مند ہوں۔

میرے اپنے کمپیوٹر نے قدم قدم پر میری لاعلمی کی وجہ سے مشکلات کھڑی کیں تو میرے دامادوں عزیزان عرفان احمد، خالد داؤد اور ثمر احمد چوہدری نے وقتاً فوقتاً آ کر اور اپنے اوقات صرف کر کے اس کو درست کیا۔ وجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ میری بیوی اور میرے بچے تو ظاہر ہے اس کتاب کی تیاری کے دوران ہمیشہ کی طرح میری دیکھ ریکھ میں ہمہ تن مصروف رہے اللہ ان کو بھی جزا دے۔

قارئین کا بھی شکریہ کہ انہوں نے یہاں تک پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو امید ہے باقی کتاب بھی ان کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی۔ اللہ ان کے ساتھ ہو۔

دیباچہ

احمدیہ کلچر کے موضوع پر شاید یہ پہلی کتاب ہو! اس کتاب میں آخر کے چند مضامین کے سوا جتنے مضامین بھی شامل ہیں ان کا کسی نہ کسی طریق سے احمدیہ کلچر سے تعلق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل سے احمدی ہے اور یہی پہچان اس کو بس ہے!

میں قادیان میں پیدا ہوا ربوہ میں پلا بڑھا اور پھر ربوہ میں ہی لمبے عرصہ تک خدمت کا موقع ملا۔ کلرک، سکول میں استاد، کالج میں لیکچرار اور پھر کالج میں پروفیسر۔ اس دوران اپنے ماحول کو دیکھنے سمجھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ قادیان کی باتیں اگرچہ پختہ طور پر یاد ہیں مگر عین ممکن ہے ان میں ایسی باتیں بھی شامل ہوگئی ہوں جو میں نے حدیثِ متواتر کے طور پر اپنے بزرگوں اور بزرگ دوستوں سے سنی ہوں۔ میں نے التزام کے ساتھ ایسی باتوں کی تصدیق بزرگوں سے کروائی ہے مثلاً لالہ ملاوامل صاحب کو میں نے قادیان میں دیکھا تھا۔ قبلہ وکعبہ مولانا محمد احمد جلیل مدظلہٗ سے میں نے تصدیق کروائی کہ یہ وہی ملاوامل صاحب تھے جو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں زندہ تھے۔ اسی طرح بعض باتوں کی تصدیق قبلہ محترم سید محمود احمد صاحب نے بھی بلاواسطہ فرمائی آپ جرمنی کے جلسہ پر تشریف لائے ہوئے تھے میں حاضر نہ تھا میں نے فون کر کے انہیں اہلاً و سہلاً کہا۔ فرمانے لگے ”آپ جو باتیں سن سن کر کہہ رہے ہیں وہ باتیں ہم نے دیکھی ہوئی ہیں مگر آپ باتیں ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔“ میں نے ان سے کہا تھا ”قبلہ آپ نے یہ قول تو سنا ہوگا کہ جب دیکھنے والے چپ سادھ لیں تو سننے والے بولنے لگتے ہیں“۔ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ اس نے صحت دی، وسائل مہیا کیے، لکھنے کی توفیق دی اور اب وہ چیزیں جو تقریباً تین سو مضامین کی صورت میں سلسلہ کے مختلف رسالوں اخباروں میں بکھری پڑی تھیں کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ وان تعدو نعمت اللہ لا تحصوہا! اللہ تعالیٰ نے ادبی موضوعات پر جو مضامین اور کتابیں لکھنے کی توفیق دی وہ مستزاد ہے! الحمدللہ علیٰ ذالک۔

پاکستان سے میری دوسری ہجرت کا دور بڑی مشکل کا دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سویڈن میں ٹھکانا مہیا کیا مگر تنہائی اور بیماری نے دھڑ توڑ دیا۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہی تھا کہ قلم پکڑلوں اور اس طرح اپنی تنہائیوں کا ازالہ کروں۔ الحمد للہ، الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی توفیق دی اور پڑھنے والوں کے دلوں میں میرے لکھے کو پڑھنے کی تحریک بھی کی چنانچہ بہت سے بزرگوں دوستوں شاگردوں اور دوستوں کی جانب سے تحسینِ سخن شناس کا اظہار ہوتا رہا۔ سانگھڑ جیسے دور افتادہ شہر میں ایک اجنبی غیر احمدی دوست میرے کسی ایک مضمون کو پڑھ کر ایک احمدی دوست کے ہاں تشریف لائے اور اس جیسے دیگر مضامین کے مطالعہ کا شوق ظاہر کیا اور مہیا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس میں میری کوئی خوبی نہیں جو کچھ ہے وہ سلسلہ عالیہ احمدیہ سے وابستہ رہنے کی برکت ہے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد کے انتقال پر میں نے ایک مضمون الفضل میں لکھا۔ وہ چھپا تو حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب (اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز) کا خط آیا جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ "ابا کے بارہ میں آپ کا خاص اسلوب میں لکھا ہوا مضمون پڑھا ہے۔ جزاکم اللہ"۔ اسی طرح ایک روز ایک صاحب بسبیلِ اتفاق ملے۔ کہنے لگے اگر آپ کے مضامین پر آپ کا نام نہ بھی لکھا ہو تو میں پہچان لیتا ہوں کہ یہ آپ کا مضمون ہے۔ میں نے ان سے تو کچھ نہ کہا اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوا کہ انہیں بھی میرے اسلوب میں سیدی حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الخامس کی طرح کوئی خاص بات نظر آئی۔ اگر میری تحریر میں کوئی خوبی ہے تو وہ میرے اساتذہ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت عطا فرمائے آمین۔

ڈاکٹر پرویز پروازی

مسی ساگا کینیڈا

۲۸ فروری ۲۰۰۵

احمدیہ کلچر

کسی قوم کے اجتماعی رہن سہن اور تمدن کے نتیجہ میں جو رسوم و عادات ان کے معاشرے میں راسخ ہو جاتی ہیں وہ اس قوم کا کلچر کہلاتی ہیں۔ ہم لوگ غیر منقسم ہندوستان میں تھے تو ہمارے معاشرے میں ہند اسلامی کلچر کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لمبے راج کے بعد سارے ہندوستان میں ایک خاص قسم کا کلچر رواج پا گیا تھا جس میں اسلامی روایات کا رنگ بھی تھا اور مقامی ہندو کلچر کی باتیں بھی تھیں۔ یہ اسی کلچرل سمجھوتے کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے دور تک السلام علیکم کہنے کی بجائے ''آداب عرض'' یا ''تسلیمات'' کہنے کا رواج تھا حتی کہ صاحب امیر الروایات کے مطابق شاہ ولی اللہ کے خاندان میں بھی سلام کہنے کا رواج تک نہیں تھا۔ وہ بھی یہی کہتے تھے ''عبد القادر تسلیمات عرض کرتا ہے'' یا '' رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے''۔ اسی قسم کے ثقافتی سمجھوتوں میں کنول کے پھول کی منبت کاری بھی تھی۔ کنول کا پھول ہندوؤں کا مقدس پھول ہے مگر مسلمان اپنی مسجدوں یا امام بارگاہوں یا مقبروں میں اس پھول کی منبت کاری کرتے تھے۔ مصافحہ ترک کرنے اور جھک کر آداب بجالانے یا کورنش بجالانے کی رسوم بھی اسی ثقافتی سمجھوتے کے نتیجے میں مروج ہوئیں۔ اردو زبان بجائے خود ایک ثقافتی سمجھوتا ہے۔ علی ہذ القیاس بہت سی ایسی ثقافتی باتیں تھیں جو ہندو مسلم افہام و تفہیم کے سلسلے میں در آئیں اور ہمارے کلچر کا حصہ بنیں۔ جماعت احمدیہ کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس کی ثقافتی اہمیت سے نئی نسل شاید واقف نہ ہو۔ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الاول حضرت حکیم نور الدینؓ جب حصول تعلیم کے لئے لکھنو پہنچے تو سید ھے حکیم علی حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب اپنے دیوان خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ حاضرین اپنی اپنی نشست پر حسب مراتب گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ نشست و برخواست پر لکھنوی تمدن کی چھاپ تھی۔ بات بات میں تکلف' حرکات و سکنات ایک کڑے ثقافتی بندھن میں جکڑی ہوئی۔ جھک جھک کر آداب و تسلیمات کہنے کا رواج۔ سیدنا نور الدینؓ مجلس میں داخل ہوئے تو پکار کر السلام علیکم کہنے کے بعد آگے بڑھے۔ آپ اس تکلف اور تصنع سے بالکل نا آشنا تھے۔ پاؤں دھول میں اٹے ہوئے تھے سو سفید براق چاندنی پر جو نقش و نگار بنے وہ مستزاد سید ھے

اپنے استاد کے سامنے پہنچ گئے۔ اس محفل میں جہاں پکار کر سلام کہنا تو کجا اونچی آواز میں بات کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا اور بات چیت میں ایک تکلف روا رکھنا لابدی تھا حضرت حکیم صاحب کا سلام سن کر سب حاضرین سن سے رہ گئے۔ ایک جو زیادہ نک چڑھے اور متکلف تھے بول ہی اٹھے ''آپ کس مہذب ملک سے تشریف لائے ہیں اور سلام کہنے کا یہ انداز آپ نے کہاں سے سیکھا ہے؟''۔ حضرت حکیم صاحب نے جھٹ بلا تکلف کہا ''سلام کہنے کا یہ طریق اور بے تکلفی کا یہ انداز رسول عربی دامی کا سکھایا ہوا ہے'' اس جواب سے معترض کے چہرے پر عرقِ انفعال کے قطرے نمودار ہو گئے۔ حکیم علی حسین صاحب نے ان سے کہا'' آپ بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں بھی رہے ہیں کیا آپ نے ایسا مسکت جواب پہلے بھی کبھی سنا ہے؟''۔ یہ بات ہمارے پڑھنے والوں کو عجیب لگی ہوگی کہ اس دربار میں اتنا رکھ رکھاؤ کیوں تھا۔ اس لئے کہ یہی لکھنو کا تمدن تھا دہلی والے اگرچہ تکلف اور تصنع سے کہیں دور تھے پھر بھی ان کے ہاں بھی غالب نے گھر کو گھر نہیں 'محل سرا' ہی کہا ہے۔ بیٹھک کو دیوان خانہ کہا جاتا تھا۔ بات بات میں کورنش بجالانا اور مجرا کرنا ان کا طریق تھا۔ اب یہ مجرا کرنا بھی ہمارے نئے قارئین کے لئے نئی بات ہوگی۔ جھک کر سلام کرنے کو مجرا کرنا کہتے تھے مجرے کے وہ معنی نہیں تھے جو ہمارے عام معاشرے میں مروج ہیں۔

ہم نے قادیان اور ربوہ میں اپنی ثقافت کے جو نمونے دیکھے اس مضمون میں انہیں بیان کرنا مقصود ہے دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمارا کلچر عام کلچر سے کوئی مختلف چیز تھا اور ہے یا محض ہمارا گمان ہے؟ قادیان میں ہمارا ماحول ملا جلا ماحول تھا جس میں ہندو بھی تھے سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے زمانے تک رئیسانہ رہن سہن کا دور دورہ تھا اور وہی طریق مروج تھا جو عام رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر ہوتا تھا۔ عام طریق یہ تھا کہ رئیس خاندان کے علاوہ دوسرے تمام لوگ رعایا کہلاتے تھے اور رعایا کی تعریف میں وہ تمام لوگ بھی آ جاتے تھے جو رئیس نہیں تھے۔ اس ماحول میں رہنے والے دوسرے چھوٹے زمیندار اور معززین بھی رعایا ہی شمار ہوتے تھے مگر ان پر رئیس کا تفوق حکم چلانے کا نہیں تھا۔ صرف نام کی رئیسی چلتی تھی جو نسلاً بعد نسلٍ چلتی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ جب اس خاندان کے تصرف میں نوے گاؤں کی جاگیر ہوگی تو اس خاندان کی نشست و برخواست اور بود و

پاس کیا ہوگی۔ حضرت مرزا غلام احمد تک پہنچتے پہنچتے وہ رئیسی ختم ہو چکی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ دنیاوی رئیسی کے تمام آثار مٹا کر ایک نئی روحانی مملکت کی بنیاد رکھنے والا تھا۔ اس لئے اس کی مصلحتوں کو کون جان سکتا تھا۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کی ساری زندگی اپنی دنیاوی شان وشوکت اور دنیاوی ریاست کی باز یافت کی کوشش میں بسر ہوئی مگر اس میں انہیں ان کی توقعات کے مطابق کامیابی نہ ہوئی اور حضرت مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی ہی میں اس دنیاوی ریاست کے آثار مٹ گئے۔ ازبسکہ خاندانی امارت کے آثار نہ تھے مگر قادیان میں اس خاندان میں اس کے ظاہری آثار قائم رہے مدتوں تک حضرت صاحب کے مضامین کے ساتھ ''رئیس قادیان'' کے الفاظ چھپتے رہے۔

قادیان کا معاشرہ اوسط درجے کا اسلامی رنگ کا معاشرہ تھا۔ ہم نے وہ زمانہ نہیں دیکھا مگر اس زمانے کے حالات کتابوں میں پڑھے ہیں۔ ہمیں اس معاشرے میں سب لوگ ہی مل جل کر رہتے نظر آتے ہیں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا اٹھنا بیٹھنا' باہم مل جل کر ایک دوسرے کی مدد کرنا اس معاشرے میں جاری وساری نظر آتا ہے۔ خود حضرت صاحب کے دوستوں میں بہت سے ہندو شامل تھے اور کئی مقامات پر حضرت صاحب کے ہندو ساتھیوں نے ان کی پاکیزہ زندگی کی گواہی دی ہوئی ہے۔ بعض تو حضرت صاحب کی بعض پیشگوئیوں کے بھی گواہ ٹھہرے۔ ہم نے ملاوامل صاحب کو دیکھا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں وہی ملاوامل صاحب تھے یا ان کی اولاد میں سے کوئی تھے مگر قادیان میں ان کی بڑی عزت تھی۔ مضمون کا یہ حصہ قبلہ محترم مولانا محمد احمدؐ جلیل مدظلہ کی نظر سے گذرا تو حضرت مولوی صاحب نے فرمایا کہ وہی ملاوامل صاحب تھے۔

ہم نے اس معاشرے کے بارہ میں جو کچھ دیکھا اور پڑھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قادیان میں آداب عرض کہنے کا رواج نہیں تھا۔ ہندو مسلمان سکھ آپس میں ملتے تو صرف 'سلام' کہتے تھے پھر ہمارے سامنے جو معاشرہ تھا وہ حضرت خلیفہ ثانیؓ کے زمانے کا معاشرہ تھا اس میں بھی ہم نے ہندوؤں اور سکھوں کو صرف سلام کہتے ہی سنا۔ اباجی کے سکھ دوستوں میں سے ہزارہ سنگھ ہمارے یہاں آتے تو ہم انہیں چاچا جی سلام کہتے اور وہ ہمیں دعا دیتے 'جیتے رہو بیٹا'۔ اسی طرح بازار سے گذرتے ہوئے کئی بار ہندو دکاندار اباجی کو سلام کہتے' مولوی جی سلام' اور اباجی جواب میں یہی کہتے 'لالہ جی سلام' یا 'سردار جی سلام' مگر

اس کلچر میں اور اس کلچر میں جسے ہم احمدیہ کلچر کہتے ہیں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ قادیان اور ربوہ میں نہ صرف السلام علیکم کہنے کا رواج تھا بلکہ تاکید کی جاتی تھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ کہا جائے۔ اس بات کی اتنی عادت پڑی ہوئی تھی کہ لاہور پڑھنے کے لئے گئے تو رستے میں جو بھی ملتا اسے السلام علیکم ضرور کہتے۔ سیر کے دوران ایک صاحب سے روزانہ ہی آمنا سامنا ہوتا تھا۔ ہم انہیں السلام علیکم کہتے تھے وہ جواب تو دیتے مگر ایک روز انہوں نے ہمیں روک لیا کہ معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ ہم نے کہا ہماری شناسائی تو ہے ہی نہیں آپ پہچانتے کیسے؟ ہم تو محض مسلمان جان کر اپنی عادت کے بموجب السلام علیکم کہہ دیتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ آپ جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس صاحب تھے جو ہائی کورٹ کے جج تھے۔ جج صاحب اللہ بخشے بہت ملنسار آدمی تھے مگر ان کے بعض عدالتی فیصلے کافی متنازعہ رہے۔ (ججی سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے عدالت میں ایک درخواست دی تھی کہ ۱۹۷۳ کا آئین کفریات کا پلندہ ہے اس لئے اسے منسوخ کیا جائے)۔ برادرم عزیزم خلیفہ صباح الدین احمد نے بھی کسی دوست کا حال لکھا ہے کہ اسلام آباد میں آپ ہر روز ان سے السلام علیکم کہتے تو ایک روز انہوں نے روک ہی لیا کہ 'آپ بہت السلام علیکم کہہ چکے اب مطلب کی بات بھی کہہ دیجئے'۔ جب خلیفہ صاحب نے سلام برائے ثواب کا فلسفہ چھانٹا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ السلام علیکم کہنا ہمارے معاشرہ کے پلے ہوئے بچوں کی عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے گویا احمدیہ کلچر کا پہلا جزو السلام علیکم کہنا ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اب اگر کوئی احمدی کسی کو السلام علیکم کہہ دے تو وہ قانون کی گرفت میں آجاتا ہے جیسا کہ اس ایف آئی آر میں درج ہے جو سارے ربوہ شہر کے خلاف درج کی گئی تھی کہ احمدی لوگ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے جان بوجھ کر السلام علیکم کہہ دیتے ہیں حالانکہ وہ صرف اپنے کلچر کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ احمدیہ کلچر کی یہی چیز سب سے پہلے ربوہ یا قادیان میں نوواردوں کو حیرت میں ڈالتی تھی۔ دوسرے معاشروں میں اکثریت نام کے مسلمانوں کی بستی ہے مگر یوں سرِ عام اور علی الاعلان بلا تخصیص ہر سامنے آنے والے کو سلام کہنے کا رواج ان میں 'تھا' نہ ہے۔ اسی طرح پرسشِ احوال کے جواب میں الحمد للہ کہنے کا رواج بھی احمدیہ معاشرہ سے مخصوص یا چند ایسے لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جو اسلامی اقدار سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہم اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز اوساکا جاپان میں اردو کے استاد تھے۔ ہمارے

فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ طلباء کو پاکستانی معاشرے کے آداب بھی سکھائیں۔ہم نے اس سلسلے میں جو آڈیو کیسٹ تیار کیا اور بچوں کو سکھایا وہ یہ تھا'' سوال: '' آپ کا کیا حال ہے؟'' جواب: '' الحمدللہ میں اچھا ہوں''۔ ہمارے شاگرد اسی کے مطابق جواب دیتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک پاکستان گئے۔ واپس آ کر ان میں کا ایک بچہ کہنے لگا'' سر آپ نے جو کچھ پڑھایا ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا مگر ہم نے عام پاکستانیوں کو الحمدللہ کہتے نہیں پایا وہ صرف یہ کہتے ہیں میں ٹھیک ہوں''۔ ہم نے اس بچے کو یہی جواب دیا کہ'' بیٹا ہم نے شرفاء کی زبان سکھائی ہے اور شرفاء یہی زبان بولتے ہیں''۔اب ہماری جگہ ہمارے ہی ایک پاکستانی دوست ہیں وہ ہماری ہی تیار کی ہوئی آڈیو کیسٹ سے کام چلا رہے ہیں۔ان سے ایک بار اتفاق سے پاکستان میں ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگے'' یار یہ تم جاپانیوں کو کس الحمدللہ پر لگا آئے ہو؟''۔ ہم نے کہا '' کیوں کوئی غلط بات کی؟''۔ فرمانے لگے'' نہیں غلط تو نہیں مگر میں خود الحمدللہ کہنے کا عادی نہیں تھا اس لئے اول اول بہت دقت ہوئی''۔ باایں ہمہ احمدیہ کلچر میں الحمدللہ کہنا اجنبی لگتا ہے نہ ایسا کہنے کے لئے مشق کرنا پڑتی ہے۔اسی طرح 'انشاء اللہ'، 'ماشاء اللہ' کے الفاظ ہمارے ہاں بغیر کسی تکلف کے استعمال ہوتے ہیں۔دوسرے پاکستانی معاشرے میں ایسا نہیں ہے۔ہاں جہاں کہیں کوئی شخص 'انشاء اللہ' کہتا ہے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ارادہ وہ کام کرنے کا نہیں۔ ہماری ایک شاگرد ہاجی ساں جو آج کل جاپان کی پولیس سروس میں اونچے عہدے پر ہیں پاکستان سے واپس گئیں تو ہمیں کہنے لگیں '' میں انشاء اللہ نو بجے یونیورسٹی نہیں آسکوں گی گیارہ بجے آؤں گی''۔ ہم چونکے اور اس سے پوچھا'' بیٹی یہ تم انشاء اللہ کا نیا استعمال کہاں سے سیکھ آئی ہو؟''۔ کہنے لگی'' پاکستان سے۔ وہاں تو جو کام نہ کرنا ہو اس کے ساتھ انشاء اللہ بولتے ہیں''۔

بات احمدیہ کلچر کی تھی۔ قادیان میں ہم نے ہر کہہ ومہہ کو سر ڈھانپے دیکھا۔ ربوہ میں کچے کوارٹروں میں جو دو چار حکمت کی باتیں دیواروں پر لکھی ہوتی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ'' ننگے سر پھرنا آوارگی کی علامت ہے''۔ ہمارے احمدیہ کلچر میں ننگے سر پھرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور ہے۔ بڑوں کے سامنے تو ننگے سر آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے ہند اسلامی معاشرے میں ایک روایت سر ڈھانپنے کی بھی تھی حتی کہ ہندو عورتیں بھی اپنے سے بڑوں کے سامنے جاتے ہوئے سر ڈھانپ لیتی تھیں اور مسلمان

عورتیں تو ہر نامحرم سے پردہ کرتی تھیں ۔ زیادہ آزاد خیال لوگ بھی 'کانا پردہ' ضرور روا رکھتے تھے ۔ قادیان میں ہم نے یہی دیکھا کہ سب لوگ سر پر پگڑی یا ٹوپی رکھتے ہیں ۔ یہ جو عام مسجدوں میں تنکے کی بنی ہوئی یا کپڑے کی بنی ہوئی ٹوپیاں پڑی ہوتی ہیں کہ نمازی نماز کے وقت سر پر اوڑھ لیں نہیں ہوتی تھیں ۔ جسے سر ڈھانپنا ہوتا تھا وہ نماز کی نیت سے گھر سے چلتا تو سر ڈھانپ کے چلتا تھا ۔ نماز میں سر ڈھانپنا تہذیبی مسئلہ ہے ۔ شرقِ اوسط میں یا ایران عراق شام مصر مراکش وغیرہ میں لوگ باگ ننگے سر نماز پڑھتے ہیں مگر احمدیہ معاشرہ میں سر ڈھانپنے کی روایت رہی ہے اور یہی روایت جاری وساری ہے کیونکہ خلفاء کا اسوہ بھی یہی ہے ۔ ہمارے علماء اب بھی کلاہ پر پگڑی باندھتے ہیں اگرچہ عام معاشرے سے یہ رواج رفتہ رفتہ مٹتا چلا جا رہا ہے ۔ قادیان میں اکثر بزرگوں کو ہم نے پگڑی باندھے ہوئے دیکھا خود ہمارے ابا کسی زمانے میں پگڑی باندھتے تھے ٹوپی تو آپ نے بہت بعد میں شروع کی ۔ ہمیں یاد ہے جو مبلغ باہر کے ممالک میں تبلیغ کے لئے جاتے یا واپس آتے ان کے استقبال والوداع کے لئے سارا شہر سٹیشن پر امڈ پڑتا تھا ۔ مبلغ سر پر سبز عمامہ باندھتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ تبلیغ کے لئے باہر جا رہے ہیں یا تبلیغ کا فرض ادا کر کے واپس آئے ہیں ۔ مبلغین کا آنا جانا' جانا زیادہ' آنا کم کیونکہ جماعت کا جو مبلغ ایک بار باہر چلا جاتا تھا اس کے واپس آنے میں مدتیں گذر جاتی تھیں کیونکہ جماعت کے پاس وسائل نہیں تھے ابتدا میں جماعت کے جو مبلغین باہر گئے ان میں سے حضرت حکیم فضل الرحمٰن صاحب' مولٰینا جلال الدین شمس صاحب' مولٰینا عبدالرحیم نیّر صاحب' مولٰینا نذیر احمد علی صاحب بہت لمبا لمبا عرصہ باہر رہے ۔ ابھی حال ہی میں مولٰینا نذیر احمد مبشر صاحب کا انتقال ہوا ہے آپ نکاح کے بعد تبلیغ کے لئے چلے گئے اور دس برس کے بعد واپس آ کر رخصتی لی ۔ یہ تو جملہ معترضہ درمیان میں آ گیا ورنہ ذکر سر ڈھانپنے کا تھا ۔

قادیان اور ربوہ میں کسی مبلغ کا آنا جانا باقاعدہ ایک جشن کا حکم رکھتا تھا ۔ حضرت صاحب خود بھی سٹیشن پر تشریف لایا کرتے تھے ۔ ایک استقبال کے موقعہ پر ہم نے سٹیشن پر جھنڈیاں لگی ہوئی بھی دیکھیں مگر یہ یاد نہیں کس کا استقبال تھا ۔ بہر طور استقبال اور مشایعت ہمارے کلچر کا حصہ تھا اور اب بھی ہے اگرچہ آجکل یہ فرض دفاتر کے احاطہ میں ادا ہوتا ہے ۔ اسی الوداع یا استقبال کا ایک حصہ دعا تھی ۔ سفر شروع کرنے سے پہلے دعا کرنے کا عام رواج تھا ۔ قادیان کے زمانے سے ہی ہمیں یاد ہے کہ گھر کا کوئی فرد سفر پر روانہ

ہونے لگتا تو پھوپھا جی حضرت مولوی غلام نبی صاحب مصری سے درخواست کی جاتی کہ وہ دعا کروادیں اور دعا کے بعد مسافر سفر پر روانہ ہوتا۔ دیگر لوگوں میں ایسا رواج نہیں تھا۔ وہ لوگ بازو پر امام ضامن باندھ کر نکلتے تھے۔ امام ضامن کا مطلب یہ تھا کہ سفر پر روانہ ہونے سے قبل مسافر کے بازو پر سونے یا چاندی کا کوئی سکہ باندھ دیا جاتا تھا کہ سفر بخیر تمام ہونے پر وہ صدقے میں دے دیا جائے۔ بعض لوگوں کے ہاں باقاعدہ تعویذوں کا رواج بھی تھا اور ہے مگر ہمارے ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا نہ ہوتا ہے۔ دعا ہی سب کچھ سمجھی جاتی ہے۔ مسافر سفر پر روانہ ہوتا ہے تو دعا کر کے چلتا ہے سارے رستے میں دعائیں کرتا ہے کہ مسافر کی دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی مسافر کو سفر میں دعائیں کرنے کی باقاعدہ درخواست کرتے ہیں۔ ہم نے کئی جگہ پڑھا کہ حضرت صاحب نے مسافر کو سفر پر روانہ ہوتے وقت دعا کرنے کی نصیحت فرمائی اور رستے میں کثرت سے استغفار کرنے کی تلقین بھی فرمائی۔ حضرت مولٰنا راجیکی صاحب نے سفر میں استغفار پڑھنے کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ہمارے معاشرے میں استغفار ہی امام ضامن کا نعم البدل تھا اور ہے۔ ہمارے ہاں تعویز گنڈے کا رواج نہیں نہ ہمارے ہاں اس کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔

استقبال و مشایعت کے علاوہ عیادت بھی احمدیہ کلچر کا حصہ ہے۔ بیمار کی عیادت کرنا ثواب سمجھا جاتا ہے دوسرے لوگ بھی عیادت کے لئے جاتے ہیں مگر شاید ان کی نیت عیادت سے ثواب کی نہیں ہوتی یا شاید ہوتی ہو مگر بظاہر دکھاوا زیادہ در آیا ہے۔ احمدیہ کلچر میں عیادت دیگر فرائض کی طرح ایک فرض کے طور پر ہے۔ ہم نے حضرت صاحب کو کئی بار مریضوں کی عیادت کے لئے لوگوں کے گھروں میں جاتے ہوئے دیکھا۔ قادیان میں حضرت صاحب ایک بار ہمارے محلہ میں کسی کے گھر عیادت کے لئے آئے ہوئے دیکھے تو ان کی علالت پر بہت رشک آیا اسی طرح حضرت اماں جانؓ تو ہر بیمار کی عیادت کے لئے دور دراز کے محلوں میں بھی تشریف لے آتی تھیں اور جب تک عمر اور قویٰ نے ساتھ دیا اس پر پابندی سے عمل پیرا ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ ہمارے دوست عبدالسلام اختر کی عیادت کے لئے ہسپتال تشریف لائے تو ہم بھی اس وقت حاضر تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ تو اکثر مریضوں کی عیادت کے لئے آتے جاتے تھے۔ بلکہ یہاں تک التزام تھا کہ ہم ہسپتال میں تھے تو لندن سے امیر صاحب سویڈن کو

ہدایت فرمائی کہ وہ گوٹن برگ سے آ کر حضرت صاحب کی طرف سے ہماری عیادت کریں۔ عیادت بھی اسلامی معاشرت کا لازمی حصہ تھی مگر اس میں بھی دکھاوا در آیا اور بہانہ بن گیا کہ خالی ہاتھ عیادت بھی کوئی عیادت ہے؟

یہ تو خیر ہمارا کلچر کیا ساری دنیا کا کلچر ہے کہ کسی سے ملنے جاؤ تو کوئی چھوٹا موٹا تحفہ لے کر جاؤ مگر اس تحفے کو لازم کر لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیادت بھی بوجھ بننے لگی اور رفتہ رفتہ اس کا رواج ہی کم ہوگیا۔ ہمارے دوست پروفیسر نصیر احمد خاں پر پہلی بار دل کا حملہ ہؤا تو ہسپتال میں ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا کہ کوئی ملاقاتی نہ آئے۔ چنانچہ ان کے کمرے کے باہر ایک کاپی رکھ دی گئی کہ عیادت کے لئے آنے والے دوست اس میں اپنا نام لکھ دیں جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ نصیر صاحب ہسپتال سے گھر واپس آئے تو اس کاپی کو دیکھ کر بہت مایوس ہوئے کیونکہ اس پر کسی ایک نام کا اندراج بھی نہیں تھا کیونکہ کوئی شخص محض کاپی پر اپنا نام لکھ کر اپنی محبت کی تخفیف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ سادہ سی بات تھی کہ مریض کا مفاد متقاضی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے دیا جائے مگر ہوتا یہ تھا کہ جو 'چوہدری' تھے وہ مریض سے ملے بغیر ٹلتے نہیں تھے اور جنہیں واپس بھیج دیا جاتا تھا وہ لواحقین کو کوستے ہوئے لوٹتے تھے کہ انہیں مریض کی عیادت کا موقع کیوں نہیں دیا۔ یہاں ہسپتال میں عیادت کرنے کے لئے آنے والوں پر کوئی پابندی نہیں مگر کوئی عیادت کرنے والا جھانک کے بھی نہیں دیتا۔ عیادت کی انتہا یہ سمجھی جاتی ہے کہ اپنے گھر سے پھول والوں کو ٹیلیفون کر دیا کہ فلاں ہسپتال میں فلاں نام کے مریض کو فلاں وارڈ میں فلاں بستر پر یہ پھولوں کا تحفہ ان کی طرف سے پہنچا دیا جائے اور جسے پھولوں کا تحفہ مل جائے وہ پھولے نہیں سماتا۔

اور تو اور لوگ باگ مرنے والوں کی تعزیت کے لئے آنے کی تکلیف بھی نہیں کرتے۔ ہم ہسپتال میں تھے کہ ہمارے ساتھ کے ایک مریض کا انتقال ہوگیا۔ بچارا کئی دن سے موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا نرس آئی تو ہم نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ کہنے لگی بڑا خوش قسمت مریض تھا اس کے بیٹے نے ایک ہزار میل دور سے اس کے لئے پھولوں کا تحفہ بھیجا ہے۔ اب بھی اس کی میت پڑی دھرا ہے سرد خانے میں۔

عیادت کے ساتھ ہی یہ امر بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ دعا بھی احمدیہ کلچر کا ضروری حصہ ہے۔ یوں تو ہمارے سارے معاشرے میں دعا کا لفظ رچا بسا نظر آتا ہے مگر یہ ''آپ کی دعا ہے'' یا ''آپ کی دعا

ہے'' تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ کہنے والا دعا کا طلبگار رہوتا ہے نہ سننے والے کو دعا سے کوئی سروکار ہوتا ہے۔ بس روزمرہ کا ایک فقرہ ہے جو یونہی بول دیا جاتا ہے۔ مگر احمدیہ کلچر میں دعا محض ایک لفظ نہیں ایک پورا تہذیبی رویہ ہے پرانی تاریخوں میں پڑھا ہے کہ دکن کے فرمانروا دعا گوؤں کو باقاعدہ ملازم رکھتے تھے اور ان کا کام ہی یہ تھا کہ وہ مختلف عرسوں اور بارگاہوں پر باقاعدگی سے حاضر ہو کر دعائیں کرتے رہیں۔ ان پیشہ ور دعا گوؤں میں یہ خدمت وراثتاً چلتی تھی۔ شاہانِ مغلیہ میں یہ دعا گوئی اس حد تک تھی کہ دعا گو حضرات کو باقاعدہ وظائف دئے جاتے تھے مگر اس کے صلے میں ان سے یہ توقع بھی رکھی جاتی تھی کہ وہ حکومت وقت کے فرمانبردار رہیں۔ بعض بادشاہوں کے بارے میں درگاہوں پر جانے کے واقعات بھی درج ہیں مگر جماعت احمدیہ درگاہوں یا مزاروں پر منت مانگنے کے لئے نہیں جاتی۔ جماعت احمدیہ کے ہاں خدا کا تصور زندہ خدا کا تصور ہے۔ احمدیہ کلچر میں خدا سے تعلق کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہر احمدی خدا سے براہِ راست تعلق پیدا کرتا اور اسی سے مانگتا ہے۔ زندہ خدا کا زندہ تصور جماعت احمدیہ کے کلچر کا بنیادی حصہ ہے۔

دراصل عام مسلمان اللہ تعالیٰ کا محدود تصور رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا بولتا تھا۔ سنتا تھا۔ کلام کرتا تھا اب نہیں کرتا۔ جماعت احمدیہ سمجھتی ہے خدا بولتا بھی ہے سنتا بھی ہے جواب بھی دیتا ہے۔ دعاؤں کی اجابت کا یہی یقین دعا کی افادیت کا ضامن ہے۔ یہ ٹھیک ہے جماعت کے افراد جماعت کے بزرگوں یا خلفاء سے دعا کی درخواست کرتے رہتے ہیں مگر ایسا کرنا اپنی دعاؤں کو تقویت دینے کے لئے ہوتا ہے۔ احمدیہ کلچر میں۔ پلے ہوئے لوگ جب دعا کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو محض اوپرے طور پر ایسا نہیں کرتے ان میں سے ہزاروں لوگوں نے خدا کی قدرتوں کا خود تجربہ کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی ہوش میں ہزارہا ایسے لوگ دیکھے جو مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ سے مشرف تھے۔ ہم نے دعاؤں کے ذریعہ معجزے رونما ہوتے دیکھے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ معجزے اب بھی ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ایک بار پاکستان کے آمرِ مطلق نے یہ بیان داغ دیا کہ ''اب معجزے رونما نہیں ہو سکتے۔ وہ وقت گذر گیا''۔ تب خدا نے اسی شخص کو اپنے ایک انذاری معجزہ کا نشانہ بنایا۔ احمدیہ کلچر میں دعا اور خدا کے ساتھ زندہ تعلق اور خدا کی طرف سے دعاؤں کی اجابت کا یقین شامل ہے۔ دوسروں کو ایسا ایقان میسر نہیں اسی لئے وہ دعا کو محض ایک ''

بے جان لفظ'' جانتے ہیں احمدی اسے لفظ نہیں جانتے ایک پورا ردیہ سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ان سے سلوک بھی اسی کے مطابق ہے۔

احمدیہ کلچر میں دعا کرنا دوسروں کو دعا کے لئے کہنا دعاؤں کی انفرادی اور اجتماعی تحریک کرنا بہت اہم امور ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی بیماریوں کے دوران ساری جماعت درد و الحاح اور زاری سے دعائیں کیا کرتی تھی اور یہ دعائیں انفرادی طور پر بھی ہوتی تھیں اجتماعی طور پر بھی۔ نماز میں بھی نماز کے بعد بھی مگر جماعت احمدیہ کے کلچر میں نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا شامل نہیں۔ جماعت کا خیال یہ ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لینا ایسے ہی ہے جیسے آدمی اللہ تعالیٰ کے دربار سے باہر آ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لے نماز بجائے خود ایک دعا ہے اس لئے جماعت احمدیہ کے افراد نماز کے اندر ہی دعا کو روا جانتے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے کلچر میں یہ بات بھی انوکھی ہے کہ جماعت کے اخباروں میں دعا کی تحریک کے لئے باقاعدہ اعلان چھپتے ہیں لوگ اپنے تکلیف میں مبتلا یا بیمار بھائیوں کے لئے دعائیں کرتے اور ان کی بھلائی چاہتے ہیں۔ دوسرے اخبارات آپ کے سامنے ہیں آپ کو کوئی ایسا اعلان کسی اور اخبار میں نظر نہیں آئے گا۔ کہیں کہیں اخباروں میں تعزیتی شذرے نظر آ جائیں گے مگر ان کی حیثیت محض تعزیتی ہو گی کسی کے ارتحال پر پسماندگان کی طرف سے دعائیں کرنے کی درخواست نظر نہیں آئے گی۔ احمدیہ کلچر کی یہ بات دوسروں سے منفرد ہے۔ یہ کلچر زندگی اور موت دونوں کیفیتوں میں دوسروں سے جداگانہ ہے۔ اس لئے جب ملا یہ کہتے ہیں کہ احمدیوں کا کلچر دوسروں سے جدا ہے تو کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کہتے۔ احمدیوں کا کلچر اسلام کے ابتدائی دور کا کلچر ہے دیگر مسلمان اپنے کلچر سے چودہ سو سال آگے نکل گئے ہیں اس تیز بھاگنے والے کی طرح جو اپنی منزل مقصود کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو اور بگٹٹ بھاگے چلا جا رہا ہو اور نہ جانتا ہو کہ وہ سعی رائیگاں میں مبتلا ہے۔ احمدیہ کلچر میں ہر وقت دعا کی گنجائش اور موقع موجود ہے جلسہ سے پہلے۔ جلسہ کے بعد۔ دعوت سے پہلے۔ دعوت کے بعد۔ غرض ہر موقع پر۔ جلسہ سالانہ جب ختم ہوتا تھا تو لاکھوں کا مجمع نہایت تضرع سے دعائیں کرتا تھا اور رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا ہمارے کئی غیر از جماعت دوست جلسہ میں آتے اور اس نظارہ کو دیکھ کر پریشان ہو جایا کرتے تھے کہ لاکھوں لوگ کیوں رو

رہے ہیں؟ کیا انہیں واقعی اس بات کا یقین ہے کہ ان کی دعائیں قبول ہو جائیں گی؟ ۱۹۷۴ء کے جلسہ پر میرے ایک نہایت سینئر سی ایس پی دوست جو اس وقت ایک ڈویژن کے کمشنر تھے میرے ذاتی مہمان کے طور پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ جلسہ کا افتتاح ہوا۔ جماعت نے پہلی بار جلسہ گاہ میں ایف ایس ایف کے سپاہیوں کو مورچہ بند دیکھا۔ جلسہ گاہ کے لئے جو سٹیڈیم تیار کیا گیا تھا اس کے ہر ستون پر ایک ایک مسلح سپاہی ایستادہ تھا۔ بہ ظاہر بھٹو صاحب یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ان کے پاس کتنی مسلح طاقت ہے۔ حضرت صاحب کی افتتاحی تقریر شروع ہوئی۔ ساری کی ساری تقریر قرآنی دعاؤں پر مشتمل تھی۔ ایک دعا بار بار دہرائی گئی کہ ''اے خدا ہمارے دشمنوں پر گرفت فرما اور ہماری زندگیوں میں ہمیں ان کا انجام دکھا''۔ کمشنر صاحب عربی نہیں جانتے تھے مگر دعائیں تو قرآن کی تھیں اور اردو میں دہرائی جارہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کمشنر صاحب کانپنے لگے میں ان کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا تھا انہیں باہر لے آیا۔ میں نے کہا کیا ہوا؟ کہنے لگے جلدی یہاں سے چلو یہ شخص تو دعاؤں سے آسمان کو ہلائے دے رہا ہے ایسا نہ ہو آسمان ٹوٹ پڑے۔ بھٹو صاحب کا زوال ہوا تو انہی کمشنر صاحب نے مجھے جاپان میں خط لکھا کہ تمہارے خلیفہ کی دعائیں قبول ہوگئیں۔ میں نے انہیں لکھا کہ آپ نے ایک کمزور جماعت کی طاقت دیکھی؟

دعاؤں کی قبولیت کا یقین جماعت کے کلچر کا حصہ ہے۔ لاکھوں واقعات ہیں جن میں بیماروں کو شفا ملی انہونی ہونی ہوگئی۔ ناممکن ممکن میں بدل گئے اور یہ سب کچھ احمدیوں کے دیکھتے دیکھتے ہوا۔ دو چار برس پہلے سٹاک ہالم کے ایک فورم نے مجھے جماعت احمدیہ کے عقائد کے بارہ میں اظہارِ خیال کی دعوت دی بعد میں ایک صاحب نے سوال کیا'' کیا آپ ایک دو لفظوں میں جماعت احمدیہ اور دیگر مسلمانوں کا فرق بتا سکتے ہیں؟''۔ میں نے کہا ''جی ہاں''۔ جماعت احمدیہ خدا کو زندہ مانتی ہے دوسرے نہیں مانتے۔ کہنے لگے یہ کیا جواب ہوا؟ میں نے کہا یہی جواب ہے۔ دوسروں کو خدا کے زندہ ہونے کا یقین ہو تو وہ اس کے الہاموں سے انکار کیوں کریں؟

احمدیہ کلچر خدا کے زندہ ہونے کا تصور پیش کرتا ہے اسی لئے دعاؤں کی قبولیت پر بھی یقین رکھتا ہے۔ دعا کا ایک مکمل تشخص احمدیہ کلچر میں موجود ہے۔ دعا کے ساتھ ہی نماز کا ذکر آتا ہے۔ نماز ہر مسلمان پڑھتا ہے احمدی بھی پڑھتے ہیں۔ نماز بھی وہی۔ سجود و قیام بھی وہی۔ مگر ایک فرق اور ہے وہ یہ ہے کہ احمدیہ کلچر

میں نماز فرض جان کر ادا کی جاتی ہے محض رسم کے طور پر ادا نہیں کی جاتی ۔ قادیان اور ربوہ میں نماز کے اوقات میں تمام دکانیں بند ہو جاتی تھیں ۔ کاروبار معطل ہو جاتے تھے کیا برصغیر کے کسی اور مسلمانوں سے بھرے شہر میں بھی ایسا ہوتا ہے؟ یہ سب کچھ خود نمازیوں کی مرضی سے ہوتا تھا ۔ ہمارے کالج میں غیر از جماعت طلباء کی تعداد بہت تھی انہیں ہمیشہ ہی دکانداروں سے یہی شکایت رہتی تھی کہ نماز کے وقت نماز کے لئے دکانیں بند کر دیتے ہیں اگر اس وقت کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ نہیں دیتے بلکہ نماز ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ قادیان میں بھی یہی طریق ہم نے دیکھا تھا بازار میں ہندو دکاندار بھی تھے وہ نماز کے اوقات میں پردہ گرا دیتے تھے ۔ ربوہ میں تو ایسا عام ہوا کہ دکانداروں نے نماز کے اوقات میں چائے تک دینے سے انکار کر دیا اگر کسی نے کہا بھی کہ یہ مہمان ہیں انہیں جلدی جانا ہے تو ٹکا سا جواب ملا تو پھر کیا؟ کیا میں ایک پیالی چائے کے لئے اپنی عاقبت خراب کرلوں؟ نماز کے ساتھ یہ تصور کہ نماز کے وقت دکان بند کر دینا کسی پر احسان نہیں اپنی ہی عاقبت سنوارنے کا سامان ہے ۔ کہیں اور نظر نہیں آتا ۔

یہاں ایک بات یاد آئی ایک بار لاہور کے ایک ڈپٹی کمشنر صاحب نے اعلان کیا کہ ”آئندہ سرکاری اہلکار اس بات کا خیال رکھا کریں گے کہ لوگ نماز کے وقت نماز پڑھا کریں اور یوں ہی وقت ضائع نہ کریں“ ۔ خدا معلوم ڈی سی صاحب کو یہ خیال کیوں اور کیسے آ گیا تھا سارے ملک میں ہاہا کار مچ گئی کہ حکومت کو لوگوں کی نمازوں سے کیا غرض ہے؟ نماز ہر انسان کا اپنا ذاتی فعل اور معاملہ ہے حکومت کو اس سے کیا سروکار ہے؟ وغیرہ وغیرہ ۔ ان دنوں پاکستان ٹائمز لاہور میں انور نامی ایک کارٹونسٹ ہوا کرتے تھے ان کا کارٹونی کردار ننھا تھا ۔ پہلے صفحے پر ننھے کا کارٹون ہوتا تھا ۔ اس خبر کے چھپنے کے اگلے روز ننھے کا کارٹون چھپا ۔ ننھے میاں سجدہ میں پڑے ہیں اور کن اکھیوں سے آتی ہوئی کار کو دیکھ رہے ہیں اور ساتھی سے پوچھ رہے ہیں ”غور سے دیکھ لو ڈی سی صاحب کی کار ہی ہے نا کوئی اور تو نہیں؟“

دراصل یہ سب کچھ گھروں کے اندر سے شروع ہوتا تھا احمدیہ کلچر کا اہم حصہ اولاد کی تربیت ہے ۔ ماں باپ اپنی اولاد کی تربیت ایسے رنگ میں کرتے تھے کہ بچے ایک خاص رنگ میں رنگے جاتے تھے ہر احمدی گھرانے میں گھر کے بڑے نماز کے لئے خاص اہتمام کرتے تھے اور بچوں کو بچپن ہی سے نماز کی عادت ڈالتے تھے ۔ پھر اکثر افراد تہجد کے عادی تھے ۔ تہجد کی نماز پڑھتے ۔ پھر بچوں کو فجر کی نماز کے لئے جگاتے

خود نماز کے بعد بچوں کو درس دینے کے لئے بیٹھ جاتے اور یہ درس قرآن حدیث یا بانیء سلسلہ احمدیہ یا ان کے خلفاء کی کتابوں یا ارشادات پر مشتمل ہوتا اس طرح بچے ابتدا ہی سے اس رنگ میں رنگین ہو جاتے جسے احمدیہ کلچر کا رنگ کہا جا سکتا ہے یہ رنگ چڑھانا بہت مشکل کام تھا اور ہے کیونکہ جب تک ماں باپ خود اس رنگ میں رنگین نہ ہوں بچوں پر یہ رنگ نہیں چڑھتا اور چڑھ جائے تو چھٹائے نہیں چھٹتا ہم لوگوں نے اپنے گھروں میں یہی ماحول دیکھا اور یہ ماحول صرف قادیان یا ربوہ تک محدود نہیں تھا جہاں جہاں احمدی گھرانے تھے ان کا یہی رنگ تھا اور اس میں شہر یا گاؤں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

ہمارے ہاں بیسویں صدی کے تیسرے چوتھے عشرے تک یہ رواج تھا کہ لوگ سفر پر جاتے تو ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی بجائے اپنی جان پہچان کے لوگوں کے ہاں ٹھہرتے تھے گاؤں میں چونکہ ہوٹلوں کا رواج نہیں تھا اس لئے مسافر گاؤں کی مسجد میں ٹھہرتے تھے اور نمازی دیکھتے کہ مسجد میں کوئی مسافر موجود ہے تو اس کے لئے کھانے اور سونے کا بندوبست کر دیتے۔ یہ ہندوستان کا عام کلچر تھا۔ احمدیوں میں یہ ہوُا کہ اگر کوئی مسافر سفر پر روانہ ہوتا تو کسی احمدی دوست کا پتہ حاصل کر لیتا اور بغیر کسی جان پہچان کے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہوتا کہ وہ احمدی ہے اور لو گھر کا سا ماحول پیدا ہو جاتا یہ اخوت احمدیت کی پیدا کی ہوئی تھی۔

قادیان یا ربوہ میں مہمان خانہ موجود تھا دوسرے شہروں میں بھی مہمان خانے یا لنگر موجود ہوں گے مگر ہمارے ہاں کی روایت وہ ہے جسے شرفاء کی روایت کہئے۔ اب بڑے زمینداروں کے ہاں بھی مہمان خانوں کا وجود موجود ہے مگر وہاں ایک دو وقت کا کھانا دے دیا جاتا ہے اور بس مہمان کو مہمان نہیں بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ احمدیہ کلچر میں مہمان کو خاص طور سے احمدی مہمان کو بڑا اہم فرد سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ربوہ میں ہمارے غیر احمدی دوستوں کا کثرت سے آنا جانا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کشائش بھی دے رکھی تھی اس لئے بہت مہمان آتے تھے اور اکثر ایسے مہمان تشریف لاتے تھے جن کا جماعت سے تعلق نہیں تھا ایک دو بار ایسا ہوُا کہ مہمان نے صبح اٹھ کر شکایت کی کہ تم لوگ آرام سے سونے کیوں نہیں دیتے ہو؟ صبح صبح کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے پھر محلے والے بچے سحری کے وقت ہی صلِ علیٰ نبیّنا۔ صلِ علیٰ محمدؐ۔ کے نعرے لگا لگا کر نیند سے چونکا دیتے ہیں تم کوئی ایسا انتظام نہیں کر سکتے کہ ایسا نہ ہو۔ ہم نے کہا کیوں نہیں ہو سکتا ہے تمہیں چنیوٹ چھوڑ آتے ہیں جہاں دو پہر تک پڑے سو گے کوئی جھانک کے بھی

نہیں دے گا۔ یہ اجتماعی طریق ایک صدی میں پیدا ہؤا تھا۔ ہر احمدی اس طریق سے آشنا تھا اس لئے احمدی احمدی گھروں میں مہمان ہوتے تو انہیں کوئی اجنبیت نہ ہوتی دوسرے آجاتے تو اجنبیت محسوس کرتے۔۔

ہمارے دوست مسٹر جسٹس سجاد احمد جان مرحوم ہائی کورٹ کے پھر سپریم کورٹ کے جج رہے پھر چیف الیکشن کمشنر ہوئے۔ ہائی کورٹ کی ججی کے دوران آپ ربوہ تشریف لائے مگر قیام چنیوٹ کے سرکٹ ہاؤس میں فرمایا۔ایک رات وہاں گزاری۔اگلے روز شام کے وقت ربوہ کالج میں تقریر کے لئے تشریف لائے یہ غالباً ۱۹۶۳ یا ۶۴ کی بات ہے۔ربوہ میں چند گھنٹے قیام فرمایا۔شہر میں تھوڑا سا گھومے۔واپسی پر میں انہیں چنیوٹ تک چھوڑنے گیا۔فرمانے لگے''چنیوٹ اور ربوہ میں صرف چھ میل کا فاصلہ ہے مگر دونوں شہروں کے کلچر میں چھ صدیوں کا فرق ہے''۔ پھر بعد کو میرے جاپانی دوستوں نے بھی جو جاپان سے ربوہ آئے اور چنیوٹ میں لکڑی کی مصنوعات خریدنے کے لئے تشریف لے گئے یہی محسوس کیا کہ دونوں شہروں کے کلچر میں بہت تفاوت ہے۔دراصل یہ تفاوت احمدیہ کلچر کا پیدا کیا ہؤا ہے۔چنیوٹیوں کے بارہ میں جناب مشتاق احمد یوسفی کا فرمودہ حرف آخر ہے کہ''چنیوٹی یا میمن پاگل بھی ہوجائے تو دوسرے کی پگڑی اتار کر اپنے ہی گھر میں پھینکتا ہے''۔یہی چنیوٹ کا کلچر ہے۔

ہم احمدیہ کلچر کے اس حصہ کا ذکر کر رہے تھے جس کا تعلق تربیت سے ہے اس تربیت کا ایک حصہ بچوں کی تعلیم سے متعلق تھا ہر احمدی بچہ سکول شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید ناظرہ ضرور پڑھ لیتا تھا ذرا حرف شناسی کی عمر کو پہنچتا تو ماں باپ خود قرآن پڑھانا شروع کر دیتے یا کسی دوسرے کے پاس چھوڑ آتے ہماری پھوپھی بیگم جی قرآن پڑھانے میں بہت مشہور تھیں۔مشہور تھا کہ غبی سے غبی بچے کو بھی قرآن پڑھنے میں طاق کر دیتی ہیں۔ہم نے بھی انہی سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا ہے۔سارے محلے کے بچے ان سے قرآن پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ہمارے گھر کا سارا ماحول ہر وقت قرآن کی تلاوت سے گونجتا رہتا تھا کیونکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بچہ قرآن پڑھنے کے لئے حاضر رہتا تھا وقت کی تخصیص یا پابندی نہیں تھی بچے اپنی سہولت کے مطابق آتے تھے۔یہی حال دوسرے محلوں کا بھی تھا کوئی نہ کوئی ایسا شفیق وجود موجود ہوتا جو بچوں کو بلا معاوضہ قرآن پڑھاتا رہتا۔۔بچوں کو ملا ملوانوں کے پاس نہیں بھیجا جاتا تھا یہ خدمت محلے کی

بڑی بوڑھیاں کرتی تھیں اور خندہ پیشانی سے کرتی تھیں۔ قادیان کا کوئی بچہ ہی ایسا رہا ہوگا جس نے ہماری پھوپھی جی سے قرآن نہ پڑھا ہو۔ ربوہ میں بھی جب تک بینائی اور صحت نے اجازت دی یہ خدمت کرتی رہیں۔

اس قرآن شناسی کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ احمدی بچے بلا تخصیص دوسروں سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ہم ایک بار حیران رہ گئے کہ ہمارے ایک دوست جو بعد کو بڑے سینئر اور عالم فاضل پروفیسر کہلائے ایک بار ہمارے ہاں مہمان تھے۔ صبح صبح آپ نے گھر کے اندر سے ایک چھوٹے سے بچے کی تلاوت کرنے کی آواز سنی تو دنگ رہ گئے۔ پوچھنے لگے "یہ اتنا چھوٹا سا بچہ کون ہے جو قرآن پڑھ رہا ہے؟"۔ ہم نے کہا "ہمارا چھوٹا بھائی ہے نسیم مہدی"۔ کہنے لگے یار تم عجیب لوگ ہو۔ میں اب تک قرآن نہیں پڑھ سکتا کہ ماں باپ نے بچپن میں پڑھایا ہی نہیں۔ بچوں کو قرآن سکھانا احمدیہ کلچر کا حصہ تھا اور ہے۔ ربوہ اور قادیان کی گلیاں صبح صبح قرآن کی تلاوت سے گونجا کرتی تھیں۔

سکول میں میٹرک تک قرآن کا ترجمہ پڑھا دیا جاتا تھا یہ تعلیم لازمی تھی ورنہ بچے کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ قادیان میں تو سکول کے وجود سے پہلے مدرسہ احمدیہ کا وجود تھا جس میں قادیان کے اکثر بچے پڑھتے تھے اور آخر مولوی فاضل کا امتحان پاس کر کے نکلتے تھے۔ مولوی فاضل کا امتحان صرف ان لوگوں کے لئے لازمی نہیں تھا جو مبلغ بننے والے ہوتے تھے شرفا بھی مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنا اپنے لئے باعثِ عزت جانتے تھے۔ مولوی فاضل کے امتحان کو آجکل عربی فاضل کا امتحان کہتے ہیں۔ اے وائے مولویانِ قوم۔ مولوی کا لفظ اتنا بدنام ہوگیا کہ اب یونیورسٹی بھی اسے اپنا کسرِ شان سمجھتی ہے۔ مدرسہ احمدیہ کوئی مولویوں کا مدرسہ نہ تھا یہ جنرل اختر حسین ملک، جنرل عبدالعلی ملک اور بریگیڈیر وقیع الزمان اسی مدرسے کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہاں اس مدرسے کا تخصص تھا کہ اس میں احمدیہ کلچر کو جزو بدن بنا دیا جاتا تھا۔

مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے والے شخص کی معاشرے میں قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی تھی ربوہ میں ہمارے دوست سید عبدالحیٔ پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل کے امتحان میں اول آئے تو شہر میں ان کا دور دور تک چرچا ہوا اور لوگ انہیں دور دور سے دیکھنے کو آئے (وہ تو اب بھی آتے ہیں)۔ پھر ہم نے تو وہ

زمانہ دیکھا ہوا ہے جب غیر احمدی اور احمدی مناظروں میں زور شور سے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ دونوں طرف سے پڑھے لکھے لوگ اکٹھے ہوتے اور خالص علمی ماحول میں مناظرے ہوتے۔ غیر احمدی مناظر اگر بدزبانی پر اترتے تو ہمارے مناظر ملک عبدالرحمٰن خادم مرحوم انہیں انہی کے سکے میں نقد ادائیگی کر دیتے تو بہت لطف رہتا۔ ان کے مناظروں کو لوگ دور دور سے سننے کے لئے آتے تھے پھر مخالف علماء کی بدزبانیاں بڑھنے لگیں تو مناظروں کا رواج بھی کم ہوگیا۔ اور اب۔ اب تو یہاں تک زباں بندی ہے کہ لوگ جو چاہتے ہیں بدزبانی 'بدگوئی کرتے چلے جاتے ہیں مگر احمدیوں کو ان کا جواب دینے کی اجازت نہیں اعتراض کا جواب دینا خلاف قانون ہے۔ یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں۔ یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔ اب جو کلچر تشکیل پذیر ہو رہا ہے وہ نیا صحافتی کلچر ہے کہ جسے بتیس دانتوں میں رہنے والی زبان کا کلچر کہیے۔ وہ زمانے لد گئے جب لوگ باگ مسئلے مسائل جاننے کے لئے بحث کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہمارے دوست محمد اسلم سجاد پھالیہ سے ایک مولوی صاحب کو ربوہ لائے۔ پہلے انہیں حضرت مولینا شمس صاحب سے ملایا' پھر حضرت قاضی محمد نذیر صاحب لائلپوری سے ملایا ان کی تشفی نہ ہوئی تو انہیں لے کر ہمارے گھر آ گئے۔ ہمارے ابا اللہ بخشے تہمد باندھتے اور دیہاتی لباس میں رہنا پسند کرتے تھے کیونکہ ان کی ساری تگ و تاز دیہی علاقوں تک ہی محدود تھی۔ اسلم سجاد ان مولینا کو لے کر آئے۔ بیٹھک میں بٹھائے گئے۔ ابا جی مرحوم اسی طرح تہمد باندھے اوپر بنیان پہنے بیٹھک میں آ گئے پوچھا کیسے تشریف لانا ہوا۔ سجاد صاحب کہنے لگے یہ مولینا پھالیہ سے تشریف لائے ہیں۔ نڈر آدمی ہیں اگر انہیں کسی بات کی سمجھ آ جائے تو کسی سے نہیں ڈرتے۔ ابا جی نے پہلی بات کہی'' درست فرمایا۔ پھالیے سے تشریف لائے ہیں تو ڈریں گے کیوں؟ یہ لوگ تو راتوں کو نہیں ڈرتے تو دن میں کیا ڈریں گے؟ ''۔ پھر مولانا سے ان کا مدعا پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ میں جید علماء سے مل کر آ رہا ہوں میری تسلی نہیں ہوئی۔ ابا جی نے کہا پھر بھی کیا الجھن ہے؟ کہنے لگے'' وفاتِ مسیح کے ثبوت میں کوئی آیت درکار ہے؟''۔ ابا جی نے کہا'' کیا باقی انبیاء آپ نے آیتوں سے مارے ہیں کہ عیسٰی کی وفات کے لئے آیت ضروری ہے؟''۔ مولوی صاحب ایک تو 'رات کو نہ ڈرنے والے' کے خطاب سے جھینپے ہوئے تھے اب تو ایسے چپ ہوئے کہ پھر بول تک کے نہ دیا۔ سجاد صاحب انہیں لے گئے۔ دراصل جو لوگ تحقیق کی نیت سے

آتے تھے وہ تمسخر یا استہزاء نہیں کرتے تھے نہ کج بحثی میں الجھتے تھے جسے حق کی تلاش ہوتی تھی وہ تلاش میں کنارے لگ جاتا تھا۔

احمدیہ کلچر میں عربی کی اہمیت کا ذکر ہو رہا تھا بات دور نکل گئی۔ ہمیں عربی زبان سے واجبی سی دلچسپی تھی اور ہے ہم نے بی اے آنرز البتہ عربی ہی میں کیا اور صوفی بشارت الرحمٰن صاحب کے چہیتے ''عربی دانوں عالموں فاضلوں'' کی کلاس میں سے ہم تنہا عربی آنرز میں کامیاب ہوئے تھے باقی سب رہ گئے تھے مگر اس کے باوجود ہمیں عربی میں دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ بات عربی کی نہیں ایک خاص زاویہ نگاہ کی ہے احمدیہ کلچر میں عربی جاننے کی بہت اہمیت رہی ہے اور ہے۔

ہمارے ماحول میں عالموں کا احترام ایک خاص وصف ہے۔ بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو کسی بھی علم کے عالم ہوں ان کا احترام کیا جائے۔ قادیان میں یا ربوہ میں لوگ علماء کی خدمت میں حاضر ہونا اپنے لئے سعادت کی بات جانتے تھے۔ علماء کی محفلوں میں بیٹھنا بچوں کے ذہن میں کشادگی پیدا کرتا تھا۔ ہمیں بچپن ہی سے سکھایا گیا تھا کہ علماء کی محفلوں میں جانا اور بیٹھنا چاہئے۔ چنانچہ ہم لوگ بہت نوعمری ہی سے بزرگوں کی محفلوں میں جانے لگے تھے۔ حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ۔ حضرت سید سرور شاہ صاحبؓ کی خدمت میں حاضری دینا ہمیں یاد ہے۔ اسی طرح دوست ہمارے پھوپھا حضرت مولوی غلام نبی صاحب مصریؓ کی خدمت میں باقاعدگی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہمیں یہ تو یاد نہیں ہم نے ان بزرگوں سے کیا سیکھا مگر ان کی پاکیزہ صحبتوں کی یاد ذہن میں مستحضر ہے اور یہی کیا کم ہے؟ ربوہ میں ہم حضرت حافظ مختار احمد شاہجہان پوریؓ کی خدمت میں اور حضرت مولٰینا غلام رسول صاحب راجیکیؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ جلسہ سالانہ پر تو لوگ بزرگوں کے گھروں پر ضرور حاضر ہوتے۔ دروازے کھلے رہتے۔ لوگ آتے جاتے رہتے دعا کا دربار عام جاری رہتا۔ فیضان کی باتیں ہوتی رہتیں۔ بچے بھی بیٹھے رہتے ان کے کانوں میں بھی دین کی باتیں پڑتی رہتیں۔ یہ جماعت احمدیہ کا خاص کلچر تھا۔ ہمارے ہاں علماء کا ایک خاص مرتبہ تھا اور اس زمرہ میں ہر علم کے عالم شامل تھے۔

احمدیہ کلچر میں ایک اور بات جزاکم اللہ کہنے کی ہے۔ دوسرے لوگ صرف رسمی شکریہ ادا کرتے ہیں ہمارے ہاں شکریہ ادا کرنا ہو یا احسان مندی کا اظہار کرنا ہو تو جزاکم اللہ احسن الجزاء کہا جاتا ہے۔

دوسرے بھی ایسا کہتے ہوں گے مگر ایسا الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ ہم نے تو سوائے احمدیوں کے کسی اور کو جزاکم اللہ کہتے نہیں سنا۔ جس طرح الیس اللہ بکاف عبدہ والی انگوٹھی احمدیوں کا امتیازی نشان بن گئی ہے اسی طرح جزاکم اللہ کہنا بھی احمدیوں کی امتیازی نشانی ہے۔ احمدی احسان مند لوگ ہیں احسان ناشناس یا ناشکرے لوگ نہیں حالانکہ جماعت کو جماعتی طور پر ایسے ایسے احسان ناشناس لوگوں سے پالا پڑ چکا ہے کہ الامان والحفیظ کہئے۔ ہمارے ہاں انفرادی اور اجتماعی طور پر احسان مندی کا اظہار کرنا کلچر کا حصہ ہے۔ ہم نے اپنے ایک دو مضمونوں میں اپنے ایک دو شاگردوں کے احسانات کا تذکرہ کیا تو ایک صاحب معترض ہوئے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے یہی سیکھا ہے کہ کوئی ذرا سا بھی احسان کرے تو اس کے احسان کا تذکرہ کرو فَاَمَّا بِنِعْمَتِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ۔ یہ اللہ کا احسان ہی تو ہے کہ وہ لوگ ہمیں دور دراز کے ملکوں میں مشاعروں یا ملاقاتوں کے لئے بلاتے اور خدمت کرتے ہیں اس میں ہماری کون سی خوبی ہے؟ بلانے والوں کی خوبی ہی تو ہے۔ ہم خود تو اتنے لمبے لمبے سفروں کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اب آپ کہتے ہیں کہ ہم ان کے احسانوں کا تذکرہ تک نہ کریں؟ ہمارے سامنے حضرت مولوی غلام نبی مصریؓ کا اسوہ ہے۔ ان کا کوئی شاگرد انہیں کوئی چھوٹا سا تحفہ بھی دیتا تو اس کے لئے دعائیں بھی بہت کرتے اور بار بار اس کا تذکرہ بھی کرتے کہ دوسروں کو بھی دعاؤں کی تحریک ہو۔ محترم ملک عمر علی صاحب ان کے خاص شاگرد تھے وہ انہیں ملتان بلاتے۔ اپنے ہاں مہمان رکھتے ان کی خدمتیں کرتے نہ تھکتے تھے اور پھوپھا جی بھی ان کا تذکرہ اسی محبت اور دلی لگاؤ سے کیا کرتے تھے اور ان کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کیا کرتے تھے۔

پھر حضرت مولانا راجیکی صاحب کا اسوہ بھی ہم نے دیکھا ہے۔ ان کے صاحبزادے برکات احمد راجیکی نے ایک بار دفتر خدمت درویشان سے درخواست کی کہ ان کی جانب سے مبلغ دس روپے ان کے والد صاحب کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کردئے جائیں وہ یہ رقم قادیان میں ادا کردیں گے۔ ہم حضرت میاں بشیر احمد صاحب کی ہدایت پر دس روپے کی وہ رقم لے کر خود حضرت مولانا راجیکی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا نے وہ دس روپے لے کر اپنے بیٹے کو اتنی دعائیں دیں اتنی دعائیں دیں کہ کیا بیان کروں۔ آپ نے اسی وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور ہمیں بھی اس دعا میں شامل کرلیا۔ اتنے

تضرع اور ابتہال سے آپ نے دعا کی گویا آستانہ الٰہی کو پگھلا دیں گے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ایک بیٹے کی طرف سے باپ کو ایک حقیر سا نذرانہ تھا مگر ہمیں یہ سبق ملا کہ اپنے بیٹے بھی خدمت کریں تو ماں باپ کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان کے اس احسان کا تذکرہ ہی نہ کریں ان کے لئے دعائیں بھی کریں اور ماں باپ بڑھاپے میں یہی کچھ تو دے سکتے ہیں۔ کیسا خوش نصیب وہ بیٹا تھا اور کیسا خوش نصیب وہ باپ تھا۔ احمدیہ کلچر کا یہ پہلو بھی دوسروں سے ممتاز ہے۔

احمدیہ کلچر میں تعزیت کے قرینے بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں جزع فزع کا تصور نہیں تعزیت کے لئے صرف انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ دینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ فاتحہ یا قل یا تیسرے یا چالیسویں کا رواج ہمارے ہاں نہیں۔ کئی بار غیر احمدی دوستوں کے ہاں تعزیت کے سلسلہ میں جانا ہوا تو بہت دقت پیش آئی کیونکہ جو آتا وہ ''دعائے خیر'' کہہ کر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا لیتا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ ہر شخص آنے والے کے ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا تو ضرور ہے کچھ پڑھتا پڑھاتا نہیں اور اپنی مرضی سے ہاتھ چھوڑ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ فاتحہ محض رواج بنی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں۔ ہاں لوگ پرسہ دینے ضرور جاتے ہیں۔ تین دن تک تو دوست عزیز باقاعدہ آتے ہیں البتہ قبر پر دعا کرنے کے لئے لوگ ضرور جاتے رہتے ہیں۔ احمدیہ کلچر میں اسے فاتحہ نہیں کہتے دعا ہی کہتے ہیں۔ بہشتی مقبرے میں صبح صبح دعا کرنے والوں کا تانتا لگا ہوتا ہے۔ قادیان میں لوگ بہشتی مقبرے میں حاضر ہوتے تو سب سے پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قبر مبارک پر اور حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی قبر پر دعا کرتے پھر دوسروں کی قبروں پر جاتے۔ ربوہ میں حضرت اماں جانؓ، حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے مرقدوں پر پہلے دعا کی جاتی ہے اس کے بعد لوگ اپنے اعزہ کی قبروں پر دعا کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں قبروں پر کوئی منت مانی جاتی ہے نہ کوئی چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔ جہانتک ہماری تربیت کا تعلق ہے ہمیں علم ہے کہ قبروں سے کوئی توقع وابستہ نہیں کی جانی چاہئے۔ دیگر درگاہوں یا مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے ہاں بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا البتہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اسوے سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے مزاروں پر دعا کی نیت سے جانا مستحب ہے کیونکہ حضرت صاحب خود بھی کئی ایک بزرگوں کے مزاروں پر دعا کے لئے تشریف لے گئے۔ اسی طرح ہمارے ہاں

چالیسویں وغیرہ کی دعوت کا بھی کوئی رواج نہیں۔ عام معاشرے میں تو یہ رواج ہے کہ مرنے والا مر جاتا ہے اس کے پسماندگان لوگوں کو کھلا کھلا کر مر جاتے ہیں۔

تعزیت کے لئے آنے والے بھی ہمارے ہاں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ نہیں پڑھتے۔ خاموشی سے آتے' لواحقین سے ملتے' انا للہ پڑھتے اور خاموشی سے بیٹھ کر مرنے والے کے شمائل کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اُذْکُرُوْا مَوْتٰکُمْ بِالْخَیر کا رواج ہے مرنے والے کے عیوب کا تذکرہ مناسب نہیں جانا جاتا۔ مغفرت کی دعائیں ہی کی جاتی ہیں۔

ہمسایوں سے حسن سلوک بھی احمدیہ کلچر کا حصہ ہے۔ ہمسایوں سے اپنوں جیسا سلوک کرنا اسلامی اخوت کا اہم حصہ تھا مگر افسوس کہ لوگ اسے بھول بیٹھے۔ قادیان اور ربوہ میں اس بات کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا اور ہے کہ ہمسایوں سے حسن سلوک کا کوئی موقع ضائع نہ ہو۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے تو باقاعدہ عیدین کے موقعوں پر ہمسایوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ ہمیں یاد ہے قادیان کے زمانے کے ہمارے ہمسائے ملک صلاح الدین صاحب اور پڑوس میں رہنے والے دوسرے خاندانوں سے اتنی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا کہ کوئی اجنبیت کبھی در ہی نہیں آتی تھی۔ بابا ہرسیاں والے' ان کی آل اولاد' بابا جی علی گوہران کی آل اولاد حکیم رحیم بخش کی آل اولاد' بخاری صاحب' ڈاکٹر عبد الرؤف صاحب' مولوی محمد سلیم صاحب' شیخ فضل احمد بٹالوی صاحب سب لوگ ایک ہی کنبے کے افراد لگتے تھے۔ ربوہ میں بھی ہمسایوں سے وہی اپنائیت چلی آتی ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں محاورہ ہے ''حق ہمسایہ ماں جایا'' یعنی ہمسایوں کا حق ماں جائے بہن بھائیوں جیسا ہے مگر ہمارے ہاں اجنبیت بڑھ رہی ہے۔ مغرب میں تو ہمسائیگی کا کوئی تصور ہی نہیں لوگ برسوں دیوار بہ دیوار رہتے ہیں مگر ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں تھا مگر اب ایسا ہو رہا ہے۔ احمدیہ کلچر میں ہمسائے کے حقوق اب بھی قائم ہیں۔ جاپان کی بات ہے' ہمارے پڑوس میں ایک ہمسائے کا انتقال ہو گیا۔ ہم نے اپنے رفیق کار امریکن پروفیسر آسٹن فاریسی صاحب سے کہا کہ تعزیت کے لئے چلنا چاہئے۔ فرمانے لگے نہیں' تیسرا گھر ہے' دوسرا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ کچھ دنوں بعد فاریسی صاحب بیمار ہو گئے۔ ہم عیادت کے لئے اوپر تیسری منزل پر ان کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ تفنن کے طور پر ان سے کہا کہ شیطان کے

کان بہرے کل کلاں آپ کے دشمنوں کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم کیا کریں گے؟ کہنے لگے کیوں اتنی بے مروتی دکھاؤ گے کہ میرے جنازے کو کندھا بھی نہیں دو گے؟ ہم نے کہا نہیں ایسی بات تو نہیں صرف ایک دقت ہے کہ آپ کا مکان بھی تیسرا مکان ہے دوسرے تک تو ہم بلا تکلف جا سکتے ہیں۔ بہت ہنسے۔ تب ہم نے انہیں اسلامی معاشرہ میں ہمسائے کے حقوق کا بتایا۔ فرمانے لگے ایسا تو صرف فرشتوں کے معاشرے میں ہوسکتا ہے۔ احمدیہ معاشرہ کوئی فرشتوں کا معاشرہ تو نہیں پھر بھی ہمارے ہاں ہمسایوں کے حقوق کا لحاظ اب بھی موجود ہے۔ ضرورت میں ہمسایوں کی خبر گیری، بیماری میں ہاتھ پیر کی خدمت اب بھی ہمارے ہاں اسی خوش دلی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

خدمتِ خلق کا لفظ بھی ہمارے ہاں ہی سے شروع ہوا۔ کسی مصیبت کا وقت ہو تو خدام، انصار یا اطفال خدمت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ قادیان کا تو ہمیں یاد نہیں ربوہ میں سیلاب آتا تو اردگرد کا سارا علاقہ پانی میں گھر جاتا۔ خدام خدمت کے لئے میدان میں اتر پڑتے اور اپنی جانوں کی پروا کئے بغیر خدمت پر مستعد رہتے۔ ہم نے کھڑکن گاؤں تک بھی خدام کو کشتیوں میں جاتے اور لوگوں کی جانیں بچاتے دیکھا ہے۔ بھوکوں کو کھانا پہنچانا بھی انہیں خدام کو سزاوار رہا جو اندھیری راتوں میں بھی سیلاب کے پانی میں کشتیاں کھیتے دور دور کے بھوکے پیاسے محصور شدہ لوگوں تک پہنچتے تھے اور انہیں کھانا پہنچاتے تھے۔ بیماروں کے لئے تو خدمتی کیمپ لگتے ہی رہتے ہیں۔ گرمیوں میں بسوں کے اڈہ پر اور سٹیشن پر پیاسوں کو پانی پلانے کا کام بھی جاری رہتا تھا تا آنکہ ایک نیک آدمی کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی اس نے آنکھ بچا کر پانی والے ڈرم میں زہر کی پڑیا ملادی۔ وہ تو خیر گذری کہ کسی دیکھنے والے نے دیکھ لیا اور وہ پانی ضائع کر دیا گیا ورنہ ایک نیا کھڑاگ کھڑا ہو جاتا۔ اس کے بعد بسوں کے اڈہ پر پانی پلانے کا کام روک دیا گیا پانی بیچنے والوں کو کھلی آزادی ہے مگر ربوہ والے پانی نہیں بیچتے جو لوگ بیچتے ہیں وہ ربوہ کے نہیں باہر سے آکر ثواب کا یہ کام کرتے ہیں۔

خدمتِ خلق کا ایک انداز احمدیہ کلچر سے مختص ہے اسے وقارِ عمل کہتے ہیں یعنی رضا کارانہ طور سے سڑکوں، گلیوں، محلوں کی صفائی اور سڑکوں کی مرمت۔ خدام اطفال انصار سب ہی وقارِ عمل میں شریک ہوتے ہیں قادیان میں ہم نے ایک بار حضرت صاحب کو بھی وقارِ عمل میں شریک ہوتے اور اپنے ہاتھ سے پھاوڑا

چلاتے دیکھا۔ پھاوڑے کدالیں تسلے خدام الاحمدیہ والے مہیا کرتے تھے اور محلے کے سب لوگ گلی محلے کی صفائی میں مشغول ہو جاتے تھے اور اس کام میں کسی کو عار نہ تھی یہاں سویڈن والوں کو دیکھا کہ مہینے دو مہینے میں ایک بار سب لوگ مل جل کر اپنے ماحول کی صفائی رضا کارانہ طور پر کرتے ہیں اور ایسے کام میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ انہیں جماعت احمدیہ کے وقار عمل کی بھنک کہاں سے پڑ گئی۔ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید۔

جماعت احمدیہ کے ماحول کے ساتھ بعض الفاظ مخصوص ہیں مثلاً مددگار کارکن۔ ہمارے ہاں دفتروں میں ادنی کام کرنے والوں کو چپراسی نہیں کہا جاتا ان کی عزت نفس کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں مددگار کارکن کہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارا ایک مضمون جماعت کے پرچوں میں مددگار کارکنوں کے بارہ میں چھپا جس میں ہم نے ذکر کیا کہ جماعت احمدیہ ادنی خدمت پر مامور ہونے والوں کے جذبہ اخلاص کی قدر کرتی ہے پھر جماعت کی تنظیموں کا نظام جماعت کے استحکام کا موجب ہے ان کی وجہ سے بھی ہمارے ہاں بہت سے الفاظ ایسے مروج ہیں جو دوسروں کے لئے اجنبی ہیں۔ ہم نے ایک بار احمدیوں کے ایک حلقہ میں جس میں غیر احمدی احباب بھی موجود تھے ایک شعر سنایا ”یوں بوڑھی امنگوں کو جواں سال بنانا۔ انصار کو خدام کے اجلاس پہ لانا“۔ احمدیوں نے کماحقہ داد دی۔ غیر از جماعت شعرا ہمارا منہ دیکھتے رہے۔ بعد میں ہمارے ایک بے تکلف دوست نے کہہ بھی دیا کہ یہ انصار خدام کا کیا سلسلہ ہے؟ ہم نے انہیں بتایا کہ جماعت کی تنظیموں میں بوڑھوں کی تنظیم کے اراکین کو انصار اور نوجوانوں کی تنظیم کے ارکان کو خدام کہتے ہیں تو کہنے لگے اب بات بنی۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ تلمیحات کوئی خاص تلمیحات لگتی ہیں اس لئے ہمیں تو سمجھ میں نہیں آئیں ۔اسی طرح لجنہ کا لفظ ہمارے معاشرہ میں بامعنی لفظ ہے کیونکہ ہمارے ہاں عورتوں کی تنظیم کو لجنہ کہتے ہیں، دوسرے لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔ نظام کے سلسلہ ہی میں جماعت کے انتظامی امور کو چلانے کے لئے انجمن اور تحریک کی تنظیمیں ہیں ان کے عہدیدار ناظر یا وکیل کہلاتے ہیں احمدیوں کے معاشرہ سے ہٹ کر یہ الفاظ بالکل الگ معنوں میں مستعمل ہیں۔ صرف ایک بار ایسا دیکھا کہ پنجاب کے ڈی پی آئی کالجز کے دفتر میں ایک عہدیدار کے دفتر کے باہر ناظر امور عامہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہم فوراً وہاں سے بھاگ لئے کیونکہ اپنی سگرٹ نوشی کی وجہ سے ربوہ کی نظارت امور عامہ کی بلیک لسٹ پر تھے اور

اس نام سے بدکتے تھے۔ الحمدللہ کہ سگرٹ نوشی تو ہم ترک کر چکے ہیں مگر امور عامہ والوں سے بدکنا نہ گیا۔
حکومت کے ضلعی نظام میں بھی بعض عہدیدار ناظر کہلاتے ہیں مگر ہمارے ہاں ناظر کے ساتھ بزرگی، علو مرتبت اور جماعتی عہدیدار ہونے کا احترام شامل ہے۔ جماعت کی یہ تنظیمیں جماعت کے فعال ہونے کی آئینہ دار ہیں۔ بچوں تک کی تنظیم اطفال الاحمدیہ موجود ہے بچیوں کی تنظیم ناصرات موجود ہے۔ ان تنظیموں کے ساتھ جو ذخیرہ الفاظ ہے وہ جماعت کے ماحول میں آزادانہ استعمال ہوتا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔ یہ الفاظ ہمارے کلچر سے خاص ہیں۔

ہمارے احمدیہ کلچر کا ایک حصہ پردہ سے متعلق ہے۔ ہمارے ہاں غضِ بصر کا عام رواج ہے۔ عورتیں برقعہ پہنتی ہیں گلیوں بازاروں میں بے پردہ خواتین نظر نہیں آتیں۔ برقعہ پہننے کا جتنا رواج ربوہ میں ہے اتنا پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں۔ ہماری بچیاں کالجوں یونیورسٹیوں میں پڑھنے بھی جاتی ہیں تو پردہ کی رعایت ملحوظ رکھتی ہیں۔ ہم گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تھے۔ ربوہ سے تین بچیاں ہمارے ساتھ ہمارے ہی کالج میں پڑھنے کے لئے جاتی تھیں ۔تمام اساتذہ جن میں اشد ترین مخالف اساتذہ بھی شامل تھے اس بات کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ اصل پردہ کی رعایت تو ربوہ سے آنے والی بچیاں ملحوظ رکھتی ہیں۔ ان تین بچیوں میں کی ایک بچی ایک بار اپنی بے پردہ کلاس فیلوز کے ساتھ ایک سیمینار میں آ گئی۔ ہم نے جب ایک اجنبی بچی کو اپنے سیمینار میں موجود پایا تو باقی بچیوں سے اس اجنبی بچی کے بارہ میں پوچھا کہ آپ کی تعریف؟ وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئیں۔ وہ بچی کہنے لگی ’’سر آپ نے پہچانا نہیں؟ میں فلاں ہوں اور روز آپ کے ساتھ موٹر میں ربوہ سے آتی ہوں آج میں اپنی والدہ کی اجازت سے پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہوں‘‘۔ فی زمانہ پردہ بھی احمدیہ کلچر کا حصہ بن گیا ہے۔ احمدیہ کلچر کی یہ پہچان ایک صدی میں جا کر بنی ہے دو چار برس میں نہیں بنی۔ اتنا ہی کیا کم ہے کہ جماعت احمدیہ نے سو سال کے اندر اپنی علیحدہ ثقافتی پہچان بنالی۔

ہم نے جماعت احمدیہ کے کلچر کی اتنی باتیں بیان کر دیں مگر ایک ضروری بات نظر انداز کر گئے۔ وہ پہلو شادی بیاہ کا پہلو ہے۔ ہمارے ہاں نکاح کا اعلان عین شادی کے وقت بھی کیا جاتا ہے اور پہلے بھی۔ عام طور سے نکاح کا اعلان مسجد میں کیا جاتا ہے۔ حق مہر عموماً دولہا کی چھ مہینے کی آمدنی کے برابر مقرر کیا جاتا

ہے۔شادی بیاہ کے معاملہ میں بھی بڑی سادگی روا رکھی جاتی ہے۔ڈھول ڈھمکے کا رواج نہیں ہے۔
بارات شہر سے باہر کی ہو تو کھانا دینے کا رواج ہے ورنہ نہیں صرف مشروبات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔یہ کھانا
کھلانے کا رواج بھی اب آ کے ہؤا ہے پہلے نہیں تھا۔نکاح کا اعلان مسجد میں ہوتا تھا اس کے بعد
چھوہارے بانٹ دئے جاتے تھے اللہ اللہ خیر سلا۔حضرت صاحب کی بچیوں کی شادی بیاہ میں بھی یہی
سادگی روا رکھی جاتی تھی۔ہمیں اپنے گھر میں بھائی جان محمد احمد نعیم کی شادی کا یاد ہے۔ان کے ولیمے میں
محلے کے کچھ لوگ شامل ہوئے تھے یا بھائی جان کے کچھ استاد۔آپا امتہ السلام مرحومہ بیاہ کر آئیں تو ان
کے جہیز کے سامان میں دو چار برتن تھے اور کپڑوں کے دو جوڑے۔ یہی احمدیہ کلچر کا رواج تھا۔ ہمارے
ہاں جہیز کا تصور بھی بہت سادہ ہے۔ماں باپ اپنی استطاعت کے مطابق بیٹی کو سادہ سامان اور دو چار
جوڑے کپڑوں کے دیتے تھے جہیز کی نمائش کا رواج تھا نہ اب ہے۔ ولیمہ کی دعوت تو سنت ہے اس میں
بھی حتی الوسع سادگی ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ ہم نے ایک ولیمہ ایسا بھی دیکھا جس میں لوگ اپنے اپنے
گھروں سے کھانا لائے تھے اور دولہا کے گھر ایک جگہ بیٹھ کر اکٹھے کھا لیا تھا۔ایسا تو بہت مرتبہ دیکھا کہ لنگر
والوں نے جماعت کی طرف سے ولیمے کی دعوت کر دی۔ دعوتوں میں حضرت صاحب کے ارشاد کے
مطابق ایک کھانا ہوتا تھا حد ہوئی تو ایک کھانا میٹھے کا اور بس۔

جماعت میں مشہور طریق ایک کھانے کا طریق بھی رہا۔ یہ دراصل تحریکِ جدید کے مطالبات میں سے
ایک مطالبہ تھا۔حضرت صاحب نے بیرونی ممالک میں تبلیغ کے لئے تحریک جدید کا اجراء کیا تو جماعت
سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ کھانے میں بچت کرے اور گھروں میں صرف ایک کھانا پکایا جائے۔ایک بار
ایک مہمان جو انگریزوں کے دور میں بہت مشہور سیاست دان اور حکومت کے بڑے عہدیدار تھے (سر
فضلِ حسین) قادیان حضرت صاحب سے ملاقات کے لئے آئے۔کھانے کے لئے میز پر گئے تو کھانے
کی میز پر چار قسم کے کھانے تھے۔آپ نے کن اکھیوں سے دیکھا اور چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ
آئی۔حضرت صاحب فوراً سمجھ گئے کہ ان کا خیال ہے میں جماعت والوں کو تو ایک کھانے کی تاکید کرتا
رہتا ہوں مگر خود میرے دسترخوان پر ایک سے زیادہ کھانے موجود ہیں۔حضرت صاحب نے ان سے کہا
جب مجھے آپ کے تشریف لانے کی اطلاع ہوئی تو میں نے اپنی چاروں بیویوں کے ہاں کہلا بھیجا کہ جو جو

کھانا پکا ہو وہ بھیج دو کیونکہ مہمان آ گئے ہیں۔ چنانچہ یہ جو چار کھانے آپ کو نظر آ رہے ہیں یہ اس وجہ سے ہیں ورنہ ہر گھر میں ایک کھانا ہی پکا ہوا ہے۔ بات تو شادی بیاہ کی تھی۔ شادی بیاہ کے کھانوں میں بھی وہی سادگی ملحوظ رہتی تھی۔ جماعت کا ایک کھانے کا طریق یہاں بھی لاگو تھا۔ ایسا نہ کرنے والے کے خلاف تادیبی کارروائی ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں رخصتی کا طریق بھی بہت سادہ ہے۔ بارات آئی۔ دولہا کے ساتھ کوئی بزرگ بیٹھ گئے۔ نکاح پڑھانا ہوا تو نکاح پڑھایا اگر نکاح ہو چکا ہے تو صرف رخصتی کی تقریب ہوئی۔ اس تقریب کا بھی ایک لگا بندھا طریق چلا آ رہا ہے اور عموماً ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تلاوت ہوئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعائیہ نظم ''یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی'' کسی نے خوش الحانی سے پڑھ دی یا کسی نے اس تقریب کے لئے کوئی خاص نظم لکھی ہے تو وہ پڑھ دی گئی اس کے بعد دعا ہوئی اور لڑکے والے دلہن کو لے کر رخصت ہوئے۔ سادہ ترین رخصتی ہماری یادداشت کے مطابق ہمارے دوست روشن دین تنویر مرحوم کی تھی۔ ادھر مولینا راجیکی صاحب نے مسجد میں نکاح کا اعلان فرمایا ادھر تنویر صاحب اپنی دلہن کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا کہ چلئے نکاح تو ہو گیا۔ وہ بی بی برقعہ پہن کر ساتھ ہو لیں۔ ہم اپنی بیٹی فرحت تنویر کو یہ بات بتاتے ہیں تو وہ مانتی نہیں اور اماں سے پوچھنے میں شرماتی ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ جماعت احمدیہ کے کلچر کا محور خلیفہ وقت کی ذات ہے۔ خلافت سے جماعت احمدیہ کا خاص تعلق ہے۔ اسی تعلق کی وجہ سے جماعت کی مرکزیت قائم ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے وصال پر جماعت میں اختلاف ہوا۔ کچھ لوگ جو خلافت کے حق میں نہیں تھے جماعت سے علیحدہ ہو کر لاہور چلے گئے اور اس ایک صدی میں اپنا تشخص کھو بیٹھے۔ جماعت کے ایک بڑے حصہ نے خلافت کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھا اور اس تعلق نے جماعت کو دن دونی رات چوگنی ترقی سے ہمکنار کیا۔

جماعت احمدیہ میں خلافت کا تصور دنیا کی دوسری امامتوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کوئی سیاسی رہنمائی یا امامت کا مسئلہ نہیں نہ ہی کوئی گدی نشینی کا مسئلہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پہلے خلیفہ حضرت حکیم مولوی نور الدینؓ نہ ہوتے۔ پچاس کی دہائی میں بھی بعض منافقین نے جماعت میں فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں خائب و خاسر کیا۔ جماعت کے خلیفہ کا براہِ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے۔ یہ کوئی کتابی بات نہیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ ہوتے دیکھا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے

وصال پر یہ معجزہ ہوا اور جماعت نے جان لیا کہ خدا ہی خلیفہ بناتا اور اسے اپنی تائید سے نوازتا ہے۔
حضرت مرزا ناصر احمد صاحب سے ہمارا استادی شاگردی کا تعلق بھی رہا پھر ہم نے ان کے رفیق کار ہونے کا اعزاز بھی پایا۔ جس روز وہ خلافت کے مقام پر فائز ہوئے ان کی شخصیت ہی بدل گئی یوں لگا گویا پرانے مرزا ناصر احمد کی جگہ کسی نئے مرزا ناصر احمد نے جنم لیا ہے۔ ان کی ساری سختی ملائمت میں بدل گئی ہم نے پہلی باران کی بیعت کی تو ان کی آواز بھی بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایسے لگتا تھا ان کی زبان سے کوئی اور بول رہا ہے۔ پہلا خطبہ دینے کے لئے آئے تو ساری جماعت حیران رہ گئی کہ یہ وہی مرزا ناصر احمد ہیں جن کی تقریر میں روانی نہیں تھی؟ خدا لگتی بات یہ ہے کہ ان کی جلسہ سالانہ کی تقریروں کے دوران ہم لوگ بہانے بہانے سے اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے۔ مگر خلیفہ کیا بنے اللہ تعالیٰ نے ان کی باتوں میں تاثیر اور تقریروں میں روانی پیدا کر دی وہی تقریریں معرفت کا بہتا ہوا دریا بن گئیں۔ یہ تو ہماری اپنی بات ہے کہ احمدی ہیں۔ حضرت صاحب کے پرانے دوست اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں جو احمدیت کے مشہور معاند ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ربوہ تشریف لائے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے ملاقات کے بعد واپس جاتے ہوئے مجھے کہنے لگے ”پروازی یہ وہ پرانے مرزا ناصر احمد تو نہیں ہیں“۔ میں نے کہا ”درست فرمایا ہمارا بھی یہی خیال ہے“۔ یہ گواہی کسی احمدی کی نہیں ایک ایسے شخص کی ہے جو مدتوں یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور سینیٹ میں ان کا رفیق کار رہا۔ انہیں بھی یہی محسوس ہوا کہ مرزا ناصر احمد کی شخصیت میں انقلاب آ گیا ہے۔

جماعت احمدیہ اپنے خلیفہ کو اپنا روحانی پیشوا مانتی ہے اور ان کے مرتبے کے مطابق ان کا احترام ملحوظ رکھتی ہے۔ ہم نے بڑے بڑوں کو خلیفہ وقت کے سامنے گنگ ہوتے دیکھا ہے۔ ایک بار تنویر صاحب مرحوم کو دیکھا کہ شلوار قمیض اچکن پہنے اور سر پر ٹوپی اوڑھے خوش خوش چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے کہا خیر باشد آپ اس لباس میں کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہنے لگے ”حضرت صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔ یاران کے سامنے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ حالانکہ ہم کالج میں آتے تو ان کے ساتھ سو او نچ نیچ کر لیتے تھے۔ کہنے لگے ایک شعر ہو گیا ہے سنو ”مست ہیں جو بادہ ء پندار میں۔ لڑکھڑاتے ہیں ترے دربار میں“۔ یہ رعب خلافت اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ حضرت خلیفہ رابع کا اور ہمارا عمروں کا کوئی زیادہ تفاوت بھی نہیں تھا کچھ

تھوڑی بہت بے تکلفی بھی ان کے ساتھ خلافت پر فائز ہونے سے پہلے رہی۔ مگر جس روز خلیفہ ہو گئے ہم ان کے سامنے جاتے ہوئے گھبراتے ہیں حالانکہ وہی مرزا طاہر احمد ہیں جو ادبی محفلوں میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر غالب کے کلام پر بحث کیا کرتے تھے۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے وہ دن بھی دکھایا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ ہمارے شاگردوں میں سے ہیں مگر اب ان کا مرتبہ مرشد کا ہے ہم انہیں سیدی و مولائی ہی لکھتے ہیں اور یہی ان کو سزاوار ہے۔

احمدیہ کلچر کا ایک حصہ خلافت کے ساتھ ناقابلِ شکست تعلق کا بھی ہے بچوں کو بڑوں کو سبھی کو خلافت کے مرتبے کا ادراک ہے۔ جماعت جانتی ہے کہ خلافت سے تعلق ہی جماعت کی زندگی اور یکجہتی کا ضامن ہے۔

لوگ خلیفہ کے ہاتھ ضرور چومتے ہیں مگر ان کے پاؤں کو ہاتھ نہیں لگاتے کہ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں جماعت احمدیہ والے اپنے امام کو کوئی مافوق الفطری شے نہیں جانتے۔ ہاں انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ہمارا امام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اس لئے وہ ہر مسئلہ میں اس سے رہنمائی چاہتے ہیں اور بہ ظاہر ایسی ہدایات بھی جو مناسب نظر نہ آتی ہوں امام کے کہنے پر ان پر عمل ہوتا ہے تو وہی باتیں صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ خلافت کی غیر مشروط اطاعت جماعت احمدیہ کے ایمان کا حصہ ہے۔

اور اب بات وہاں آ گئی جہاں سے جماعت کے وسائل کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ ساری دنیا حیران ہے کہ جماعت کے پاس اتنے وسائل کہاں سے آ گئے ہیں کہ ساری دنیا میں اس کے مشن کام کر رہے ہیں اور اب تو لوگ اور بھی جلنے لگے ہیں کیونکہ جماعت نے سیٹیلائٹ ٹی وی قائم کر لیا ہے اور یہ تو بڑی بڑی حکومتیں نہیں کر سکیں۔ جماعت نے یہ کام کیسے کر لیا؟ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ سمجھ تو ہمیں بھی نہیں آتی مگر اصل بات یہ ہے کہ خدائی کاموں کا انحصار انسانوں پر نہیں ہوتا۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں دلی کے ایک بہت بڑے ادیب جو احمدی نہیں تھے قادیان تشریف لے گئے۔ واپس آ کر اپنے اخبار میں ایک روزنامچہ لکھا جس میں بیان فرمایا کہ قادیان کے درختوں پر چڑیاں بھی "چندہ چندہ چندہ چندہ" کر کے پکارتی تھیں۔ بات ٹھیک ہے۔ جماعت کے مالی وسائل کا کلیتہً انحصار جماعت کے چندے پر ہے ہر شخص اپنی آمد کا سولہواں حصہ جماعت کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے جو موصی ہیں وہ دسواں بعض

اوقات اس سے بھی زیادہ حصہ جماعت کو دے دیتے ہیں تا کہ تبلیغ اسلام کے کام میں صرف ہو۔ ہمارے استاد مکرم ماسٹر نذیر احمد رحمانی مرحوم کی تو چوتھے حصے کی وصیت تھی اس کے علاوہ موقع بموقعہ خلیفہ وقت مختلف مہمات کے لئے چندوں کی تحریک کرتے رہتے ہیں اور جماعت ان پر بھی لبیک کہتی رہتی ہے جماعت نے ان چھوٹے چھوٹے چندوں سے بڑے بڑے کام کر لئے ہیں۔

مدتوں پہلے ہماری ایک نظم الفضل انٹرنیشنل لندن میں چھپی جس میں اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ جو کام دنیا کے دولتمندوں سے نہ ہو سکے ''وہ کام کر لئے ہم نے حقیر چندوں سے''۔ حضرت صاحب کو ہماری یہ ترکیب ایک آنکھ نہیں بھائی۔ حضرت صاحب نے بڑی محبت سے سرزنش فرمائی کہ چندوں کے لئے حقیر کا لفظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ خلیفہ کو جماعت کے چندوں کی کتنی غیرت ہے جماعت ہر تحریک پر لبیک کہتی ہے تو خلیفہ کو ان کے چندوں کی غیرت کیوں نہ ہو؟ ہم نے اس نظم میں سے یہ مصرعہ ہی نکال دیا۔

احمدیہ کلچر کا نمایاں ترین پہلو قربانی کا جذبہ ہے۔ مرد ہوں یا عورتیں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ سب ہی اپنے اپنے میدان میں مالی قربانی کے لئے ہر لحظہ تیار رہتے ہیں یہی چیز دوسروں کو سمجھ نہیں آتی۔ اب یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ احمدیوں کے فتنے کا سد باب کرنے کے لئے مسلمان حکومتیں مل کر ایک ٹی وی سٹیشن قائم کریں۔ بھئی کریں۔ ہمیں تو خوشی ہوگی کہ اللہ رسول کا نام بلند ہوگا مگر اس بات کا خدشہ بھی ہے کہ اس بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ ہر ملا کی خواہش ہوگی کہ ہر وقت اسی کے ''ارشادات'' نشر ہوتے رہیں دوسروں کے ارشادات کیوں نشر ہوں؟ ایسا ٹی وی بن جائے گا تو ایک طرفہ تماشا ہوگا۔ جس عمارت کی بنیاد ہی نفرت پر استوار ہوگی وہ بھلا کاہے کو استوار ہوگی ''خشتِ اول چوں نہد معمار کج۔ تا ثریا ے رود دیوار کج''۔

جماعت کے وصیت کے نظام کے بارہ میں ایک منافق نے ایک بار پھبتی کہی کہ جماعت اب تک تیس ہزار سے زیادہ موصی پیدا نہیں کر سکی۔ ہم نے کہا درست۔ تم کوئی ایک ہی ایسا نظام ہمیں بتا دو جس میں ایک موصی موجود ہو جس نے مستقلاً اپنے وسائل کو ایسی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہو۔ وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

میرا مرشد

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی بانیء سلسلہ احمدیہ کے جدِ امجد مرزا ہادی بیگ صاحب وسطی ایشیا کے ایک معزز ایرانی نژاد فارسی گو حکمراں خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے اور سبز شہر (سمرقند) کے حاکم تھے، تیمور نے انہیں جلاوطن ہونے پر مجبور کیا تو وہ مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے وقت میں ۱۵۳۰ کے قریب ہجرت کر کے اپنے اہلِ خانہ اور کوئی دو سو کے قریب سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئے اور پنجاب کے اس علاقہ میں آباد ہوئے جسے بعد میں برطانوی نظام مالداری کے تحت گورداسپور کے ضلع کا نام دیا گیا اور ایک وسیع رقبہء زمین پر اپنی ملکیت قائم کر کے ایک بستی آباد کی جسے اسلام پور کے نام سے موسوم کیا اور دستورِ زمانہ کے مطابق اس بستی کے گرداگرد ایک بیس فٹ اونچی اور اٹھارہ فٹ چوڑی فصیل بھی تعمیر کی جس کے آثار انیسویں صدی کے اواخر تک موجود تھے۔ وسطی ایشا کے ایک معزز شاہی خاندان کا فرد اور ذی علم آدمی ہونے کی بنا پر دہلی کے حکمران مغلوں کی جانب سے مرزا ہادی بیگ کو عدالت کے فرائض سپرد کئے گئے۔ بدیں وجہ ان کی بستی عرصہء دراز تک اسلام پور قاضی کے نام سے جانی جاتی رہی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ نام مختصر ہوتے ہوتے صرف قاضیاں رہ گیا اور دو صدیوں کے بعد اب اس کا معروف نام قادیانؔ ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں اس خاندان کو سینکڑوں دیہات پر مالکانہ تصرف حاصل رہا۔ مرزا ہادی بیگ کی نویں پشت میں مرزا فیض محمد تھے جنہیں سلطنت مغلیہ کی جانب سے ہفت ہزاری کا اعزاز اور عضدالدولہ کا خطاب حاصل تھا۔ اس وقت اس تعلقہ کی سالانہ آمدنی آٹھ لاکھ روپے تھی۔ مرزا فیض محمد کے بعد ان کے صاحبزادے مرزا گل محمد خاندان کے سربراہ بنے۔ یہ بہت نیک دل اور پارسا بزرگ تھے اور دہلی کی سلطنت مغلیہ سے نہایت قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ ان کی علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ ایک سو کے قریب علما و صلحا اور حفاظ قرآن ان سے وابستہ تھے جنہیں ان کے دربار سے وظیفے عطا کئے جاتے تھے اور اس طرح ان کے ماحول میں قال اللہ وقال الرسول کا چرچا رہتا تھا۔ ان کے ملازمین اور متعلقین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو تارک نماز ہو حتی کہ ان کے ہاں چکی پیسنے والی عورتیں تک نماز پنجوقتہ کی پابند اور تہجد گذار تھیں۔ مرزا گل محمد ۱۸۰۰ میں فوت ہوئے۔ یہ بانیء سلسلہ احمدیہ کے پردادا تھے۔ ان کے بعد مرزا عطا

محمد خاندان کے سربراہ بنے۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کا انتزاع شروع ہو چکا تھا اور پنجاب میں سکھوں کی طاقت بڑھ رہی تھی حتیٰ کہ ۱۸۰۲ میں سکھوں نے اس بستی پر ہلہ بول دیا اور قادیان کے رئیسوں کی جائیدادوں کتب خانوں اور مساجد کو نذرِ آتش کر دیا اور انہیں قیدی بنالیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کو رہائی ملی تو یہ لوگ ہجرت کر کے دریائے بیاس کے پار ریاست کپورتھلہ میں واقع بھاگووال نامی جگہ میں پناہ گزین ہوئے اور کوئی پندرہ سال کا عرصہ عملاً مہاجرت میں بسر کیا۔

۱۸۱۴ میں مرزا عطا محمد کا انتقال مہاجرت کی حالت میں ہوا۔ ان کے اولوالعزم صاحبزادے مرزا غلام مرتضیٰ ان کی نعش کو نہایت حوصلہ شکن حالات کے باوجود قادیان لائے اور انہیں اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا انہی مرزا غلام مرتضیٰ نے ان کی جانشینی کی مسند سنبھالی۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی سلطنت کی وحدت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو مرزا غلام مرتضیٰ کو واپس قادیان آنے کی اجازت ملی۔ اس احسان کے اعتراف میں مرزا غلام مرتضیٰ اس کی فوج میں شامل ہو گئے اور کئی معرکوں میں اس کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ مہاراجہ نے ان کی شجاعت کے صلہ میں ان کی خاندانی جائیداد میں سے پانچ دیہات انہیں واگذار کر دئے۔

۱۸۳۹ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے ساتھ ہی سکھ سلطنت بکھرنے لگی۔ انگریزوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ امی جمی ہونے کے بعد انگریزوں نے مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کی قادیان اور ارد گرد کے کچھ گاؤں پر ملکیت تو تسلیم کر لی مگر باقی کے پانچ گاؤں انہیں نہیں لوٹائے۔ ہاں اشک شوئی کے لئے انہیں سات سو روپے سالانہ کا گذارہ دار بنا دیا۔ المختصر بانیء سلسلہ احمدیہ کی پیدائش یعنی ۱۳ فروری ۱۸۳۵ تک ماضی کی دنیاوی شان وشوکت اور خاندان کی رئیسانہ شان اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ مرزا صاحب کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل خاندان کی گذر بسر کشائش سے ہونے لگی تھی مگر مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے کل جائیداد کی حسرتِ بازیافت کے خواب شرمندہء تعبیر نہ ہوئے اور انگریزی عملداری کے بعد ان کی اوقات محض گذارہ دار کی رہ گئی۔ مرزا غلام مرتضیٰ جو انگریز گورنر جنرل کے دربار میں بزمرہء کرسی نشیناں بلائے جاتے تھے تقریباً پچاسی برس کی عمر پا کر اپنی آبائی جائیداد سے محرومی کا داغ سینے پر لئے جون ۱۸۷۶ راہیء عدم ہوئے اور اپنی وصیت کے مطابق اپنی تعمیر

کردہ مسجد میں جواب مسجدِ اقصیٰ کے نام سے موسوم ہے دفن ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد دستورِ مروجہ کے مطابق بانیء سلسلہ کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر خاندان کے رئیس بنائے گئے۔ بہ نظر ظاہر مرزا غلام احمد بھائی کے دست نگر ہوگئے مگران کی بعد کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپ نے صبر وتوکل اور قناعت وطمانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بعد کی زندگی میں جب ان کے ہاتھ پر خدا کا قائم کردہ سلسلہ سلسلہء عالیہ بن گیا تو آپ نے ایک عربی شعر میں یہ بات کہی کہ ''لِفاظاتُ المَوائدِ کان اُکلی. فَصِرتُ الیَومَ مِطعامُ الاہالی''۔ کہ ایک وقت تھا کہ میری گذر بسر دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر تھی اب یہ عالم ہے کہ خاندانوں کے خاندان میرے دسترخوان سے تمتع کرتے ہیں۔ مرزا غلام قادر صاحب کو سلسلہء عالیہ میں شامل ہونے کی توفیق نہ ملی۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے انہوں نے مرزا غلام احمد صاحب کے بڑے بیٹے مرزا سلطان احمد کو اپنا متبنّٰی کرلیا تھا اور وہی ان کی وفات پر ان کی جائیداد کے اور روایتی خاندانی سربراہی کے وارث بنے۔

مرزا غلام احمد محترمہ چراغ بی بی کے بطنِ مبارک سے ۱۳ فروری ۱۸۳۵ کو بروز جمعہ طلوعِ فجر کے وقت توام تولد ہوئے۔ ان کے ساتھ توام پیدا ہونے والی لڑکی تھی جو بچپن ہی میں فوت ہوگئی۔ مرزا صاحب پانچ بہن بھائی تھے جن میں مرزا صاحب اپنے ماں باپ کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ آپ طبعاً متین سنجیدہ اور گوشہ نشین تھے۔ بچپن ہی سے لہو ولعب سے انہیں پرہیز تھا۔ ان کی تعلیم رسمِ زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہوئی جہاں انہیں تعلیم دینے کے لئے ایک فارسی دان معلم کو ملازم رکھا گیا۔ اس استاد نے انہیں قرآنِ شریف اور فارسی کی بعض متداول کتابیں پڑھائیں۔ دس برس کے ہوئے تو ایک عربی داں استاد ان کی تربیت پر مقرر کئے گئے انہوں نے عربی زبان کے سیکھنے کے لئے انہیں صرف ونحو کے بعض اسباق دئے۔ سنِ بلوغ تک پہنچے تو ایک اور استاد ان کے لئے ملازم رکھے گئے جن کا کام انہیں منطق، حکمت اور علومِ مروجہ کی تعلیم دینا تھا۔ آپ نے اپنے والد سے جو خود ایک طبیبِ حاذق تھے حکمت کی تعلیم بھی حاصل کی۔ دستورِ زمانہ کے مطابق ان کا مکتب گھر پر ہی قائم کیا گیا تھا مگر قادیان کے دیگر بچے بھی اس مکتب سے فیض یاب ہونے کے لئے اس مکتب میں آتے تھے۔ آپ اپنی طبیعت کے مطابق دوسرے بچوں کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوتے تھے ہاں اعتدال کے ساتھ ورزشی کھیلوں اور تفریح میں ضرور شریک

ہوتے تھے۔ بچپن میں آپ نے تیرنا سیکھا اور گھڑ سواری کی مشق بھی بہم پہنچائی مگر آپ کی دلپسند ورزش پیدل چلنا تھا اور یہ عادت مدت العمر قائم رہی۔ آپ خاصی تیز قدمی سے چلتے تھے۔ ان کے استاد کو کسی مجبوری کے تحت قادیان سے بٹالہ آنا پڑا تو آپ بھی تکمیل تعلیم کی خاطر بٹالہ میں مقیم ہو گئے جہاں ان کے آبائی مکانات میں سے ایک بڑی حویلی کو ان کا مکتب بنا دیا گیا۔ اس مکتب میں ان کے ہم جماعت مولوی محمد حسین بٹالوی اور لالہ بھیم سین تھے۔ مولوی محمد حسین بٹالوی نے مرزا صاحب کے دعویٔ مسیحیت سے قبل تک ان کے ساتھ دوستانہ تعلق استوار رکھا۔ براہین احمدیہ کی تالیف کے بعد اس پر شاندار ریویو بھی مولوی محمد حسین بٹالوی ہی نے لکھا بعد کو مولوی محمد حسین بٹالوی نے مخالفت پر کمر باندھی اور اس میں بھی کمال کو پہنچے مگر مرزا صاحب کا بال بیکا نہ کر سکے۔

اوائلِ جوانی ہی میں آپ کی شادی خاندان کی ایک لڑکی حرمت بی بی سے کر دی گئی جو رشتہ میں ان کے ماموں کی بیٹی تھیں اس شادی سے مرزا صاحب کے دو بیٹے ہوئے مرزا سلطان احمد (۱۸۵۳) اور مرزا فضل احمد (۱۸۵۵)۔ ان کی شادی میں کوئی لایعنی رسم ہوئی نہ کوئی روایتی دھوم دھڑکا دیکھنے میں آیا حالانکہ ان کے بڑے بھائی کی شادی پر اربابِ نشاط کے ۲۲ طائفے جمع ہوئے تھے۔ ان کی شادی میں انتہائی سادگی اور اسلامی روایات ملحوظ رکھی گئیں اور کسی قسم کی کوئی خلاف شریعت بدعت نہ ہوئی۔ دونوں بھائیوں کی شادی کی تقریبات ہی دونو بھائیوں کی طبائع کے تفاوت کو واضح کرنے کو کافی ہیں۔

مرزا صاحب کی شادی بھی انہیں ان کے عباداتی مشاغل سے غافل نہ کر سکی ان کی خلوت پسندی قائم رہی۔ تنہا ہوتے تو عبادت اور استغفار میں مشغول رہتے۔ ان کے والد محترم انہیں ''مسیتڑ'' یعنی مسجد کا ہو رہنے والا کہا کرتے تھے۔ انہیں بجا طور سے ان کے مستقبل کی فکر تھی کہ آبائی جائیداد تو رہی نہیں یہ شخص جو کمانے دھانے کی فکر نہیں کرتا بچوں کو روٹی کیسے کما کر کھلائے گا؟ اسی سلسلہ میں ایک بار والد صاحب نے ملازمت پر اصرار فرمایا تو' آپ نے بڑے ادب سے جواب دیا کہ مجھے جس کا ملازم ہونا تھا ہو چکا ہوں!

وہ زمانہ اسلام اور حامیانِ اسلام کے لئے بڑا نازک زمانہ تھا۔ انگریزی عملداری کے مستحکم ہوتے ہی عیسائیوں کی بن آئی تھی اور وہ اسلام پر پے درپے اعتراضات کرتے چلے جاتے تھے اور بانیٔ اسلام کی ذات پر بے جا اور لغو اعتراضات کی بھرمار تھی۔ مرزا صاحب کے دل میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی وہ محبت

موجزن تھی کہ خود اپنے قول کے مطابق سترہ اٹھارہ برس کی عمر ہی سے وہ عیسائیوں کی کتابیں پڑھنے اور ان اعتراضوں کا جواب سوچنے لگے تھے جو اسلام اور بانیء اسلام کی ذات پر کیے جاتے تھے۔ اسلام کی حفاظت اور ناموسِ دینِ مصطفیٰ کے تحفظ کا انہیں اس درجہ احساس تھا کہ ان کی بعض راتیں سخت کرب اور بے چینی کی حالت میں گذرتی تھیں۔ مرزا صاحب نے ان اعتراضات کا جواب قرآنِ حکیم سے چاہا اور بنظرِ غائر کتابِ الٰہی کا مطالعہ شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا خود ان کا کہنا ہے کہ ''لوگ کہتے ہیں کہ نالائق نہیں ہوتا قبول۔ میں تو نالائق بھی ہو کر پا گیا درگہ میں بار''! قرآنِ حکیم کے مطالعہ اور اس کے مطالب پر غور کرنے میں آپ کو اس درجہ استغراق تھا کہ اس زمانہ کے دیکھنے والے گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے جب بھی انہیں دیکھا قرآن پڑھتے ہی دیکھا ان کے والد صاحب کو ان کی صحت اور ملازمت کی فکر کھائے جاتی تھی مگر انہیں عشقِ رسول اور عشقِ اسلام کی دھن لگی ہوئی تھی جو عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے غم کہیں سو ہری رہی۔ آپ دوسرے صوفیا کی طرح اوراد و وظائف نہیں کرتے تھے مگر درود شریف کثرت سے پڑھتے تھے۔ نماز روزہ اور دیگر ارکانِ دین کی بجا آوری میں باقاعدگی تھی۔ تہجد ان کا معمول ہی نہیں گویا ان کی زندگی تھی اور اس میں التزام اور باقاعدگی روا رکھتے تھے۔

ان کے والد مرزا غلام مرتضی اپنے زمانہ کے بعض رؤسا کی طرح اپنے زمانہ کی انگریزی عدالتوں میں مقدمات میں الجھے رہتے تھے اور اپنے بیٹے کو بھی اسی کام میں مصروف رکھنا یا دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مرزا صاحب کو اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں اکثر مقدمات کے سلسلہ میں باہر کی عدالتوں جانا پڑتا مگر آپ کا معمول تھا کہ باپ کی اطاعت تو ضرور کرتے مگر معاملات مقدمہ میں کوئی دروغ یا نادرست بات روا نہ رکھتے۔ کئی بار ایسا ہؤا کہ ان کے مخالفین نے اپنے موقف کی تصدیق کے لئے خود انہیں کی گواہی رکھوا دی اور مرزا صاحب نے راستی کی خاطر اپنے باپ کے موقف کے خلاف گواہی دے دی۔ ایک ایسے ہی مقدمہ میں جس میں ان کی گواہی کی وجہ سے فیصلہ ان کے والد کے خلاف ہو گیا تھا والد صاحب نے ناراض ہو کر انہیں گھر سے علیحدہ کر دیا اور آپ دو ماہ تک بٹالہ میں قیام فرما رہے۔ ان مقدمات کے سلسلہ میں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ بامر مجبوری واطاعتِ پدرِ بزرگوار چلے تو جاتے تھے مگر اپنا سارا وقت ذکرِ

الہی اور نوافل میں گزارتے تھے۔ بیکار بیٹھنا اور لغویات میں مبتلا ہونا ان کی طبیعت ہی کے خلاف تھا۔ ایک مقدمہ میں عدالت سے آواز ایسے وقت میں پڑی جب آپ نماز میں مصروف تھے۔ فریقِ مخالف نے ان کے پیش نہ ہونے سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر حاکم نے ان کے حق میں ڈگری جاری کردی۔ راست گفتاری، عبادت میں مصروفیت انہیں پسند اور غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کرنے کی عادت انہیں ناپسند تھی اور جب تک اپنے والدِ گرامی کے ارشاد کی تعمیل میں مقدمات دنیوی میں مبتلا رہے اپنے اس عمل پر ثابت قدم رہے۔

اتنی محنت اور خلوت گزینی کو ان کی صحت پر اثر انداز ہونا ہی تھا چنانچہ تیس برس کی عمر میں ہی سر کے بال سفید ہونے لگے۔ دوران سر اور ذیابیطس کے مرض لاحق ہو گئے مگر ان کے مشاغل دینی میں کوئی فرق نہ آیا۔ خوراک کے معاملہ میں بھی آپ بے پروا تھے جو ملا جیسا ملا کھا لیا۔ بھنے ہوئے چنوں پر اکتفا کرنا تو معمولات میں شامل تھا۔

۱۸۶۴ یا ۱۸۶۵ میں آپ کو عنفوان شباب کے عالم میں سرتاجِ مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک کی زیارت کا شرف خواب میں حاصل ہوا۔ مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ آپ کی محبت نے مجھے فریفتہ کرلیا اور حضور کے حسین وجمیل چہرہ نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا! اس مبارک رویا کے بعد عشقِ رسول ہی ان کی زندگی کا محور بن گیا۔

۱۸۶۴ میں ان کے والدِ گرامی نے بزعم خود اپنے بیٹے کی ہمدردی میں انہیں سیالکوٹ میں متفرقات کی اسامی پر ملازم کروادیا۔ آپ نے باپ کی خوشنودی کی خاطر زرہِ امتثالِ امر یہ ملازمت کرتو لی مگر اس کو ایک قید خانہ ہی سمجھتے رہے۔ کچہری کا کام کچہری پر کرتے اور باقی وقت ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن پاک میں بسر کرتے۔ شب بیداری ان کا معمول اور تبلیغِ اسلام ان کا دستور تھا قرآنِ حکیم کے مطالب پر غور و فکر کرنا ان کی غذا تھی۔ اس ملازمت کے صلہ میں آپ کو جو معاوضہ ملتا اس میں سے قلیل سا حصہ اپنی ضروریات کے لئے رکھ کے باقی حصہ غربا اور مساکین میں تقسیم کردیتے۔ ان کی نیکی اور پارسائی اور پاکیزہ زندگی کی گواہی وہ لوگ بھی دیتے ہیں جو مسلمان نہیں تھے اور وہ لوگ بھی جو ان سے عقیدہ کا اختلاف رکھتے تھے۔ مولوی ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین کا بیان ہے کہ مرزا صاحب ضلع

سیالکوٹ میں محرر تھے اور ہم چشم دید شہادت سے کہہ سکتے ہیں کہ جوانی میں نہایت صالح اور متقی بزرگ تھے ۔کاروبار ملازمت کے بعد ان کا تمام وقت مطالعہ دینیات میں صرف ہوتا تھا اور عوام سے کم ملتے تھے! مولانا سید میر حسن کا کہنا ہے کہ افسوس ہم نے ان کی قدر نہ کی۔ ان کے کمالاتِ روحانی کو بیان نہیں کر سکتا ۔ان کی زندگی معمولی انسان کی زندگی نہ تھی بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خدا تعالی کے خاص بندے ہوتے ہیں اور دنیا میں کبھی کبھی آتے ہیں!

برطانوی عملداری میں پنجاب کا ضلع سیالکوٹ خاص طور سے عیسائیوں کی زد پر تھا اور اب بھی اس ضلع میں اپنے تناسب کے لحاظ سے عیسائیوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ مرزا صاحب اسلام کی حقانیت کی خاطر عیسائیوں سے ہر دم مناظرہ اور بحث مباحثہ کے لئے تیار رہتے تھے عیسائی منادوں سے ان کے مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ سکاچ مشن کے فاضل پادری بٹلر سے مرزا صاحب کے خوب خوب مباحثے رہے۔ پادری بٹلر پڑھے لکھے آدمی تھے اس لئے مرزا صاحب کے علم وفضل کے معترف تھے حتی کہ جب ان کی وطن مراجعت کا وقت آیا تو خاص طور سے مرزا صاحب سے الوداعی ملاقات کے لئے آئے اور وہیں اس دفتر میں پہنچ گئے جس دفتر میں مرزا صاحب کام کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی باتوں میں موہنی تھی۔ مخالف بھی ان سے گفتگو کر کے اطمینان محسوس کرتے تھے۔

مرزا صاحب ۱۸۶۸ میں والد صاحب کے حکم پر ملازمت سے مستعفی ہو کر سیالکوٹ سے واپس تشریف لے گئے اور اس آزمائش سے نجات پائی کیونکہ ان کے اپنے قول کے مطابق آپ نے وہ تمام ایام سخت کراہت اور درد کے ساتھ بسر کیے! آپ اس روز قادیان واپس پہنچے جس روز ان کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوا۔ آپ کو اپنی والدہ محترمہ سے از حد پیار تھا ان کی وفات کے بعد جب بھی ان کا ذکر کرتے آنکھیں نم ہو جاتیں۔ والدہ کو بھی اپنے اس بیٹے سے جسے دوسرے استخفاف سے ''ملاں'' کہتے تھے بہت پیار تھا اور وہ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ ویسے بھی خاندان کے سربراہ کی زوجہ ہونے کے ناطہ سے بڑی دوراندیش اور معاملہ فہم تھیں عالی ہمتی، ہمدردی، غمگساری اور غریب پروری میں اپنی مثال آپ تھیں۔ قناعت، عفت اور مروت آپ کے خاص اوصاف تھے۔ آپ آئمہ ضلع ہوشیار پور کے ایک معزز مغل خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ والدہ کی وفات کے بعد مرزا صاحب کی عام ضروریات کا خیال رکھنے والا

بظاہر کوئی نہ رہا۔

قادیان واپس آ جانے کے کچھ عرصہ بعد انہیں ریاست کپورتھلہ سے تعلیم کے محکمہ کی افسری کی پیشکش ہوئی مگر آپ نے والد صاحب قبلہ سے عرض کیا کہ میں کوئی نوکری کرنا نہیں چاہتا۔ دو جوڑے گاڑھے کے اور جیسی روٹی میسر ہو بھیج دیا کریں! چنانچہ ان کے والد گرامی طوعاً کرہاً اس بات پر راضی ہو گئے اور اپنے ایک ساتھی سے رقت بھری آواز میں کہا میاں غلام نبی میں خوش تو اسی پر ہوں۔ سچی راہ تو یہی ہے جس پر یہ چل رہا ہے! اسی سال آپ نے اپنے والد محترم کی خدمت میں ایک عریضہ بھی لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مجھے آلائشِ دنیاوی سے بکلی کنارہ کش ہو کر یادِ الٰہی میں زندگی بسر کرنے کی اجازے دی جائے۔

۱۸۶۸ یا ۱۸۶۹ء ہی کا واقعہ ہے کہ مولوی محمد حسین بٹالوی تحصیل علم کے بعد دلی سے واپس آئے تو اہلحدیث کے خلاف جو شورش برپا تھی وہ بٹالہ بھی پہنچ گئی۔ اتفاق سے مرزا صاحب بٹالہ میں تھے ایک صاحب انہیں کشاں کشاں مناظرہ کے لئے مولوی محمد حسین کے ہاں لے گئے۔ مرزا صاحب نے ان سے پوچھا آپ کا دعویٰ کیا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا قرآن سب سے مقدم ہے۔ اس کے بعد اقوالِ رسول کا درجہ ہے۔ کتاب اللہ اور احادیثِ رسول کے مقابل کسی انسان کی بات قابلِ حجت نہیں! مرزا صاحب نے کہا آپ کا یہ اعتقاد معقول اور ناقابلِ اعتراض ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ لوگوں نے شور مچا دیا ہار گئے ہار گئے۔ جو شخص آپ کو ساتھ لے کر گیا تھا وہ سخت طیش میں آیا کہ آپ نے ہمیں ذلیل و رسوا کر دیا مگر مرزا صاحب یہی کہتے رہے کہ کیا میں یہ کہوں کہ امت کے کسی فرد کا قول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر مقدم ہے؟ زجر و توبیخ کے باوجود صدق مقالی پر ثابت قدم رہنے کے اس واقعہ کے بعد آپ کو الہام ہوا تیرا خدا تیرے اس فعل سے راضی ہوا۔ اور وہ تجھے بہت برکت دے گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے! یہ الہام مرزا صاحب کے ابتدائی الہامات میں سے ایک ہے۔

ملازمت کے جھنجٹ سے فارغ ہوئے تو آپ کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ آپ کو قلم کے ذریعہ جہاد کا آغاز کرنا چاہئے چنانچہ آپ نے مختلف اخبارات میں مختلف دینی موضوعات پر مضامین لکھنا شروع کئے اللہ تعالیٰ نے جو قدرتِ بیان انہیں عطا فرمائی تھی وہ اسلام کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی اور لوگ ان کے مضامین کو ذوق و شوق سے پڑھنے لگے۔ ان کے موضوعات خالصتہً دینی موضوعات ہوتے تھے۔ پہلا

مضمون بنگلور کے رسالہ ''منشور محمدی'' مؤرخہ ۲۵ اگست ۱۸۷۲ میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں آپ نے اپنے بیس سالہ تجربہ کی بنا پر یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ تمام انسانی معاملات اور تعلقات کی اساس صدق وصفا اور سچائی ہے اس لئے ایک سچے مذہب کی نشانی بھی یہی ٹھہرتی ہے کہ اس نے اپنے متبعین کو کہاں تک اور کس طور سے سچائی پر کاربند ہونے کی تعلیم دی ہے۔ آپ نے اس کے ثبوت میں یہ کہا کہ میں اسلام کی تعلیمات سے سچائی کے بارہ میں پیشکردہ تعلیمات نکال کر دکھاتا ہوں کسی دیگر مذہب کا کوئی بھی پیروکار، عیسائی ہو یا ہندو، آریہ سماج سے متعلق ہو یا برہمو سماج سے، اپنے مذہب کی تعلیمات میں سے سچائی کے موضوع پر اتنی ہی بلکہ اس کے نصف کے قریب ہی تعلیمات نکال کر پیش کرے تو آپ اسے پانچ صد روپیہ انعام دیں گے۔ اور یہ پانچ صد روپیہ آج سے ایک سوتیس برس قبل کا پانچ سو روپیہ تھا۔ ہر چند کہ یہ بڑا ہی آسان چیلنج تھا مگر کسی کو جرات نہ ہوئی کہ اسلام کے مقابلہ پر اپنے دین کی تعلیمات میں سے ایسی تعلیمات کو یکجا کر کے پیش کر سکتا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پرچوں نے بھی مرزا صاحب سے مضامین طلب کرنا شروع کر دیے۔ چنانچہ ملک کے دوسرے حصوں کے اخبارات میں آپ کے مضامین کا چرچا ہونے لگا اور مرزا صاحب اسلام اور بانیء اسلام کے دفاع کے علمبردار سمجھے جانے لگے۔ کسی مذہب اور حلقہ کی طرف سے کہیں اسلام پر کوئی اعتراض ہوتا تو جواب کے لئے سب کی نگاہیں ان کی جانب اٹھتیں۔

اس دور میں مرزا صاحب کی زندگی انتہائی اہم موڑ پر تھی۔ خلوت میں رہنا اور عبادات میں مشغول رہنا ہی انہیں مرغوب تھا۔ مسجد میں جا کر نمازیں پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے والد کے ایک غریب قرابت دار جاننے والے کا بیان ہے کہ میں سمجھتا تھا مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کا ایک ہی بیٹا ہے مگر جب ان کے گھر میں ایک مرد کو یوں مسجد کی طرف سعی کرتے دیکھا تو معلوم ہوا ان کا ایک بیٹا اور بھی ہے اور اسے دنیا میں مسجد سے زیادہ کوئی جگہ مرغوب نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کی خدمت پر کمر باندھ لی اور پھر انہی کے حجرے کے ہو کر رہ گئے۔ اس حجرہ میں ایک چارپائی تھی اور ایک تخت پوش۔ مرزا صاحب تخت پوش پر سوتے تھے چارپائی ان کے استعمال کے لئے مختص کر دی۔ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ ان کا کہنا ہے مرزا صاحب کو سوائے عبادت کے کسی چیز کا شغف نہیں تھا کھانے پینے اور نعمائے دنیوی سے بالکل بے

نیاز تھے۔ ان دونوں کا کھانا گھر کے مطبخ سے آتا تھا۔ نابینا حافظ معین الدین عرف مانا بھی آپ کے خدمت گذار تھے ان کا کھانا بھی مرزا صاحب کے گھر کے عام باورچی خانہ سے آتا تھا جب مرزا صاحب کا کھانا آتا تو آپ انتظار کرتے کہ حافظ صاحب کا کھانا بھی آجائے۔ آجاتا تو دونو سالن ملا لیتے پھر حافظ صاحب سے کہتے اب کھانا کھائیں۔ حافظ صاحب کے سیر ہونے کا انہیں اتنا خیال رہتا کہ اپنے حصہ کا کھانا بھی انہیں دے دیتے۔ کئی بار ایسا ہؤا کہ اپنے ساتھی کا کھانا بھی حافظ صاحب کو دے دیا اور خود اپنے لئے اور اپنے ساتھی کے لئے بھاڑ سے بھنے ہوئے چنے منگوا لئے۔ کھانا آہستہ آہستہ اور چبا چبا کر کھاتے اور باتیں بشاشت سے کرتے تھے۔

دن رات کے اس ساتھی یعنی مرزا محمد دین صاحب کا بیان ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد آپ سو جاتے اور نصف شب کے قریب اٹھ کر نفل پڑھنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور فجر کی نماز تک تلاوت کرتے رہتے۔ روشنی کے لئے آپ مٹی کا دیا جلاتے تھے۔ اپنے ساتھی کو نماز کے لئے بیدار کرتے تو پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کر بیدار کرتے کہ یہ سنت نبوی ہے نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر کے لئے سونا آپ کا معمول تھا۔

اسی دوران ۱۸۷۴ میں آپ نے کشفی نظارہ میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ایک لڑکے کی صورت میں ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہے اس نے ایک نہایت چمکیلا اور پاکیزہ نان انہیں عطا کیا اور کہا یہ تیرے لئے اور تیرے ساتھ کے درویشوں کے لئے ہے! اس کشف میں درویشوں کی ایک جماعت عطا ہونے کے علاوہ رزق کی کشائش کی خوش خبری بھی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ان کا لنگر خانہ آج دنیا کے ہر اس ملک میں جاری ہے جہاں جہاں آپ کی جماعت موجود ہے اور لاکھوں لوگ اس لنگر سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

آپ کے والد ماجد نے ۱۸۷۵ میں قادیان میں ایک جامع مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ انہی کے خاندان کے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ قادیان میں تین آدمی دین کا ذوق رکھتے تھے۔ مرزا غلام احمدؑ مرزا کمال الدین اور میر عابد علی۔ باقی مسلمان آبادی کو دین سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ صرف مرزا غلام احمد باقاعدگی سے پنجوقتہ نماز کے لئے مسجد میں جاتے تھے اور بعض اوقات ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا مگر مرزا غلام مرتضیٰ صاحب نے سات سو روپے کے صرفہ سے ایک

قطعہ زمین خریدا اور اس پر جامع مسجد کی بنیاد رکھ دی اور وصیت کی کہ مرنے کے بعد انہیں اسی مسجد کے صحن میں دفن کیا جائے تا کہ بعد از مرگ بھی اذان اور نماز کی آواز کانوں میں پڑتی رہے۔ خدائی تصرف یہ ہؤا کہ ادھر مسجد کی عمارت بہمہ وجوہ مکمل ہوئی صرف فرش کی چند اینٹیں باقی تھیں کہ مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کا وقت موعود آ گیا اور وہ اسی مسجد کے صحن میں دفن ہوئے۔ راقم الحروف نے ان کا مزار مبارک دیکھا ہؤا ہے منارۃ المسیح کے عین ساتھ مسجد کے صحن میں ان کا مزار ہے جس کا تعویذ سنگ سفید سے بنایا گیا ہے۔

مرزا غلام مرتضیٰ وجیہہ وشکیل اور دراز قد بزرگ تھے جن کا رنگ گندمی تھا آنکھیں موٹی اور سرخ تھیں۔ داڑھی لمبی تھی۔ چہرے سے شاہی رعب وجلال ٹپکتا تھا۔ از بسکہ دو بار دو مختلف حاکموں کی ماتحتی میں رہنا پڑا مگر زبان کو خوشامد اور تملّق سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ عزت نفس اور خودداری کا از حد پاس رکھتے تھے۔ ایک بار ایک سکھ راجہ نے جو ان کے علاج سے صحت یاب ہو گیا تھا ان کی آبائی ریاست کے دو گاؤں ان کے معالجہ کے معاوضہ میں واپس لوٹانا چاہے تو آپ نے پائے حقارت سے ٹھکرا دئے کہ میں علاج کے معاوضہ میں اپنے آباؤ اجداد کی ریاست کے گم شدہ گاؤں لینا اپنے اور اپنی اولاد کے لئے باعثِ عار سمجھتا ہوں۔ انگریزوں کی عملداری کے آغاز میں جب حاکم اپنی حاکمیت کا رعب قائم کرنے پر کمر بستہ تھے آپ انگریز حاکموں سے دب کر بات نہیں کرتے تھے۔ آپ کی اولوالعزمی اور جواں مردی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے باپ کا انتقال غریب الوطنی میں ہؤا مگر باپ کی نعش کو نا مساعد حالات کے باوجود وطن میں واپس لائے اور آبائی قبرستان میں دفن کیا حالانکہ اس وقت ان کی عمر ابھی پندرہ یا سولہ برس کی تھی۔ آپ نے طب کی تعلیم دلی کے مشہور شریفی خاندان کے حکیم محمد شریف سے حاصل کی مگر طبابت کو پیشہ نہیں بنایا محض خدمت خلق کا وسیلہ رہنے دیا۔ استغنا اور خودداری ان کی طبیعت میں تھی۔ نیک نیت، صاف باطن اور خلق مجسم تھے۔ غریب پروری ان کے خاندان کا خاصہ تھی۔ اگرچہ عمر بھر دنیا کوشی میں مبتلا رہے مگر آخر عمر میں اپنی تہی دامنی کا بے حد احساس ہونے لگا تھا۔ خود انہیں کا ایک شعر ہے: کردیم ناکردنی ہمہ عمر۔ اے وائے بما کہ ما چہ کردم۔ کہ میں عمر بھر ناکردنی امور میں مصروف رہا، مجھ پر افسوس کہ میں نے کیا کیا؟ شاید اسی احساس نے ان سے یہ عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی حالانکہ حالاتِ زمانہ کے

مقدمہ بھی تھا مگر مرزا صاحب نے کبھی صدق مقالی کو چھوڑ کر دروغ بیانی کو اختیار نہیں کیا۔
۱۸۷۷ میں ہی ایک بار آپ حکیم میر حسام الدین کی معیت میں کچھ روز کے لئے سیالکوٹ تشریف لے گئے اور اپنے پرانے ہندو دوست لالہ بھیم سین کے ہاں قیام فرمایا۔ اسی سال مشہور صحافی مولوی سراج الدین صاحب بانی اخبار زمیندار قادیان گئے اور مرزا صاحب کے مہمان ہوئے جس کا ذکر آپ نے ۱۹۰۸ میں مرزا صاحب کی وفات کے بعد اپنے اخبار میں کیا" ۱۸۷۷ میں ہمیں ایک شب قادیان میں آپ کے یہاں مہمانی کی عزت حاصل ہوئی۔ ان دنوں آپ عبادت اور وظائف میں اس قدر محو و مستغرق تھے کہ مہمانوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتے تھے"۔ مولوی سراج الدین صاحب برصغیر پاک و ہند کے نامور صحافی اور شاعر اور جماعت کے سخت معاند' مولانا ظفر علی خاں کے اور نامور ماہر تعلیم پروفیسر حمید احمد خاں کے والد بزرگوار تھے۔

اسی زمانہ میں مرزا صاحب نے ایک کتاب "نعمت الباری" لکھنے کی طرح ڈالی جس میں اللہ تعالی کی نعمتوں کا تذکرہ کرنا مقصود تھا فارسی اشعار میں اس کا "خطبہ" یعنی دیباچہ بھی لکھ لیا مگر ان کا کہنا ہے کہ میں نے قلم لے کر لکھنا شروع کیا تو یکا یک بارانِ رحمت کا نزول ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ بارش کا ہر قطرہ اللہ تعالی کے بے انتہا فضل لے کر زمین پر اترتا ہے اس خیال کے آتے ہی میں نے قلم رکھ دیا کہ میں بھلا رب رحیم کے احسانات کو کیسے شمار کرسکتا ہوں؟ وَاِن تَعُدُّوا نِعمَتَ اللّٰہِ لَاتُحصُوھا۔ اس طرح یہ کتاب معرضِ تصنیف میں نہ آئی۔

اسلام کو عیسائیوں کے گوناگوں حملوں کا سامنا تو تھا ہی برصغیر کے مقامی ہندو باشندوں کی جانب سے انگریزی راج کے مستحکم اور مسلمانوں کے لمبے عہدِ حکومت کے ختم ہوتے ہی اپنی قدیم شان وشوکت حاصل کرنے اور رام راج قائم کرنے کے منصوبے شروع ہوگئے۔ اس کا ایک ہی طریق تھا کہ اسلام اور بانیء اسلام پر لغو اور بے جا اعتراضات کر کے عامتہ الناس کو اسلام کی تعلیمات سے بیزار کیا جائے۔ چنانچہ سوامی دیانند نے جنوری ۱۸۷۷ میں بمبئی کے مقام پر آریہ سماج نامی تحریک کی بنیاد رکھی جس کا اصل مقصد ہندوؤں کی عظمت رفتہ کو واپس حاصل کرنا تھا۔ اس تحریک کو پنجاب میں بڑی سرعت کے ساتھ کامیابی نصیب ہونے لگی اور لوگ جوق در جوق اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ اس تحریک کا طریق یہ تھا

کہ یہ لوگ ویدوں کی از کار رفتہ تعلیمات میں مغربی علوم کا اور جہاں ممکن ہوتا اسلام کی عمومی تعلیمات کا پیوند لگا کر لوگوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے کہ وید محض پرانے زمانہ کی بیکار کتابیں نہیں بلکہ موجود زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دینے والی کتابیں ہیں صرف ان کی جدید تفسیر کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس تحریک کا دائرہ پنجاب میں وسیع ہونا شروع ہوا۔ مرزا صاحب نے بھانپ لیا کہ یہ دراصل خدا کی توحید کے خلاف قائم کیا جانے والا محاذ ہے اور اس فتنہ کا فوری سد باب کیا جانا ضروری ہے چنانچہ آپ نے اپنے قلم کی ساری قوت آریہ سماج کے فتنہ کے استیصال کے لئے وقف کردی اور وہ فتنہ جو اتنی سرعت سے پھیلنا شروع ہوا تھا فوراً اتنا غیر معتبر ہوگیا کہ اس کے عہدیدار اپنے عقیدہ سے بیزار اور تائب ہونے لگے مگر اس تحریک کے پس پردہ آریہ سماج قائم کرنے کی جو سیاسی ریشہ دوانیاں تھیں وہ اپنی جگہ قائم رہیں۔ عیسائی اپنے جگہ دبک کر بیٹھے ہوئے تھے آریہ سماجی اپنی جگہ لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگے مرزا صاحب ہرگاہ انہیں بلاتے رہے مگر کوئی سامنے نہ آیا۔ آزمائش کے لئے کوئی نہ آیا ہر چند۔ ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے۔

مرزا صاحب نے آریہ سماج اور برہمو سماج کے اثر کو بے اثر بنا کر دراصل مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ورنہ صدہا مسلمان آریہ سماج میں شامل ہو چکے تھے اور یہ سلسلہ روز افزوں تھا مگر ان کے بر وقت سد باب نے ان تحریکات کا ڈنک نکال دیا۔

مشہور صحافی سید حبیب سابق مدیر سیاست نے اعتراف کیا کہ "مرزا صاحب کی کامیابی کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ جہالت مسلمانوں پر قابض تھی اور اسلام مسیحی اور آریہ مبلغین کے طعن و تشنیع کا مورد بنا ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے اس حالت سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کی طرف سے سینہ سپر ہو کر اغیار کا مقابلہ کیا" اور مقابلہ بھی ایسا کیا کہ خود ان کے قول کے مطابق، دشمنوں کے دانت کھٹے کردئے!

۱۸۸۰ میں مرزا صاحب کی پہلی تصنیف "براہینِ احمدیہ" چھپ کر سامنے آئی۔ اس کتاب میں مرزا صاحب نے تین سو دلائلِ عقلیہ و نقلیہ سے اسلام اور قرآنِ مجید اور نبوت محمدیہ کی صداقت ثابت کی ہے اور دیگر مذاہب کو رد کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت نے انہیں سارے ہندوستان میں شہرت دے دی۔

کتاب کا اسلوب عالمانہ ہے۔ زبان کا لہجہ دقیق علمی لہجہ ہے۔ اپنے مطالب و محاسن کی وجہ سے یہ کتاب بہت جلد اسلامی لٹریچر کا عمدہ نمونہ سمجھی گئی اور اس کے مصنف کو اسلامی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ اس زمانہ کے بعض علما نے اس پر شاندار ریویو کئے مگر دستورِ زمانہ کے مطابق بعض مخالفین نے اس کتاب کی اشاعت پر مصنف کے خلاف فتویٰ ہائے کفر شائع کیے اور ان کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام کے بارہ میں مبالغہ و غلو سے کام لیا ہے۔ اور خود ملہم ہونے کا دعویٰ کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے دو حصے ۱۸۸۰ میں تیسرا حصہ ۱۸۸۲ میں اور چوتھا حصہ ۱۸۸۴ میں شائع ہوا۔ پانچواں حصہ ان کی وفات کے بعد چھپ کر سامنے آیا۔

مرزا صاحب کو ماموریت کا پہلا الہام ۱۸۸۲ میں ہوا (مگر آپ نے مامور اور مجدد ہونے کا دعویٰ 1885 میں کیا)۔ اس الہام میں جو عربی کے ستر فقرات پر مشتمل ہے اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جو مرتبہ بھی عطا کرے گا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی برکت سے ہوگا۔ ۱۸۸۲ ہی میں آپ کو بتایا گیا کہ لوگ دور دور سے آپ کے پاس آئیں گے حالانکہ اس وقت قادیان ایک کوردِہ تھا جس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ پھر وہ رجوع خلائق ہوا کہ راستوں میں گڑھے پڑ گئے۔

۱۷ نومبر ۱۸۸۴ کو آپ کا نکاحِ ثانی حضرت خواجہ میر دردؒ کے خانوادہ میں دہلی میں ہوا۔ مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی نے اس نکاح کا اعلان کیا۔ اس بیوی کے بطن سے دس اولادیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں جن میں سے پانچ نے لمبی عمر پائی۔ سب سے بڑے بیٹے حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمدؓ خلیفۃ المسیح الاول حضرت حکیم مولوی نورالدین کی وفات پر ۱۹۱۴ میں ان کے خلیفہ ہوئے۔ ۱۹۶۵ میں ان کی وفات پر ان کے بڑے بیٹے حضرت مرزا ناصر احمدؒ نے تیسری خلافت کی ردا اوڑھی۔ چوتھے خلیفہ بھی خلیفہ ثانیؓ کے بیٹے حضرت مرزا طاہر احمدؒ تھے اور اب ۲۰۰۳ میں ان کے وصال کے بعد بانی سلسلہ عالیہ کے سب سے چھوٹے بیٹے حضرت مرزا شریف احمد کے پوتے، حضرت مرزا مسرور احمدؑ ایدہ اللہ تعالیٰ خلافتِ خامسہ کے منصب پر فائض اور فائز و کامران ہیں۔ اس طرح آپ کی نسل میں رشد کا سلسلہ جاری ہے۔

آپ نے پہلی بیعت ۲۳ مارچ ۱۸۸۹ کو لدھیانہ میں قبول کی اور اس طرح جماعت احمدیہ کی بنیاد رکھی۔ ۴۰ افراد نے باری باری بیعت کی پہلے بیعت کنندہ حضرت مولوی نورالدین صاحب تھے۔ ۱۸۹۰۔91

میں آپ نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔
بانیء سلسلہ احمدیہ نے ۱۸۹۱ میں پہلے سالانہ جلسہ کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۸۹۱ کو پہلے جلسہ میں ۷۵ افراد شریک ہوئے۔ ۱۹۴۶ میں قادیان کے آخری سالانہ جلسے پر کم وبیش تینتیس ہزار افراد حاضر تھے۔ اور ربوہ میں ہونے والے سالانہ جلسہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ حکومتِ پاکستان نے ۱۹۸۴ سے بعد اب تک سالانہ جلسہ کے انعقاد کی اجازت نہیں دی اس لئے دنیا کے مختلف ممالک میں یہ جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ یہ جلسہ جماعت احمدیہ کا اہم سالانہ اجتماع سمجھا جاتا ہے
۱۸۹۲ میں آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ اس شہر میں آپ نے ملازمت کے کچھ سال بسر کئے تھے اس لئے ہجومِ خلائق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ لوگ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ شخص جس نے اپنی نوجوانی کا کچھ عرصہ ہمارے درمیان پاکیزگی اور نیکی سے گذارا ہے اب کیسا ہے۔ اس سفر کے دوران ان کے بہت سے پرانے جاننے والوں نے آپ کی بیعت میں شمولیت کی جن میں علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد بھی شامل تھے۔ اقبال اور ان کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد صاحب اس وقت سے ہی اپنے کو بیعت میں شامل سمجھتے تھے اور ۱۹۱۳ تک ان کا جماعت کے ساتھ تعلق رہا گو بعد کو بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اقبال بیعت سے الگ ہو گئے۔
انجیل کی پرانی پیشگوئیوں میں مذکور تھا کہ مہدیء موعود کے ظہور کے وقت چاند اور سورج کو ایک معینہ وقت میں گرہن لگے گا اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مامور کے لئے یہ آسمانی نشان ظاہر ہوا ہو۔ چنانچہ ۲۰ مارچ ۱۸۹۴ کو چاند گرہن اور ۶۔ اپریل ۱۸۹۴ کو سورج گرہن ہوا اور دنیا نے اس کسوف وخسوف کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔
۱۸۹۵ میں مرزا صاحب نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر اعلان کیا مسیحِ ناصری فوت ہو چکے ہیں اور ان کا مدفن محلہ خانیار سرینگر میں موجود ہے۔ ۱۸۹۶ میں لاہور میں جلسہ اعظم مذاہب ۲۶۔ ۲۷ اور ۲۸ دسمبر کو منعقد ہوا اس میں مرزا صاحب کا معرکتہ الآراء مضمون ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' پڑھا گیا۔ یہ کتاب اب تک لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا موجب ہو چکی ہے اور دنیا کی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے ۶ مارچ ۱۸۹۷ کو پنڈت لیکھرام جو آریہ سماج کا بڑا دریدہ دہن لیڈر تھا مرزا صاحب کی انذاری پیشگوئی کے

مطابق ایک نامعلوم فرد کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اسی سال عیسائیوں میں سے پادری ہنری مارٹن کلارک نے مرزا صاحب پر قتل کی سازش کرنے کا مقدمہ امرتسر میں دائر کیا لیکن اللہ تعالی نے مرزا صاحب کی بریت کے سامان پیدا کیئے اور دشمن خائب و خاسر ہوا۔ ولیم مانٹیگو ڈگلس نے جو گورداسپور کے ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے ۲۳ اگست ۱۸۹۷ کو انہیں اس الزام سے بری کر دیا۔ کیپٹن ڈگلس جو کرنل ڈگلس کے عہدے تک پہنچے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک زندہ تھے اور اپنے ملنے والوں کو مرزا صاحب کے مقدمہ کے بارہ میں بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے انہوں نے مرزا صاحب کی جماعت کو سینکڑوں سے لاکھوں ہوتے دیکھا تھا اور اس کی گواہی دیا کرتے تھے۔

۱۹۰۱ میں سرکاری مردم شماری ہونے والی تھی اس لئے مرزا صاحب نے اپنی جماعت کے لئے فرقہ احمدیہ کا نام تجویز کیا اور احمدیوں نے اس کے مطابق اپنے نام رجسٹر کروائے۔

۱۴ جولائی ۱۹۰۳ کو ان کے مرید صاحبزادہ سید عبداللطیف کو سنگسار کر کے شہید کر دیا گیا۔ اس پر مرزا صاحب نے کابل کی سرزمین کو انتباہ کیا کہ اے کابل کی سرزمین تو خدا کی نظروں سے گر گئی۔ اور دنیا آج تک اس سرزمین کی ذلت تباہی اور رسوائی کا مشاہدہ کرتی چلی آ رہی ہے۔

۲۶ مئی ۱۹۰۸ کو مرزا صاحب نے لاہور میں انتقال کیا اور اگلے روز ان کی نعش کو قادیان میں دفن کیا گیا نمازِ جنازہ ان کے پہلے خلیفہ مولوی نورالدین بھیروی نے پڑھائی۔

ان کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد صاحب کے قول کے مطابق مرزا صاحب" کا چہرہ کتابی تھا اور رنگ سفیدی مائل گندمی تھا اور خط و خال نہایت متناسب تھے۔ سر کے بال بہت ملائم اور سیدھے تھے مگر بالوں کے آخری حصے میں کسی قدر خوبصورت خم پڑتا تھا۔ داڑھی گھنی تھی مگر رخسار بالوں سے پاک تھے۔ قد درمیانہ تھا اور جسم خوب سڈول اور متناسب تھا اور ہاتھ پاؤں بھرے بھرے اور ہڈی فراخ اور مضبوط تھی۔ چلنے میں قدم تیزی سے اٹھتا تھا مگر یہ تیزی ناگوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ زبان بہت صاف تھی مگر کسی کسی لفظ میں کبھی کبھی خفیف سی لکنت پائی جاتی تھی۔ جو صرف ایک چوکس آدمی ہی محسوس کر سکتا تھا۔ پچھتر سال کی عمر پائی مگر کمر میں خم نہیں آیا۔

ادیب شہیر میر محمد اسمٰعیل دہلوی نے ان کے بارہ میں لکھا" میں نے آپ کو اس وقت دیکھا جب میں دد

سال کا بچہ تھا پھر آپ میری آنکھوں سے اس وقت غائب ہوئے جب میں ۲۷ سال کا جوان تھا مگر میں خدا کی قسم کھا کر بیان کرتا ہوں کہ میں نے آپ سے بہتر، آپ سے زیادہ خلیق، آپ سے زیادہ نیک، آپ سے زیادہ بزرگ، آپ سے زیادہ اللہ اور رسول کی محبت میں غرق، کوئی شخص نہیں دیکھا۔'' ''آپ اخلاق میں کامل تھے یعنی آپ نہایت رؤف رحیم شخص تھے۔ سخی تھے، مہمان نواز تھے، اشجع الناس تھے۔ ابتلاؤں کے وقت جب لوگوں کے دل بیٹھے جاتے تھے آپ شیر نر کی طرح آگے بڑھتے تھے۔ عفو، چشم پوشی، فیاضی، دیانت، خاکساری، صبر، شکر، استغناء، حیا، غضِ بصر، عفت، محنت، قناعت، وفاداری، بے تکلفی، سادگی، شفقت، ادبِ الٰہی، ادبِ رسولؐ و بزرگانِ دین، علم، میانہ روی، ادائیگی حقوق، ایفائے عہد، چستی، ہمدردی، اشاعتِ دین، تربیت، غیرت، حسنِ معاشرت، مال کی نگہداشت، وقار، طہارت، زندہ دلی اور مزاح، غیرت، احسان، حفظِ مراتب، حسن ظنی، ہمت، اولوالعزمی، خودداری، خوش روئی اور کشادہ پیشانی، کظمِ غیظ، کفِ ید و کفِ لسان، ایثار، معمور الاوقات ہونا، انتظام، اشاعت علم و معرفتِ خدا، اور اس کے رسول کا عشق، کامل اتباع رسولؐ''۔ مختصراً یہ آپ کے اخلاق و عادات تھے۔ آپ میں ایک مقناطیسی جذب تھا ایک عجیب کشش تھی، رعب تھا، برکت تھی، موانست تھی، بات میں اثر تھا، دعا میں قبولیت تھی، خدام پروانہ وار حلقہ باندھ کر آپ کے پاس بیٹھتے تھے اور دلوں سے زنگ خود بخود دُھلتا جاتا تھا۔''

تازہ بستیاں آباد

مہاجرت انسانی زندگی کا ہمیشہ سے حصہ رہی ہے کیونکہ انسان ایک ماحول یا ملک میں تنگی ترشی یا عدم استحکام کے آثار دیکھے تو نقلِ مکانی کر جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا ارتقاء مہاجرت کی گوناگوں کیفیتوں کا مظہر رہا ہے اور ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ایک عظیم مہاجرت وقوع میں آئی۔ اس ہجرت کو بیسویں صدی کی سب سے بڑی ہجرت قرار دیا گیا کیونکہ لکھو کھہا انسان اپنے پرکھوں کا وطن چھوڑ کر اپنے نئے وطن کی طرف چل پڑے وہ وطن جس کا خواب ان لوگوں نے دیکھا تھا امن، سکون، آشتی اور آزادی کا وطن۔ اس وطن تک پہنچنے میں بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ کچھ راہ میں کھیت رہے کچھ یہاں پہنچ کر غریب الوطنی کے آلام کا شکار ہوئے۔ میں ۱۹۹۰ میں دوسری بار مہاجرت کا شکار ہوا تو میں نے انگریزی میں ایک نظم کہی THE GENERATION GAP اس نظم کا اب تک اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہوا مگر اس نظم نے بین الاقوامی ادبی حلقوں سے بہت تحسین وصول کی۔ اس انگریزی نظم کا عنوان تھا ''دو نسلوں کا بُعد'':

''نصف صدی پہلے

میرے آباء واجداد نے

آزادی اور اطمینان کی خاطر،

اپنی خوابوں کی سرزمین کی طرف، مہاجرت اختیار کی۔

نصف صدی کے بعد

ان کی اولاد نے بھی مہاجرت کی،

مگر، ایسی سرزمین کی جانب

جو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی''۔

یہ داستان پہلی مہاجرت کے بعد کی داستان ہے۔ ہم لوگ قادیان سے نکلے تو انفرادی طور پر جس جس کے

جہاں جہاں سینگ سمائے جا بیٹھا مگر جماعت کو تو بہر حال ایک مرکز درکار تھا۔ بنا بنایا مرکز کہاں سے آتا؟ جماعت کو ایسے خطہ ءزمین کی ضرورت تھی جہاں وہ اپنا مرکز تعمیر کر کے اپنے مشن کو جاری رکھ سکے۔ ادھر قدرت مہربان تھی اس نے صدیوں سے ایک بے آباد خطہ اسی مقصد کے لئے مختص کر رکھا تھا۔ یہ بے آب و گیاہ خطہ ءزمین دریا کے کنارہ پر ہونے کے باوجود روئیدگی سے عاری تھا ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے بعد کو مجھے بتایا کہ یہ علاقہ اتنا بے آباد اور خوف ناک تھا کہ وہ لوگ دن میں بھی یہاں سے گذرتے ہوئے ڈرتے تھے اور موٹر کی رفتار تیز کر دیا کرتے تھے۔ شور سے بھرپور زمین اور کالے کالے پہاڑ' ایک ویران قبرستان۔ خوف کے سارے قرینے موجود تھے بہت سے لوگ اس قطعہ ءزمین کو دریا سے پانی اٹھا کر یا زمین سے پانی نکال کر سیراب کرنے میں ناکامی کا اعلان کر چکے تھے اور لاکھوں روپیہ برباد کر چکے تھے۔ چنانچہ جماعت احمدیہ نے اس بے آب و گیاہ خطہ ءزمین کو چنا تو اردگرد کے لوگوں نے یہی سوچا ہوگا کہ عجیب سر پھرے لوگ ہیں اس بنجر زمین کو لے کر کیا کریں گے؟ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ جماعت واقعی سر پھروں کی جماعت ہے ظاہری مشکلات اس جماعت کا راستہ نہیں روک سکتیں' کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد۔

ربوہ میں کچے مکانوں کی آبادی تھی لمبی لمبی قطار میں کچی اینٹوں سے بنے ہوئے مکان۔ انجمن کے دفاتر کا بھی یہی اسلوب تھا۔ تین چار لمبی بیرک نما عمارتیں تھی جنہیں چھوٹے چھوٹے کمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہم بچوں کو دفاتر کی طرف جانے کی اجازت نہیں تھی صرف ایک دو بار ابا جی کو بلانے کے لئے جانا پڑا ۔کیونکہ امی بہت بیمار تھیں۔ آخر اسی بیماری میں انہوں نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور ربوہ کے بہشتی مقبرہ کے اولیں آباد کاروں میں شمار ہوئیں۔ یہ ۱۹۵۱ کی بات ہے اس وقت میں دسویں جماعت میں تھا اور چند مہینوں بعد میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اسی لئے گھر کے اداس اور پریشان ماحول سے دور رکھنے کے لئے ابا جی نے سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروا دیا مگر ہمارا سارا وقت رحمانی صاحب کے ہاں پھوپھی صوفیہ مرحومہ کے ہاں گذرتا تھا۔ سردار مصباح الدین صاحب کے گھر والوں سے اور سردار نذر حسین صاحب بلوچ کی بیٹی آپا لطیفی کے ساتھ قادیان سے تعلق تھا اس لئے ان لوگوں نے ماں کا غم بھلا دیا اور ہم امتحان دے کر ربوہ آ گئے۔ ربوہ کے ابتدائی دنوں کی آبادی خیموں میں

تھی ہم نے خیمے نہیں دیکھے مگر ہمارے دوست عبدالسلام اختر صاحب نے خیموں کا ذکر اتنی تفصیل سے ہمارے سامنے کر رکھا تھا کہ ہمیں خیموں کی آبادی اپنی آنکھوں دیکھی بات لگتی تھی۔ اختر صاحب بتایا کرتے تھے کہ پہلی رات ہم لوگ خوف کے مارے سو بھی نہیں سکے۔ کچھ اجنبی جگہ کا خوف ویرانی کا ڈر کچھ گیدڑوں کی ہاؤ ہو۔ خیموں میں رہنا تو جماعت والوں کے لئے اچنبھے کی بات نہیں تھی کیونکہ خدام کے اجتماعات میں خیموں میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ ہمیں تو یہ بات یاد ہے کہ حضرت صاحب کا قصرِ خلافت بھی کچا تھا اس کے ساتھ ایک کچی مسجد تھی اس میں حضرت صاحب نماز کے لئے تشریف لاتے اور جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ سخت گرمی کے دنوں میں بھی حضرت صاحب ظہر یا عصر کی نماز کے بعد مجلس عرفان کے لئے تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ ذہن میں ابھی تک وہ تصویر مستحضر ہے حضرت صاحب محراب میں تشریف رکھتے ہیں۔ ایک دو خادم پنکھا جھل رہے ہیں۔ حضرت صاحب کی قمیض پسینہ سے جسم پر چپک رہی ہے۔ ایک دو بار حضرت صاحب نے سر سے پگڑی بھی اتاری مگر ہمیں حضرت صاحب کا ٹوپی پہننا یاد نہیں۔ ربوہ میں بجلی تو بہت بعد میں آئی۔ اسی حالت میں گرمیاں بھی گذر جاتی تھیں سردیاں بھی۔ پھر ہمیں وہ قیامت بھی یاد ہے جب حضرت اماں جان کا انتقال ہوا۔ ہم نے کسی جنازہ کے ساتھ لمبے لمبے بانس پہلی بار بندھے ہوئے دیکھے۔ لوگ زار و قطار روتے دیکھے۔ حضرت اماں جان کی وفات کی خبر ریڈیو سے تین بار نشر ہوئی۔ لفظ تک ذہن میں ہیں ''بڑے افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی بیوہ اور امام جماعت احمدیہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی والدہ محترمہ آج ربوے میں انتقال کر گئیں''۔ اس وقت ربوے کا لفظ سن کر بہت اچنبھا ہوا کیونکہ 'امالہ' کا مسئلہ نہیں پڑھا تھا۔ پڑھا بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا جماعت کے اکثر مقرروں کو 'امالے' سے آج تک بے اعتنائی کرتے سن اور دیکھ رہے ہیں مگر ریڈیو والوں نے ایک ہی نشریہ میں امالے کا مسئلہ ذہن نشین کروا دیا۔ آبادی ریلوے لائن کے دونوں طرف تھی۔ ہم موجودہ دارالصدر والی طرف رہتے تھے اسے محلّہ الف کہا جاتا تھا لائن کے پار بھی کوارٹروں کی قطاریں تھیں۔ چاچا جی بھامڑی صاحب اور ماجد شاہدان کوارٹروں میں رہتے تھے گاڑی بھی دن میں شاید ایک ہی آتی تھی۔ صبح چھ بجے کے قریب اور شام کو چھ بجے کے قریب ہم لوگ چنیوٹ جاتے تو اسی گاڑی سے آتے جاتے تھے۔ گاؤں میں تھے تو اپنے گاؤں سے قاضیاں کے قصبہ تک پیدل ہی آتے جاتے تھے بس

یہی چنیوٹ کے جتنا فاصلہ ہوگا مگر پیدل آنا جانا کھلتا نہیں تھا یہاں وہ ماحول نہیں تھا اس لئے 'صبح کے بھولے شام کو گھر لوٹتے تھے'۔ پھر اباجی نے نورالدین صاحب خوش نویس سے ایک پرانی ریلے سائیکل خریدی۔ منشی صاحب سائیکل رکھنے اور کتابت کرنے کے بارہ میں بہت نستعلیق تھے۔ مچھلی کا شکار کھیلنے کے شوقین تھے شاید اب بھی ہوں اس لئے کتابت سے فارغ ہوتے تو کیل کانٹے سے لیس ہو کر دریا پر پہنچ جاتے تھے۔ یہ سائیکل ان کے حوصلوں کا ساتھ نہ دے سکی ہوگی اس لئے آپ نے بیچ دی ابا جی نے دفتر سے پیشگی لے کر یہ قیمتی سائیکل بیس روپے میں خریدی۔ ظاہر ہے اباجی اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ سائیکل پر بیٹھنے سے تو رہے اس لئے سائیکل ہمارے چنیوٹ آنے جانے کے لئے خریدی گئی۔ ماجد شاہد جو ہم سے ایک کلاس آگے تھا اور جثہ میں ہم سے زیادہ توانا تھا ہمارا ساتھی قرار پایا۔ ماجد سائیکل چلاتا ہم اطمینان سے کیریئر پر بیٹھتے مگر دو دو سائیکل سواروں نے ایک ڈبل گیئر سسٹم ایجاد کر لیا۔ وہ یوں کہ دریا کی چڑھائی چڑھتے ہوئے پیچھے کیریئر پر بیٹھا ہؤا سوار پیچھے سے پیڈل چلاتا تھا اور گدی پر بیٹھا ہؤا سوار بھی اس کے ساتھ ساتھ پیڈل چلاتا رہتا تھا اس طرح چڑھائی کا مرحلہ طے ہو جاتا تھا مگر یہ ڈبل گیئر اکثر سارا سارا رستہ ہی استعمال ہونے لگا تھا کہ ایک شخص کو سارا وقت سائیکل نہ چلانی پڑے۔ خاص طور پر جب ہوا تیز اور مخالف ہوتی تو یہ سسٹم بہت کارآمد رہتا۔ سڑک پر اکا دکا لاریاں چلتی تھیں وہ بھی گیس پلانٹ سے چلتی تھیں اکثر یوں ہوتا تھا کہ بسوں کا گیس پلانٹ دریا کی چڑھائی چڑھنے کے لئے مناسب قوت مہیا نہ کر سکتا تو بسوں کا انجن دم توڑ دیتا۔ تب سواریاں اتر کر دھکا لگاتیں اور انجن کی مدد کرتیں۔ خدا خدا کر کے چڑھائی ختم ہوتی تو سواریاں ہانپتی کانپتی بس میں سوار ہو جاتیں۔ (استاذی پروفیسر مبارک احمد انصاری نے یہ حصہ ملاحظہ فرمایا تو فرمایا کہ اس پلانٹ میں لکڑی کا کوئلہ جلایا جاتا تھا۔ کیمسٹری کے استاد ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے! ہم نے تو ادب کے ناطے لکڑی کے کوئلہ کا ایک ہی مصرف سن رکھا ہے " میں پاپن کچھ ایسی جلی کوئلہ بھیو نہ راکھ")۔ بسوں کے ڈرائیور ہم سائیکل سواروں پر بہت مہربان تھے کیونکہ بسا اوقات انہیں ہمارے دھکوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ سڑک چھوٹی سی تھی بمشکل ایک بس گذر سکتی تھی۔ اردگرد ریت کے انبار تھے اس لئے ہمیں سڑک سے اترنا پڑتا تو ہم سائیکلوں سے ہی اتر جاتے تھے کیونکہ ریت میں دھنس جانے کے بعد سائیکل کو کھینچنا مشکل کیا ناممکن ہو جاتا تھا۔ ٹرک اس زمانہ میں بہت شاذ ہی نظر آتے تھے

بار برداری کے لئے تانگے یا گھوڑے کام میں لائے جاتے تھے۔ ربوہ کے سبزی بیچنے والے چنیوٹ سے سبزی لاتے اور انہیں تانگوں پر لایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں گدھا بھی بار برداری کے لئے عام استعمال ہوتا تھا۔ آج کل تو صرف اینٹیں ڈھونے کے لئے یا ریڑھا کھینچنے کے لئے استعمال میں آتا ہے۔ ربوہ میں سب سے پہلے گدھوں کے ذریعہ بار برداری کا کام ہمارے ایک کلاس فیلو نعمت نے شروع کیا۔ اس کے پاس ایک گدھا تھا وہ اس سے اس زمانہ میں دو روپے دیہاڑی کما لیتا تھا اور ہمیں ٹھینگا دکھایا کرتا تھا کہ لو میں کماؤ پتر ہوں تم لوگ ماں باپ کے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔

ربوہ کی پہلی پہلی عمارتوں میں یعنی کچی عمارتوں میں جو عمارتیں ہمارے سامنے بنیں دفاتر تحریک جدید کی عمارتیں تھیں۔ تحریک کے دفاتر ایک چوکور احاطہ کی صورت میں تھے۔ یہ احاطہ بعد کو جامعہ احمدیہ کے ہاسٹل کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ایک احاطہ اور بھی تھا اسے 'احاطہ' کہا جاتا تھا اس کے اندر غرباء کے خاندان رہتے تھے ہمارے سکول کے دوستوں میں سے ایک دوست اس احاطہ میں رہتا تھا اس لئے ہمیں اس احاطہ کے اندر آنے جانے کا موقعہ ملتا رہا۔ اب تو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت خوش حال اور آل اولاد والا ہے اور لندن میں قیام پذیر ہے مگر اس میں ذرا جو تبدیلی آئی ہو۔ اسے اپنے بچپن کی ساری باتیں اور غربت کے سارے حالات یاد ہیں۔ یہی انسان کی بڑائی ہے کہ کشائش میسر ہو تو عدم کشائش کے زمانہ کو بھول نہ جائے۔ گر بہ دولت برسی' مست نہ گردی مردی '۔ ہماری گلی میں دونوں طرف کوارٹر تھے بیچ میں کشادہ راستہ تھا ہمارا مکان پہلا تھا مقابل کے پہلے مکان میں بھائی محمد عالم حضرت صاحب کے باڈی گارڈ اور ان کے ابا غلام حسین رہتے تھے دوسرے مکان میں بھائی جان محمد احمدؓ نعیم اور پھوپھا جی حضرت مولوی غلام نبی مصری تھے ہمارے ساتھ کے مکان میں قاری محمدؒ امین صاحب اور تیسرے مکان میں مولٰینا محمدؒ یعقوب صاحب طاہر تھے ان سے آگے چوہدری اعجاز نصر اللہ خاں تھے جوان دنوں معاون ناظر امور عامہ تھے۔ ان کی جگہ چوہدری عطاء اللہ صاحب آئے۔ سٹیشن کی جانب جہاں گلی ختم ہوتی تھی حافظ غلام محی الدین صاحب نے ایک چھوٹا سا چائے خانہ کھول رکھا تھا۔ حضرت مولوی مصلح الدین راجیکی وہیں تشریف رکھتے تھے اس لئے ہمارا وہاں آنا جانا تھا۔ ویسے ربوہ کے چائے خانوں میں سیلونی کا چائے خانہ بہت مشہور تھا۔ سیلونی صاحب عجیب خوشبودار چائے بناتے تھے خدا معلوم کون سی پتی استعمال کرتے

تھے اور چائے میں کیا خوشبو ملاتے تھے کہ ان کے ہاں سے ایک بار چائے پینے والا انہیں کا ہو کے رہ جاتا تھا۔ ایک کچے کوارٹر کے احاطہ میں ایک بہت بڑا خیمہ انہوں نے لگا رکھا تھا۔ پھر خدا جانے کیا بھوگ پڑا کہ سیلونی صاحب اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ربوہ ہی سے چلے گئے مدتوں بعد انہیں جھنگ کی ضلع کچہری میں ڈیرہ لگائے بیٹھے دیکھا مگر ان سے بات چیت کا موقعہ نہ ملا کہ ان سے پوچھ ہی لیتے کہ ربوہ کے لگے لگائے گاہک چھوڑ کر جھنگ میں آ بیٹھنے میں کیا تک تھی؟ ان کے ہاں صرف چائے ہی اچھی نہیں ہوتی تھی صفائی کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا صاف ستھرے برتن۔ صاف ستھری میزیں کرسیاں۔ اپنے خان میر افغان صاحب قادیان کے زمانہ سے حضرت صاحب کے باڈی گارڈ کے طور پر معروف تھے آپ نے بھی اک چائے خانہ کھول رکھا تھا اس میں پٹھانوں والی کڑک چائے بیچتے تھے۔ فیاض خاں صاحب کرمانی بھی چائے پلاتے اور اپنی خاموش گفتگو سے گاہکوں کو متمتع کیا کرتے تھے۔ ربوہ کی آبادی میں ایک اور بڑا سا خیمہ تھا وہ ملک عمر علی صاحب کا خیمہ تھا۔ آپ اس خیمہ میں رہتے تھے۔ تحریک جدید کے دفتروں میں کام کرتے تھے غالباً وکیل التبشیر تھے اور تبشیر کی خاطر ہی آپ نے ایک جرمن خاتون سے بیاہ بھی کر لیا تھا ربوہ میں اس بیاہ کا خوب چرچا ہوُا۔ ہمارے پڑوس ہی میں پچھلی گلی میں حضرت قاضی عبدالرحیم اور قاضی عبداللہ صاحب رہتے تھے۔ قاضی عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں مسجد مبارک اور نیا قصر خلافت تعمیر ہوُا۔ انجمن اور تحریک کے دفاتر کی عمارتیں بھی غالباً انہی کی نگرانی میں بنیں۔ نہایت محنت کرنے والے بزرگ تھے حضرت قاضی محمد عبداللہ صاحب سے تو کافی دیر تک متمتع ہونے کا موقعہ ملتا رہا۔ قاضی صاحب بہت اونچا سننے لگے تھے مگر شہر بھر میں آپ کا بہت احترام تھا۔ بزرگوں کا ذکر شروع ہو گیا تو حضرت مفتی محمد صادق صاحب یاد آ گئے۔ آپ بہت ضعیف تھے۔ لمبی سفید داڑھی سر پر سبز پگڑی بر میں ایک لمبا سا چغہ، غالباً دگلہ تھا یعنی اس میں روئی بھری ہوئی ہوتی تھی۔ حضرت مفتی صاحب آہستہ آہستہ چلتے اور محلہ کے بچوں میں ٹافیاں گولیاں بانٹتے رہتے تھے جدھر سے ان کا گذر ہوتا بچے قطاروں میں کھڑے ان کا انتظار کرتے۔ جو بچہ سلام کرتا حضرت مفتی صاحب اسے ایک گولی دے دیتے۔ کئی بچے ایک جگہ سے ٹافی یا گولی لینے کے بعد لپک کر دوسری جگہ جا پہنچتے اور پھر اپنا حصہ وصول کرتے۔ حضرت مفتی صاحب مسکراتے مگر اسے دوبارہ گولی یا ٹافی دینے سے انکار نہ کرتے۔ حضرت مفتی صاحب کی تقریریں جلسہ

سالانہ پر ذکرِ حبیب کے موضوع پر ہوتی تھیں اور بہت دلچسپی اور احترام سے سنی جاتی تھیں۔ مفتی صاحب کی زبان میں بہت مٹھاس تھی ذکر حبیب ان کی زبان سے بہت مزا دیتا تھا۔ مفتی صاحب کئی بار بات کرتے کرتے واقعات سناتے سناتے آب دیدہ ہو جاتے سارا مجمع رونے لگتا ہمیں حضرت مفتی صاحب کی زبان سے ذکر حبیب سننے کا جو مزا آیا وہ کسی اور سے سننے میں نہ آیا۔ غالب نے جو کہہ رکھا ہے ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا اس کی سمجھ مفتی صاحب کی تقریریں سن کر آئی۔

دیکھتے دیکھتے ربوہ کی آبادی میں پکے مکانوں کی کثرت ہوگئی۔ انجمن کے دفتر پکے بن گئے۔ ہم ہسپتال میں کلرکی کرتے تھے تو کچی عمارت میں ہسپتال قائم تھا۔ ایک کمرہ میں کلرک اور ڈاکٹر اکٹھے بیٹھتے تھے دوسرے میں ڈسپنسری تھی جہاں سے کرامت احمد خاں، بھائی حفیظ اور ان کے کزن بھائی عبدالقیوم دوائیں بانٹتے۔ ایک کمرہ میں لطفی یعنی لطف الرحمن شاکر بیٹھا "پالی پالی لمفو لمفو" کرتا گنتا اور خون جانچتا رہتا۔ پھر بڑا ہسپتال بنا۔ ربوہ کا نقشہ بدل گیا۔ بسوں کا اڈہ بن گیا۔ سٹیشن پر لکڑی کی گیلیوں سے بنے ہوئے چھوٹے سے کمرہ کی بجائے ذرا بڑا کمرہ بن گیا۔ پلیٹ فارم تو اب جا کر کہیں نئی عمارت کے بعد اونچا ہوا ہے اس زمانہ میں بالکل ہی زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک دو بار حضرت صاحب کہیں تشریف لے گئے تو ان کے لئے لکڑی کا بنا ہوا پائیدان علیحدہ سے مہیا کیا گیا جلسہ سالانہ بھی خوب ہوتا تھا۔ کچی بیرکیں بنتیں۔ ان پر سرکنڈے کی چھت ڈالی جاتی۔ ایک بار ہمیں یاد ہے کہ ایک بیرک میں اچانک آگ لگی اور دیکھتے دیکھتے ساری بیرکیں اس کی زد میں آگئیں خشک سرکنڈے کی چھتیں اور اندر پرالی۔ چشم زدن میں ساری چھتیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ خدام نے تگ و دو کر کے آگ بجھالی۔ اگلے روز پھر چھتیں ڈال دی گئیں جلسہ کا انتظام جاری رہا۔ ہم نے شعلوں کی لپکتی زبانیں دیکھیں تو بہت خوف آیا مگر کام کرنے والوں کے حوصلے بلند تھے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ بعد کو جلسہ سالانہ کے موقعہ پر چنیوٹ یا سرگودھے کی میونسپل کمیٹیوں سے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں عاریتاً منگوائی جاتیں اور جلسہ کے دنوں میں ربوہ میں موجود رہتیں ہم نے کبھی انہیں استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہی رہا اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو ہمیشہ ہر قسم کی آگ سے محفوظ ہی رکھا ہے۔ الحمدللہ۔ ڈاک خانہ بھی ایک کچی عمارت میں تھا اس میں پوسٹ ماسٹر ایک صاحب برج لال شاہ تھے ہم لوگ حیران ہوا کرتے تھے کہ یہ عیسائی ہو کر

شاہ کیوں کہلاتے ہیں؟ پھر سوچا برنارڈ شاہ کی طرح کے شاہ ہوں گے بڑے نستعلیق آدمی تھے صاف ستھرے کپڑے پہنتے ۔خاکی رنگ کی زین کے کپڑے ۔سر پر سولا ہیٹ ۔میاں منور احمد صاحب جب ربوہ کی نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی کے کرتا دھرتا تھے ۔کمیٹی کی طرف جاتے تو برج لال شاہ صاحب ہیٹ اتار کر انہیں سلام کیا کرتے تھے ۔کمیٹی کا ایک دو کمروں کا دفتر ڈاک خانہ کے ساتھ ہی تھا ۔اپنے حاجی برکت اللہ صاحب بعد کو ربوہ کے پوسٹ آفس میں آئے یا شاید اس وقت بھی موجود ہوں ہمیں علم نہیں ۔حاجی برکت اللہ صاحب کے ایک صاحبزادے مطیع اللہ درد تھے اور دوسرے رفیع اللہ ٹیلیفون کے محکمہ میں تھے اب بھی شاید ہوں ۔حاجی صاحب بھی ریٹائر ہونے کے بعد ایک سب پوسٹ آفس بنا کر کام میں مصروف رہے ۔معلوم نہیں حیات ہیں یا گذر گئے ۔خوب آدمی تھے غالباً مولانا درد صاحب کے عزیزوں میں سے تھے یا بھائی تھے؟ واللہ اعلم بالصواب ۔ بسوں کا اڈہ مدتوں قصرِ خلافت اور مسجد مبارک کے پاس رہا جہاں گھاس کے سرسبز وشاداب قطعات کے دائیں بائیں والی سڑکیں ملتی ہیں ۔ایک کونے پر اڈہ تھا دوسرے کونے پر مہمان خانہ ۔دار الضیافت بھی اب نئی جگہ پر بنا ہے پہلے اڈہ کے عین ساتھ تھا اب جہاں مسجد مبارک کے صحن کے آگے کا وسیع میدان نظر آتا ہے یہاں مہمان خانہ تھا کہ مہمان بس سے اترتے سیدھے مہمان خانہ میں پہنچیں ۔مسجد مبارک والا گیٹ بھی بعد کو بنا ہے جب حضرت صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا اس کے بعد ۔حضرت صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا تو غالباً ظہر یا عصر کی نماز کا وقت تھا ۔ایک شخص خدا معلوم کس طرح عین حضرت صاحب کے پیچھے نماز میں کھڑا ہو گیا ۔اس نے ایک تیز چاقو اپنی چادر میں چھپا رکھا تھا ۔ پہرے داروں کو اس کی حرکات پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا ۔نماز کے دوران یا نماز پڑھانے کے بعد، جب حضرت صاحب جھکے ہوئے تھے، رکوع کی خاطر یا جوتے پہننے کی خاطر، اس شخص نے عین گردن پر چاقو سے حملہ کر دیا چاقو گردن میں گہرا پیوست ہو گیا ۔خون کے فوارے چھوٹ پڑے ۔ ہمارے سکول کے پی ٹی ماسٹر ماسٹر غلام مرتضیٰ صاحب اتفاق سے اس وقت موجود تھے آپ نے لپک کر حملہ آور کو قابو کیا ۔ان کے سارے کپڑے حضرت صاحب کے خون سے سرخ ہو گئے ۔ بہر حال حضرت صاحب اندر تشریف لے گئے ۔اس قاتلانہ حملہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی ۔سب لوگ قصر خلافت کی طرف لپکے ۔حملہ آور کو قابو کیا گیا تو حضرت صاحب نے فرمایا اس کی پوری حفاظت کریں

بہی وجہ تھی کہ کسی نے اس بدقسمت شخص کو کچھ نہیں کہا ورنہ لوگ اس کی تکہ بوٹی کر دیتے۔ ہمیں اتنا یاد ہے اس وقت حضرت صاحب کا ایک پیغام جماعت کے نام پڑھ کر سنایا گیا اور بعد کو الفضل میں بھی چھپا اس دردناک پیغام میں بھی حضرت صاحب نے یہی کہا تھا کہ جماعت کو حوصلہ مندی کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ پیغام کی ساری باتیں تو اس وقت ذہن میں نہیں مگر اس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر تو میرا وقت مقدر آ گیا ہے تو جماعت کو حوصلہ کے ساتھ جماعت کے نظام کے ساتھ وابستہ رہنا چاہئے کیونکہ افراد کو تو بہر حال مرنا ہی ہوتا ہے جماعتیں نہیں مرا کرتیں۔ میں یہ ساری تفصیلات اپنی یادداشت کے زور سے لکھ رہا ہوں اس لئے ہوسکتا ہے حضرت صاحب کے پیغام کے اصل الفاظ سے کچھ اختلاف ہو لیکن اتنا یقین ہے کہ ان الفاظ کا یہی مطلب بنتا تھا واللہ اعلم بالصواب۔ ربوہ والوں کے لئے خاص طور سے وہ وقت بڑا کڑا وقت تھا۔ ہمیں یاد ہے حضرت صاحب کی صحت کے بارہ میں روز بلیٹن شائع ہوتے تھے۔ دعاؤں کی تحریک ہوتی تھی اور لوگ رو رو کر دعائیں کرتے تھے۔ ساری جماعت از حد بیقرار تھی۔ ربوہ کے در و دیوار سے اداسی ٹپکتی تھی۔ حضرت اماں جان کی وفات کے وقت جو نظارہ دیکھا تھا اسی قسم کی کیفیت سامنے آ رہی تھی مگر اللہ کا فضل ہوا اور حضرت صاحب ٹھیک ہو گئے اگر چہ اس زہریلے چاقو کا اثر اعصاب پر پڑا اور گیارہ بارہ برس بعد جب حضرت صاحب کا وصال ہوا تو بھی یہی جانا گیا کہ اس قاتلانہ حملہ کا اثر جسم اور اعصاب پر باقی ہے۔ حملہ آور کو اقدام قتل کے جرم میں پانچ یا چھ برس کی قید ہوئی۔ اس وقت ساری جماعت کو احساس ہوا کہ امام کا وجود جماعت کے لئے کیا ہوتا ہے؟

حضرت صاحب نے تقریباً نصف صدی تک جماعت کی رہنمائی فرمائی۔ اس عرصہ میں دو نسلیں پیدا ہوئیں ' بڑی ہوئیں اور بوڑھی بھی ہو گئیں ' اس لئے حضرت صاحب کا وجود ہی جماعت لگتا تھا انہی دنوں ایک فتنہء منافقین بھی جماعت میں برپا ہوا۔ اس فتنہ کی باگ ڈور تو بعض بڑے منافقین کے ہاتھوں میں تھی مگر ان لوگوں نے چھوٹوں کو آگے کر رکھا تھا۔ اس فتنہ کی سرکوبی کا حال بھی ہمیں خوب یاد ہے۔ ایک روز اچانک اخبار الفضل میں اعلان پڑھا کہ جماعت اللہ رکھا اور اس کے ساتھیوں سے بیزاری کا اعلان کرے کیونکہ یہ لوگ جماعت میں فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ساری جماعت چونک گئی کہ یہ اللہ رکھا کون ہے اور جماعت میں فتنہ کیوں پیدا کرنا چاہتا ہے؟ جماعت نے پورے خلوص اور تعہد کے ساتھ امام وقت

کے ساتھ وفاداری اور اطاعت کا عہد کیا بعد کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس فتنہ میں جماعت کے بعض بظاہر بڑے لوگ بھی ملوث تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جماعت کو اس فتنہ سے بچا لیا۔ حضرت صاحب نے جس حکمت سے اس فتنہ کا استیصال کیا اس سے جماعت کو یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ ان کی قیادت کیسے زیرک اور اولوالعزم امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس فتنہ کے بعد خدام اور اطفال اور انصار کے عہدوں میں امام وقت کی ہر معروف امر میں اطاعت کرنے کے الفاظ شامل کئے گئے۔ پہلے یہ الفاظ اس صورت میں موجود نہیں تھے۔ ہم لوگ محلہ الف سے اٹھ کر محلہ دارالرحمت وسطی والے مکان میں آ گئے۔ ساتھ پھوپھا جی کا ایک کمرہ کا مکان تھا اندر سے صحن ایک ہی تھا اس لئے باہر سے مکان بڑا لگتا تھا ہمارے اپنے گھر میں تایا جی محمد خاں، امی ابا، تین بہنیں تین بھائی، سب کی سمائی تھی۔ پھر دوسرا کمرہ بنا۔ اس وقت ہم شاید ایف اے کا امتحان دے رہے تھے ۔ ربوہ میں بجلی آ گئی تھی مگر ہمارے گھر تک نہیں پہنچی تھی بجلی کے محکمہ میں مکرم احمد زمان صاحب تھے اب ان کی اولاد جرمنی میں بیٹھی ہے۔ سید سجاد حیدر شاہ صاحب تھے ان کی اولاد بھی ہماری شاگرد ہوئی۔ نعیم حیدر کسی ڈائجسٹ میں کام کرتا تھا خدا معلوم کہاں ہے اور کہاں ڈائجسٹ ہو گیا ہے اس کا ماموں سید ارشاد علی شاہ ہمارا کلاس فیلو تھا۔ اس کے نانا سید مسیح اللہ شاہ صاحب ہمارے استاد تھے۔ اللہ بخشے خوب آدمی تھے۔ خدا خدا کر کے بجلی ہمارے گھر تک بھی پہنچی مگر صرف روشنی کے لئے استعمال میں آتی تھی۔ پنکھے چلانے کا رواج بعد میں آیا پھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے گھر میں ائر کنڈیشنر بھی لگے۔ مگر وہ وقت بھی گذر ہی گیا۔ ربوہ میں بجلی کی وہ آنکھ مچولی رہتی تھی کہ پناہ بخدا پہلے پہل میاں مظفر احمد صاحب نے اصرار کر کے حضرت مرزا بشیر احمد کے ہاں ائر کنڈیشنر لگوایا حضرت میاں صاحب نے واپڈا کے احمدی جنرل مینیجر چوہدری عبدالحمید صاحب کو ایک خط لکھا چونکہ ہم اس خط کے کاتب ہیں اس لئے ہمیں یاد ہے لکھا تھا ''میرے کمرہ میں عزیزم مکرم مرزا مظفر احمد نے ائر کنڈیشنر لگوا دیا ہے اگر بجلی کی کمی بیشی کی وجہ سے اسے کچھ ہوا تو ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی''۔ ظاہر ہے یہ خط تفنن کے طور پر لکھا گیا ہوگا مگر وہ ائر کنڈیشنر مدتوں واپڈا کی دست برد سے محفوظ رہا۔ ہمارے اپنے تجربہ میں یہ بات آئی کہ ہم واپڈا کے ڈائرکٹر فنانس کے کمرہ میں بیٹھے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی اور جاتے جاتے ڈائرکٹر صاحب کے ائر کنڈیشنر کی جان بھی ساتھ لیتی گئی۔ بجلی تو آ گئی ائر کنڈیشنر صاحب دوبارہ زندہ نہ کیا جا

ملک عمر علی صاحب کی کوٹھی کے قریب الٹ گئی۔ ایسی الٹی کہ پہیے اوپر ہو گئے۔ دو چار جانیں بھی تلف ہوئیں۔ ہم نے وہ بس دیکھی تو بہت خوف آیا جو پاکستان سے آتے وقت تک قائم تھا۔ مستزاد خود اپنے آپ کو حادثہ پیش آ گیا۔ انہی دنوں میں ہمارے ایک محلہ دار تھے ملک محمد اشرف صاحب غالباً تبشیر کے دفتر میں کام کرتے تھے وہ سرگودھا جاتے ہوئے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کمپنی کی کسی بس میں سفر کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہوئے اور جاں بحق تسلیم کی۔ ہمارے ساتھ واقفیت نہیں تھی مگر ہمارے یار ملک فضل الٰہی کے عزیزوں میں سے تھے اللہ بخشے ربوہ کے غالباً پہلے باشندے تھے جو بس کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ ربوہ میں ان کی حادثاتی موت کا بہت چرچا رہا۔ ان دنوں بسوں کے حادثات غیر معمولی سمجھے جاتے تھے آج کل تو حادثے زندگی کا معمول ہیں اور سال میں ہزاروں لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں۔ ملک فضل الٰہی کا ذکر آ گیا تو اپنے زمانہ کے انجمن کے ساتھی کلرکوں کا خیال آ گیا آج بھی انہیں کلرکی کرتے دیکھتے ہیں تو اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آزمائش سے جلد ہی نکال لیا۔ فضل الٰہی ہماری طرح ہمارے ساتھ ہی کلرکی کے میدان میں اترا تھا۔ بھیرہ کا رہنے والا نہایت باوفا دوست ہے۔ ہماری عمریں ایک جیسی تھیں اس لئے ہمارا یارانہ بھی بہت تھا فضل الٰہی کلرکی چھوڑ کر مونگ رسول کے اوورسیئر سکول میں داخل ہو گیا اور محکمہ انہار سے اسسٹنٹ انجینئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوا اور اب سعودی عرب میں کسی کمپنی میں کام کرتا ہے اس زمانہ کے ساتھیوں میں سے ارشاد شاید آفس سپرنٹنڈنٹ ہے۔ مولوی جمیل صاحب تو ریٹائر ہو گئے انجمن کے دفتروں پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو بہت سے لوگ اس زمانہ کے لگتے ہیں مگر ان سے شناسائی کا سلسلہ نہیں تھا۔

حضرت میاں بشیر احمد صاحب کی وفات بھی ساٹھ کی دہائی کے شروع میں ہوئی۔ ہمیں یاد ہے ہم یونیورسٹی لائبریری میں بیٹھے تھے کہ ایک دوست نے حضرت میاں صاحب کی وفات کی خبر سنائی ہم سیدھے ۲۳ ریس کورس روڈ پہنچے۔ ساری جماعت احمدیہ لاہور وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ یہ کوٹھی میاں مظفر احمد صاحب کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ حضرت میاں صاحب کا جنازہ اندر رکھا تھا لوگ ایک دروازہ سے دیدار کے لئے اندر جاتے دوسرے سے نکل جاتے۔ بیماری کی نوعیت کا تو ہمیں علم نہیں مگر اتنا سنا کہ بخار اتنا تیز تھا کہ بار بار برف کے پانی سے جسم کو تر کرنے کے نہیں اترتا تھا اسی بخار میں آپ نے جاں دے

دی۔ بہت صدمہ ہوا۔ حضرت میاں صاحب سے احمدی ہونے کے ناطے سے جو تعلق تھا ہمارا تعلق اس سے کہیں زیادہ تھا۔ ہم نے زندگی کا ایسا زمانہ ان کے سائے میں بسر کیا تھا جو نہایت اہم زمانہ ہوتا ہے۔ ہمیں تعلیم کا شوق دلانے میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ جب بھی ملنا ہوتا تعلیم کی ترقی کا پوچھتے رہتے۔ اے کاش ہمارے پی ایچ ڈی ہو جانے تک زندہ رہتے تو انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ انہیں اس بات کا اشتیاق بھی تھا کہ ربوہ میں ان کے سائے میں پلا ہوا کوئی بچہ تعلیمی لحاظ سے اس مرتبہ تک پہنچے۔ لاہور سے ان کا جنازہ ربوہ لایا گیا۔ ہم بھی ایک بس میں ساتھ آئے ۔ اگلے روز ان کا جنازہ ہوا۔ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج نے جنازہ پڑھایا۔ ربوہ میں ہم نے پہلا جنازہ جو حضرت مرزا ناصر احمد کی امامت میں پڑھا غالباً یہی تھا۔ خلافت کے مرتبہ پر تو وہ ۱۹۶۵ میں فائز ہوئے۔ ربوہ کی ساری آبادی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ کچے مکانوں سے پکے مکانوں' کوٹھیوں تک 'سب کے ہم چشم دید گواہ ہیں۔ پہلے پہلے ربوہ میں ملک صاحب خاں صاحب نون نے اپنی کوٹھی بنائی۔ ملک صاحب خاں صاحب نون ڈپٹی کمشنر کے طور پر ریٹائر ہوئے تھے اور نہایت مخلص احمدی تھے۔ عمر بھر نرینہ اولاد کی خواہش میں گھلتے رہے آخر اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا دیا ملک احمد خاں نون۔ مگر ملک صاحب کی وفات کے بعد وہ ربوہ چھوڑ گئے۔ ملک صاحب خاں صاحب نون سرگودھا کے بڑے زمینداروں میں سے تھے۔ انگریز حاکموں کا دستور تھا کہ وہ مقامی شرفاء میں سے بعض لوگوں کو انتظامی عہدوں پر متعین کیا کرتے تھے۔ ملک سر فیروز خاں نون کے والد کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ملک صاحب کی کوٹھی ربوہ کی پہلی پہلی کوٹھی تھی۔ ہم نے ملک صاحب کو ایک یا دو بار دیکھا۔ نہایت متین اور سنجیدہ آدمی تھے مگر ہمیں اس زمانہ میں ان سے مستفید ہونے کا موقعہ نہ ملا یہاں تک لکھا تھا کہ خیال آیا کہ اگر کوئی پڑھنے والا پوچھ بیٹھے کہ شروع میں آپ نے لکھا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ تک اس زمین میں نہیں تھا تو ہم اتنے مکانات اور کوٹھیوں پر کوٹھیاں کہاں سے بناتے چلے جا رہے ہیں؟ تو ہم کیا جواب دیں گے؟ ربوہ میں پانی کی یافت بھی عجیب معجزہ ہے۔ جس طرح پہلی مسجد ہسپتال کے احاطہ میں مسجدِ یادگار کے نام سے کھڑی ہے اسی طرح پہلا ٹیوب ویل البشریٰ والے چوک میں میاں منور احمد صاحب کی کوٹھی والے کونے پر لگا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے بارہ میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو بتایا گیا 'پاؤں کے نیچے سے مرے پانی بہا دیا' یہ جگہ

خواب میں دکھائی گئی۔ اگلے روز اسی جگہ سے جہاں سے کئی بار بورنگ کے باوجود ناکامی ہو چکی تھی پانی نکل آیا صرف وہیں سے نہیں نکلا ربوہ میں ہر جگہ سے نکل آیا پانی نہ نکلتا تو آبادی کہاں سے ہوتی؟ مگر پانی ابتدا میں اتنا نمکین تھا کہ بالکل کڑوا محسوس ہوتا تھا اور پینے کے لئے احمد نگر سے پانی لانا پڑتا تھا اب تو لوگ دریا کا مصفا پانی پیتے ہیں اور سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی زمانہ میں ربوہ کا پانی کڑوا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس پانی کی نمکیت کم ہوتی گئی اور انہیں علاقوں کا پانی اب پینے کے قابل ہو گیا ہے مثلاً دارالرحمت وسطی کا پانی شروع سے ہی نسبتاً میٹھا تھا اب بھی ہے مگر دارالصدر کا پانی بھی اب پینے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس وقت نلکے بھی بہت گہرائی پر جا کر لگتے تھے اس زمانہ میں قریشی فضل حق، عبدالغنی صاحبان نے بہت محنت کی۔ اسی محنت کا صلہ اللہ تعالیٰ نے دیا کہ اب بورنگ کے سلسلہ میں اتنی گہرائی میں نہیں جانا پڑتا۔ پھر ٹیوب ویل لگے۔ کالج کی عمارت بنانے کا مرحلہ تھا مگر کالج کے احاطہ میں یا کالج کے قریب پانی کا نام و نشان نہیں تھا اس لئے کالج کا ٹیوب ویل دارالعلوم میں جا کر لگا وہیں جہاں آس پاس میں ہمارے دوست جسٹس محمد اسلام بھٹی صاحب کی زمین تھی۔ پانی اتنی دور سے لانا پڑتا تھا مگر کام کہیں رکا کرتے ہیں کالج کی عمارت بنی کالج لاہور سے ربوہ منتقل ہوا۔ ہوسٹل میں کئی سو طلباء رہتے تھے سب ہی پانی کے سلسلہ میں مطمئن رہے صرف یہ تھا کہ گھر میں اگر ذاتی نلکے پر ڈونکی پمپ لگا کر پانی اٹھا کر غسلخانوں تک پہنچایا جاتا تھا تو چائے بنانے میں آسانی رہتی تھی۔ قارئین حیران تو ہوں گے کہ یہ کیا شتر گربہ ہے؟ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم نے ڈونکی پمپ سے پانی اٹھا کر اپنے گھر کے غسل خانہ تک پانی پہنچا رکھا تھا کہ نہانے دھونے میں آسانی رہے۔ ہمارے ایک زندہ دل مہمان لاہور سے تشریف لائے ہوئے تھے نہانے کے لئے غسل خانہ میں گئے تو تھوڑی دیر کے بعد نوکر کو آواز دی۔ وہ بھاگا بھاگا گیا تو فرمانے لگے ذرا ایک کپ اور چائے کی پتی لے آؤ۔ وہ اس مطالبہ پر بھونچکا رہ گیا۔ تو مہمان موصوف نے ڈانٹا کہ جاتے کیوں نہیں میرا وقت ضائع کر رہے ہو؟ بیگم صاحبہ سے کہو چائے کی پتی اور ایک کپ دے دیں! وہ بچارا با دلِ ناخواستہ آیا اور ہماری بیگم تک مہمان موصوف کا مطالبہ پہنچایا انہوں نے ہمیں بھگایا کہ جا کر مہمان کی خیر خیریت دریافت کریں کہ نہاتے میں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ ہم نے چائے کی پتی کی لم پوچھی فرمانے لگے نہیں اب ضرورت نہیں رہی پانی ٹھنڈا ہو گیا ہے ورنہ شروع شروع میں اتنا گرم پانی نکلا

تھا کہ میں نے سوچا اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چائے ہی بنالوں ۔ بھابھی تکلیف سے بچ جائیں گی ۔سو جناب ہمارے ہاں پانی کا یہ عالم بھی رہا ہے اب تو ٹینکی کا پانی ہے اور ذرا سی دیر میں ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔آجکل کے باشندے اس دور کی صعوبتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے ۔مگر یہ سارا مسئلہ دنیا کو حیران کر دینے کے لئے کافی تھا کہ وہ جگہ جہاں لوگ ہزار ہا روپیہ خرچ کرنے اور رائج الوقت ٹیکنالوجی استعمال کرنے کے باوجود پانی حاصل نہ کر سکے تو اس جماعت کے پاس کیا نسخہ تھا کہ جھٹ پانی نکل آیا۔نسخہ تو ہمیں بھی معلوم ہے مگر بتانے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ وہ نسخہ ہر ایک کے کام نہیں آتا۔اس نسخہ کی تیاری میں راتوں کی دعائیں اور سحر گاہ کا تضرع شامل کرنا پڑتا ہے۔یہی اجزاء آجکل نایاب ہورہے ہیں۔ پانی کے سلسلہ میں کافی دقت بھی رہی۔گھروں میں نلکے ہونے کے باوجود پینے کا پانی بعض خاص محلوں سے منگوانا پڑتا تھا مثلاً انجمن اور تحریک کے کوارٹرز جس جگہ واقع ہیں وہاں کا پانی پینے کے قابل نہیں ہوا ان لوگوں کو زائد پیسے خرچ کر کے سقہ لگوانا پڑتا تھا جو دارالرحمت سے پانی ڈھوتا تھا اس وقت پینے کے پانی کی قدر ہوئی پھر جن محلوں کا پانی نمکین تھا وہاں یہ عالم بھی تھا کہ پانی میں نمکیات کی کثیر مقدار شامل تھی ہم مذاق میں کہا کرتے تھے کہ حکومت ایٹمی توانائی کے سلسلہ میں خوانخواہ ''بھاری پانی'' کے مہیا کرنے میں اتنی تگ و دو کر رہی ہے ربوہ سے پانی منگوالے۔ بھاری پانی کا مسئلہ حل ہو جائیگا اس پانی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس پانی سے نہانے کے بعد بالوں کا میل وغیرہ نکل جاتا تھا مگر خود پانی نہیں نکلتا تھا۔ پانی کے سارے اجزا بالوں کو یوں گچھا مچھا بنا دیتے تھے کہ الامان والحفیظ۔مگر اس سب کچھ کے باوجود ربوہ آباد ہوا پانی کی فراوانی ہوئی سبزہ بھی ہو گیا جہاں ایک تنکا نہیں اگتا تھا وہاں گلشنِ احمد نرسری کے اشتہارات الفضل میں شائع ہوتے ہیں۔زمین گل وگلزار ہو گئی ہے۔گھروں میں پائیں باغ کا رواج بھی ہو گیا ہے۔ کالج کا نیا کمپس تو نسبتاً زرخیز زمین پر قائم ہوا ہے وہاں روئید گی تھی مگر وہاں امرودوں کا باغ لگانے کا کوئی نہیں سوچ سکتا تھا۔امرودوں کے باغ لگانے سے ایک امرود بیچنے والا یاد آیا اس نے کالج کے امرودوں کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ادھر کوٹ امیر شاہ کی طرف ایک امرودوں کا باغ تھا۔ اس نے کالج کے امرودوں کو کوٹ امیر شاہ کے امرودوں سے ممیّز کرنے کے لئے نعرہ ایجاد کیا تھا۔کہا کرتا تھا ''لوجی یونیورسٹی کے پڑھے لکھے امرود''۔ کالج کے نئے کمپس کو زبانِ خلق نے ہمیشہ یونیورسٹی ہی کہا

اور زبانِ خلق نقارہ ، خدا ہوتی ہے ۔کالج تو میایا نہ جاتا تو ہم اسے یونیورسٹی بنا ہی لیتے ۔ خیر وہ وقت بھی انشاء اللہ ضرور آئے گا۔

ربوہ میں مہمانوں کی آمد ورفت کا سلسلہ سارا سال ہی جاری رہتا تھا اب بھی ہوگا۔اس زمانہ میں حکیم فضل الرحمٰن صاحب دارالضیافت کے نگران تھے۔حکیم صاحب لمبا عرصہ افریقہ میں مبلغ رہ کر تشریف لائے تھے نہایت وجیہہ اور دبنگ آدمی تھے ان کا رعب داب بھی بہت تھا۔ہاتھ میں ایک کھونڈ بھی رکھتے تھے۔ایک دو فقیر عین کھانے کے موقعے پر آٹپکا کرتے تھے حکیم صاحب نہایت احترام سے انہیں کھانا دے دیا کرتے تھے کسی نے کہا یوں فقیروں کو کھانا دیتے رہئے گا تو سارے علاقہ کے فقیر اپنے اپنے کشکول لئے آموجود ہوں گے۔حکیم صاحب مسکرائے فرمایا ''یہ میرا کھونڈ کس مرض کی دوا ہے؟'' مگر ہم نے کبھی انہیں کسی فقیر کو جھڑکتے یا کھانا دینے سے انکار کرتے نہیں دیکھا۔فرماتے تھے جس کا لنگر ہے اس نے یہی طریق رکھا تو میں کون ہوتا ہوں اس کو بدلنے والا؟ دارالضیافت میں مہمانوں کی ریل پیل رہتی تھی۔صبح کے وقت کھانے میں دال اور شام کے وقت آلو یا شلجم گوشت ہوتا تھا۔یہ طریق پرانا تھا اور خدا معلوم کب سے چلا آتا تھا جب کالج بن رہا تھا حضرت میاں ناصر احمد صاحب سائیکل پر سوار آتے جلدی جلدی کھانا کھاتے اور کالج پہنچ جاتے تا کہ کالج کے کام کی نگرانی میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ہمیں دو ایک بار انہیں دیکھنے کا موقعہ ملا۔ خاموشی سے آتے دال روٹی جو کچھ میسر ہوتی کھاتے اور یہ جا وہ جا۔ایسا ہی ہم نے جلسہ سالانہ کے موقعہ پر مرزا طاہر احمد صاحب کو دیکھا تنور پر بیٹھے روٹی اترتی دیکھ رہے ہیں۔ایک روٹی کھا رہے ہیں سالن کی پروا نہیں اگر کسی نے سالن سامنے رکھ دیا تو لقمہ اس میں ڈبو لیا ورنہ سادہ روٹی کھا کے چلتے بنے۔نگرانی بھی ہوگئی نمونہ بھی چکھ لیا ایک پنتھ دو کاج۔

دارالضیافت نئی عمارت میں منتقل ہوا تو مرزا معظم بیگ صاحب اس کے نگران بنے۔ یہ بزرگ ربوہ کے ماحول کے نہیں تھے کہیں باہر سے تشریف لائے تھے اس لئے زیادہ دیر نہیں ٹکے اب تو منور جاوید صاحب نے خوب کام سنبھال لیا ہے حالانکہ مغلپورہ میں جہاں سے تشریف لائے ہیں ریلوے ورکشاپ تو موجود ہے لنگر خانہ کی ٹریننگ کا کوئی بندوبست نہیں پتہ نہیں اتنا تجربہ کہاں سے لے آئے کہ اس عالمی لنگر کو نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔خادم تھے تو گنج مغلپورہ کی مجلس کی وجہ سے بہت معروف تھے ہم سمجھا

کرتے تھے گنج میں رہتے ہیں تو محض 'گنجِ' خوبی ہوں گے مگر یہ تو گنجِ گرانمایہ نکلے۔

بات اب عام آدمیوں سے نکل کر گنج ہائے گرانمایہ تک پہنچنے لگی ہے اس لئے ہمیں رک جانا چاہئے ابھی تک تو لوگ ہمارے مضمونوں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے لکھے دیتے ہیں کل جانے کیا ہو 'امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے۔ پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے۔'

خاموش علماء

دنیا کا دستور ہے کہ ہر سلسلہ میں ایسے علماء موجود رہتے ہیں جو اپنی خاموش طبعی یا فطری حجاب کی وجہ سے سامنے نہیں آتے مگر اپنے اپنے میدان میں علمی خدمات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں ان کی حیثیت ان کل پرزوں کی سی ہوتی ہے جو سامنے نہیں ہوتے مگر مشین کو قوت بہم پہنچاتے رہتے ہیں اگر ان میں سے کسی کل پرزے کو نقصان پہنچ جائے تو ساری مشین کی قوت متاثر ہوتی ہے۔ انسانی تہذیب کی ترقی ایسے خاموش طبع عالموں کی رہینِ منت رہی ہے۔

ہم نے قادیان میں اور ربوہ میں بعض ایسے عالموں کو دیکھا اور ان سے حسب عمر و استطاعت استفادہ کیا جو بظاہر بالکل خاموش طبع تھے مگر بہ باطن علم کا بحرِ بے کراں تھے۔ اپنے گھر میں حضرت مولوی غلام نبی مصری کا وجود سامنے تھا۔ آپ نہایت مسکین طبع خاموش طبع عالم تھے۔ عربی میں ان کا کہا مستند سمجھا جاتا تھا مگر کبھی جوان کے منہ سے تفاخر کی کوئی بات سنی ہو۔ نہیں وہ تو ایسے حلیم الطبع تھے کہ ہم بچوں میں سے کسی کو کسی بات پر سرزنش بھی کرنا پڑتی تو گھبرا جاتے۔ قادیان کے مدرسہ احمدیہ میں استاد تھے اور حضرت خلیفۃ المسیح الاول کے خاص الخاص شاگردوں میں سے تھے ان کے شاگردان کے احترام میں بچھے جاتے تھے مگر پھوپھا جی کہ ہماری پھوپھی بیگم جی ان کے عقد میں تھیں، ان سے بھی بڑھ کر ان سے تواضع سے پیش آتے تھے۔ کوئی شاگرد فرطِ ادب سے آنکھیں جھکا کر بات کرتا تو آپ فروتنی سے اور زیادہ جھک جاتے۔ زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی ہاں یا نہ میں جواب دیتے۔ ہاں کسی مسئلہ پر تفصیل بیان کرنا درکار ہوتی تو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر تفصیل بیان فرماتے۔ گھر میں یا گھر سے باہر ہم نے کبھی انہیں کسی بات پر بر افروختہ ہوتے نہیں دیکھا۔ عربی زبان ان کا تخصص تھا لکھتے بھی عربی رسم الخط میں تھے مگر عربوں کے بر عکس ان کے کلام میں جامعیت تو ہوتی تھی مبالغہ نہیں ہوتا تھا۔ اختصار ان کی طبیعت کا خاصہ تھا مَاقَلَّ وَ دَلَّ۔

حضرت مولوی غلام نبی مصری اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے ان کی بہبود کا خیال رکھنا

ان کے لئے ہر وقت دعائیں کرتے رہنا۔مکرم ملک عمر علی صاحب کھوکھر رئیس ملتان کو پھوپھا جی سے خاص عقیدت تھی ان سے حدیث کا درس بھی لیا کرتے تھے رئیس تھے مگر ہمارے گھر میں آتے تو کھری چارپائی پر بیٹھ کر درس لیتے ایک بار ملک صاحب کے بارہ میں خبر ملی کہ وہ بیمار ہیں ۔ پھوپھا جی نے جس بیقراری سے ان کی صحت کے لئے دعائیں کیں اس پر بہت رشک آیا لڑکپن کا زمانہ تھا خیال ہؤا کہ ملک صاحب امیر کبیر آدمی ہیں اس لئے پھوپھا جی ان کے لئے اتنی بیقراری سے دعائیں کر رہے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد قادیان سے ملک صلاح الدین صاحب کی طرف سے دعا کی درخواست آئی تو ہم نے دیکھا کہ ملک صلاح الدین صاحب کی صحت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ابتہال اور تضرع سے دعائیں کر رہے ہیں ۔تب اندازہ ہؤا کہ ان کے دل میں سارے ہی شاگردوں کے لئے محبت کا ایک خاص گوشہ ہے اور جب کسی شاگرد کو بیمار پاتے ہیں تو اس کی صحت کے لئے دل و جان سے گداز ہو کر دعائیں کرتے ہیں ۔ استاد اپنے شاگردوں کو اور دے بھی کیا سکتا ہے؟ اور جن شاگردوں کو ایسے استاد نصیب ہو جائیں اور انہیں چاہئے بھی کیا؟ چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر ہم نے اپنے شاگردوں سے محبت کرنے کے قرینے حضرت پھوپھا جی سے ہی سیکھے ہیں ۔ ورنہ ہم کیا ہماری استادی کیا؟ فارسی والوں کا کہا تو ہمیں یاد ہی ہے' درسِ ادیب اگر بود زمزمہ محبتے ۔ جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را' مگر بات صرف مکتب تک محدود نہیں رہنی چاہئے ۔حضرت پھوپھا جی نے اپنے شاگردوں سے تعلق کو زندگی بھر کا تعلق بنایا اور یہی سمجھ کر نبھایا۔ ان کی آخری بیماری کے دوران ہم نے ان کے شاگردوں کو جس طرح بیقراری کے ساتھ ان کے لئے دعائیں کرتے دیکھا اور تشویش کا اظہار کرتے دیکھا وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا ۔ ایک کمرہ کا چھوٹا سا مکان تھا۔لوگ آتے ۔ باہر ہی سے حال پوچھتے اور دعائیں کرتے واپس چلے جاتے ۔ پھوپھا جی آخر وقت تک ہوش میں رہے اس لئے جس جس کے بارہ میں انہیں اطلاع کی جاتی کہ وہ عیادت کے لئے حاضر ہوئے تھے تو بہت ممنونیت کا اظہار کرتے اور بہت دعائیں دیتے ۔ دعا ان کا خاص وصف تھا۔ ان کے لب ہر وقت ذکرِ الٰہی سے تر رہتے تھے ۔ان کی وفات پر معلوم ہؤا کہ کتنا بڑا اور بزرگ عالم دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ موتُ العالِمِ موتُ العالَم ۔

دراصل اس مضمون میں ایسے علماء کا ذکر کرنا مقصود ہے جو سٹیج کے آدمی نہیں تھے یعنی تقریر کے مردِ میدان

نہیں تھے مگر ان کا وجود سلسلہ کے لئے اسی طرح مفید اور ضروری تھا جس طرح عالم مقرروں کا ہوتا ہے۔ خود ہمارے ابا حضرت مولوی احمد خاں نسیم فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ تو دیہاتی مبلغ ہیں۔ ایک بار مولانا عزیز الرحمٰن منگلہ ابا جی سے کہنے لگے آپ جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ پر تقریر کیوں نہیں کرتے؟ ابا جی نے کہا میں سٹیج کا آدمی نہیں ہوں۔ منگلہ صاحب کہنے لگے مگر آپ چک منگلے میں تو خوب تقریریں کرتے ہیں۔ ابا جی نے کہا درست مگر جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسے میں اور چک منگلے کے جلسے میں بہت فرق ہے۔ جلسہ سالانہ کا سٹیج ایک علمی سٹیج ہے جہاں سے سلسلہ کے علماء جماعت کا علمی موقف دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہم لوگ دیہاتیوں کے طور طریقوں سے دیہاتیوں تک پیغام پہنچاتے ہیں اور بس۔ سلسلہ عالیہ احمدیہ میں ہزاروں ایسے لوگ تھے جو سٹیج کے آدمی نہیں تھے مگر سلسلہ کے لئے ان کا وجود اسی طرح لابدی تھا۔ حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری مانے ہوئے عالم تھے مگر سٹیج کے آدمی نہیں تھے۔ اگر کہیں جوانی میں سٹیج پر تقریر کی ہو تو وہ ہمارے ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ ہم نے سلسلہ کے اکثر علماء کو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے دیکھا۔ یہ تو ہمارے اپنے تجربے کی بات ہے کہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے کسی مسئلہ پر حضرت حافظ صاحب سے راہنمائی چاہی اور ہمیں ہی خط دے کر بھیجا حضرت میاں صاحب کا استفسار بھی ہم نے ہی لکھا اور حضرت حافظ صاحب کا جواب بھی ہمیں نے قلمبند کیا۔ جماعت کے علماء میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ حافظ صاحب نرے پرے شاعر ہی نہیں تھے بڑے متبحر عالم تھے۔ ایک بار سلسلہ کے کسی معاند نے حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے کلام پر اعتراض کیا کہ حضرت صاحب نے ''کہ تا'' کی ترکیب باندھی ہے جو سراسر غیر فصیح ہے۔ ''اک برہنہ سے نہ یہ ہوگا کہ تا باندھے ازار''۔ ہم حاضر تھے۔ حضرت حافظ صاحب فرمانے لگے میاں بتاؤ تو کس کس استاد شاعر نے ''کہ تا'' کی ترکیب باندھی ہے؟ ہمارا سارا علم غالب تک پہنچ کر تمام ہوگیا کہ 'آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے ''کہ تا''۔ اس پہ کھل جائے کہ اس کو حسرت دیدار ہے۔ حافظ صاحب نے اساتذہ شعراء اردو کے کلام سے اپنی یادداشت کے زور پر 'خدا جھوٹ نہ بلوائے' تو بیسیوں اشعار ہمیں ایسے سنا دئے کہ لو ان اساتذہ نے ''کہ تا'' کی ترکیب باندھی ہے اور معترض نے کہ اپنے کو بڑا مستند اور عالم صحافی جانتے ہیں کتنا بودا اعتراض کیا ہے انہیں ان اساتذہ کے کلام کا علم ہی نہیں۔ اب ایسے وجود کہاں؟ مگر حضرت حافظ

صاحب خاموش عالم تھے۔ گفتگو ایسی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی مگر تقریر ان کا میدان نہیں تھا۔

حضرت حافظ صاحب کی یادداشت کمپیوٹر جیسی تھی۔ حوالے انہیں یاد رہتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہم حاضر تھے۔ حضرت حافظ صاحب کو کسی حوالہ کی ضرورت پڑی۔ ان کا کمرہ کتابوں کا کباڑ خانہ لگتا تھا۔ فرمایا 'میاں تمہی تکلیف کرو وہ سامنے کتابوں کا جو ڈھیر ہے اس میں ساتویں یا چھٹے نمبر پر ایک کتاب پڑی ہے اس کے صفحہ ۳۱۵ پر آٹھویں یا دسویں سطر میں ایک حوالہ ہے جو مجھے درکار ہے ذرا ہاتھ بڑھائیو'۔ ہم حیران رہ گئے۔ حافظ صاحب کی بات باون تولے پاؤ رتی کی تھی۔ حوالہ اسی مقام پر موجود تھا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا اور پھر کتاب رکھ دی۔ دو ہفتوں کے بعد اتفاق سے اسی حوالہ کی ضرورت پڑی تو کسی اور مقام پر رکھی ہوئی کتاب کا محل وقوع انہیں یاد تھا۔ ہم سمجھتے تھے ان کا کمرہ کتابوں کا کباڑ خانہ ہے مگر وہ تو کتب خانہ نکلا۔ اس کتب خانہ کی ساری کیٹالاگ حافظ صاحب کے ذہن میں محفوظ تھی۔ ایسی یادداشت ہم نے بہت کم دیکھی۔ جاپان میں ایک لائبریرین کی یادداشت میں حضرت حافظ صاحب کی یادداشت کا پرتو نظر آیا مگر ان کا میدان ہی کتاب خانہ تھا۔ ہمارے شعبہ اردو کی لائبریری اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو رہی تھی۔ ساری کتابیں ایک ڈھیر کی صورت میں بکھری پڑی تھیں۔ اتفاق سے جاپانی ٹی وی ''این ایچ کے'' والوں کو کسی حوالہ کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے ہم سے استمداد کیا۔ ہم حوالہ دیکھنے کے لئے لائبریری میں پہنچے تو ساری کتابوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ اب کیا ہوگا؟ لائبریرین سے رابطہ کیا فرمانے لگیں کہ آپ کی مطلوبہ کتاب فلاں پشتے میں فلاں نمبر پر پڑی ہے ہم نے دیکھا کہ کتاب موجود تھی۔ یہ صفت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے سلسلہ عالیہ احمدیہ کو ایسے عالم دے رکھے تھے جو اپنی ذات میں چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ ہمارے مولینا دوست محمد شاہد کوئی کم حوالہ شناس نہیں انہیں بھی ہزاروں حوالے زبانی یاد رہتے ہیں۔ ربوہ کے ابتدائی دنوں میں ایک صاحب لائبریری میں تھے حکیم غلام حسین غالباً ان کا نام تھا۔ وہ بھی کتابوں کے عاشق تھے۔

ایک خاموش عالم مولانا عبداللطیف بہاولپوری تھے۔ جامعہ احمدیہ میں استاد تھے۔ ہمیں ان کی خدمت میں حضرت مولانا راجیکی صاحب نے ایک بار کسی کام کی غرض سے بھیجا تھا۔ مولوی صاحب راجیکی صاحب کے گھر کے قریب (قریب کیا ''عنقریب'' یعنی بالکل سامنے کونے پر) رہتے تھے۔ ہم گئے تو اس وقت

کسی کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے حضرت مولانا راجیکی صاحب کا پیغام سنا تو فوراً اس کی تعمیل کی طرف توجہ کی۔ ان کی وفات پر ان کے بارہ میں مضامین چھپے تو ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ ہوا مگر ان کی طبیعت میں ایسی خاموشی اور عزلت گزینی تھی کہ انہیں کبھی نمایاں نہیں دیکھا۔

جماعت کے خاموش علماء کا ذکر ہو رہا ہے تو خیال آرہا ہے حضرت مرزا بشیر احمد اور حضرت مرزا شریف احمد صاحب بھی تو خاموش علما میں سے تھے کیونکہ یہ دونوں بزرگ بھی سٹیج کے آدمی نہیں تھے۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا ذکر تو ہم کئی جگہ کر چکے ہیں مگر حضرت مرزا شریف احمد صاحب کا ذکرِ خیر اب تک کہیں نہیں ہوا حالانکہ ان سے تو قادیان کے زمانہ سے تعلق تھا بلکہ ان سے تو ہمارا آباء واجداد کے زمانہ سے تعلق تھا۔

ہمارے دادا مولوی محمد فضل خاں سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہوئے تو قادیان میں آبسے۔ اچھی خاصی زمینداری تھی۔ زمین بٹائی پر دے دی اور درِ حبیب پر دھونی رما کر بیٹھ گئے اور حضرت مرزا شریف احمد صاحب کے دربان ہو گئے۔ ہمارے تایا محمد خاں حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ اور حضرت نواب امتہ الحفیظ صاحبہ کی کوٹھی کی دربانی کرتے تھے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا اور الحمد للہ کہ کیا کچھ نہیں دیا، وہ سب خاندانِ بانیء سلسلہ کی دربانی کا صدقہ ہے۔ ثم الحمد للہ۔ ہمارے دادا نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی۔ ہم نے جب بھی انہیں اپنی ہوش میں دیکھا اپنے گھر میں آم کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھے اور قرآن پڑھتے دیکھا۔ دادا جان کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت میاں شریف احمد صاحبؓ کی کوٹھی کی دربانی ان کے سپرد تھی۔ عمارت میں توسیع ہو رہی تھی جو دیوار بنی اس کے بارہ میں دادا جان کو خیال ہوا کہ اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے ٹھیک سے نہیں بنی۔ آپ نے حضرت بیگم صاحبہ سے ذکر کیا۔ فرمانے لگیں بابا فضل خاں ''دیوار اتنی ہی کمزور ہے تو بھلا اسے ایک دھکے میں گرا تو دو''۔ دادا جان نے ایک ہی دھکا دیا تو سیمنٹ چنی ہوئی دیوار وہ جا پڑی۔ سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ حضرت میاں صاحب نے معماروں کو بلا کر دوبارہ دیوار بنوائی معماروں نے اعتراف کیا کہ واقعی دیوار کی تعمیر میں ان لوگوں نے پورا سیمنٹ استعمال نہیں کیا تھا۔ ایک اور واقعہ بھی ہم نے حضرت میاں شریف احمد کی زبان مبارک سے سنا کہ ایک بار کوٹھی میں ایک سانپ نکل آیا۔ سانپ کی دہشت ایسی ہوتی ہے کہ ہر طرف

دہائی مچ گئی۔ دادا جان نے پوچھا کیا ہوا معلوم ہوا سانپ ہے۔ دادا جان نے کہا اسے مارئے نہیں۔ میں اسے حصار میں پابند کر دیتا ہوں کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔ چنانچہ دادا جان نے کسی دعا کے تحت اس سانپ کے گرد ایک حصار کھینچا اور سانپ کو حکم دیا کہ اس حلقہ میں سمٹ کر بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھ گیا۔ آپ نے اسے سرزنش فرمائی اور کہا خبر دار آئندہ ان بزرگوں کی اولاد کو تنگ نہ کرنا۔ یہ کہہ کر سانپ کو چلے جانے کا حکم دیا پھر اس کوٹھی میں کبھی کوئی سانپ نظر نہیں آیا۔ ہم بچے ان کے گھر میں یوں کھیلتے پھرتے تھے جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ ربوہ میں حضرت مرزا شریف احمد صاحب اصلاح وارشاد کے ناظر تھے۔ ہم انجمن کے کلرک ہونے کے باوجود حضرت میاں صاحب کے دفتر میں کام نہیں کرتے تھے مگر میاں صاحب کو خاموشی سے آتے جاتے دیکھتے رہتے تھے دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا۔ حضرت میاں صاحب نہایت کم گو آدمی تھے۔ دفتر کی طرف آتے ہوئے کئی بار انہیں دیکھا مگر خاموش اور خود اپنی ذات میں مگن۔ پیدل چلنا انہیں بہت پسند تھا۔ اس زمانہ میں آپ دارالصدر سے یعنی اپنے گھر سے چلتے اور خلیفہ صلاح الدین صاحب کے گھر محلّہ دارالیمن پیدل یا کبھی کبھی سائیکل پر جاتے تھے۔ پاؤں دھول میں اٹ جاتے مگر چہرہ پر گردِ ملال نہ ہوتی۔ خلیفہ صلاح الدین صاحب سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں دوست پہروں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ دونوں میں کیا گفتگو رہتی ہوگی معلوم نہیں کیونکہ ہم نے انہیں گفتگو کرتے نہیں سنا۔ مگر یہ بھی ہوسکتا ہے دونوں دوست خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہوں۔ اس بات کو بھی محبت کی انتہا سمجھا جاتا ہے کہ آمنے سامنے خاموش ایک دوسرے کو تکتے رہنا۔ جب بے تکلفی اور محبت اس درجہ تک پہنچ جائے تو باتیں کرنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے؟ ہم نے حضرت میاں شریف احمد صاحب کی اس خاموش محبت کا دور سے ہی نظارہ کیا ہے۔

ایک بار خلیفہ صلاح الدین احمد سے ملنے کے لئے ان کے درِ دولت پر حاضر ہونے کا موقعہ ملا۔ ہم کسی رسالہ کے لئے کوئی مضمون لکھ رہے تھے فلسفہ کی کوئی بات تھی جو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کسی نے بتایا کہ خلیفہ صلاح الدین صاحب فلسفہ کے عالم ہیں ان سے رابطہ کرو۔ چنانچہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مسئلہ حل ہو گیا مگر خلیفہ صاحب سے بے تکلفی نہ ہوسکی کہ پھر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جسارت کرتے۔ ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب واقعتاً بڑے عالم آدمی تھے مگر خاموش اور گوشہ

نشیں ۔ہمیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ خلیفہ صاحب کوئی کام بھی کرتے ہیں یا نہیں یا ان کے روزگار کا کیا بندو بست ہے مگر ہم نے انہیں بے فکر اور مطمئن ہی پایا۔اپنے علم پر مطمئن تھے اور جس شخص کے گھر حضرت میاں شریف احمد چل کر جاتے ہوں اس کے مستغنی ہونے کی بات سمجھ بھی آتی ہے۔

ربوہ کے خاموش عالموں میں جو عالم بہت ہی خاموش عالم تھے وہ ہمارے ملک مبارک احمد صاحب تھے۔ عربی رسالہ البشریٰ کے ایڈیٹر۔انتہا کے سادہ اور سادہ دل۔جامعہ احمدیہ کے استاد تھے اپنے کام سے کام رکھتے۔مجلسوں میں جانا انہیں پسند نہیں تھا ہماری ایک پھوپھی زاد بہن تھیں وہ دوالمیال کے حکیم عطا محمد صاحب سے بیاہی ہوئی تھیں اس لئے دوالمیال والوں سے تھوڑا سا رشتہ بھی تھا۔قبلہ ملک صاحب دوالمیال کے تھے۔ان کے والد ملک عبدالرحمٰن صاحب اونچے لمبے قدآور بزرگ تھے۔بڑھاپے میں قد خم کی کیفیت ان کے ہاں جھلکنے لگی تھی مگر بات میں وہی طنطنہ قائم تھا مگر ملک مبارک احمد صاحب نہایت خاموش طبع اور عافیت جو تھے ہم نے انہیں کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات کرتے یا کسی پر غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ان کے بچوں میں سے منور ہمارا شاگرد ہوا۔ان کی بچیاں ہماری آنکھوں کے سامنے پل کر بڑی ہوئیں اور اب ماشاءاللہ گھر بار والی ہیں۔ملک صاحب کو اپنی اولاد سے انتہا کا پیار تھا۔ان کی بچیوں میں سے امتہ الباسط نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ایک بار فرمانے لگے مجھے لاہور کبھی اچھا نہیں لگتا تھا اب اچھا لگنے لگا ہے۔ہم نے کہا کیوں؟ فرمایا ’اس لئے کہ میری بیٹی لاہور میں پڑھ رہی ہے۔‘ یہ تھے ملک مبارک احمد صاحب۔علم کے پھل سے لدے ہوئے درخت کی طرح جھکے ہوئے۔ہمارے دوست علامہ یعقوب امجد کہا کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ملک صاحب سے عربی نہیں پڑھی تو اسے عربی کی لذت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا ہم بھی انہیں محرومین میں سے ہیں۔اب ملک مبارک احمد صاحب کا ذکر آ گیا تو ایک بوجھ بھی اپنے سر کا اتار دیں۔ان کی بیٹی امتہ الباسط کی شادی ہوئی۔وہ اپنے میاں کے ساتھ قبلہ مولانا محمد احمد صاحب جلیل مدظلہ کی خدمت میں سلام کرنے کو ہمارے گھر آئی۔صبح کا وقت تھا۔ہم نے گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی اور اس کے ساتھ ایک نوجوان آدمی کھڑے ہیں۔کہنے لگے ہم حضرت مولوی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔اتفاق یوں تھا کہ مولوی صاحب رات کو بیمار ہو گئے تھے اور شدت علالت کی وجہ سے ہسپتال میں داخل کروائے گئے تھے۔ہم نے اس جوڑے

سے کہا کہ قبلہ مولوی صاحب تو بیمار ہیں اور ہسپتال میں ہیں۔ وہ واپس ہونے لگے تو ہم نے ''تاکید'' کی کہ اب کہیں ان کو ہسپتال میں جا کر تنگ نہ کیجئے گا کیونکہ ڈاکٹر نے انہیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اس پردہ لڑکی کہنے لگی ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں امتہ الباسط ہوں ملک مبارک احمد صاحب کی بیٹی''۔ اب باسط ہمارے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوئی تھی اور کچھ روز پہلے ہم نے اسے اپنے ہاتھوں رخصت کیا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر ہم بہت شرمندہ ہوئے۔ ہم نے بہتیرا کہا بیٹی اندر آؤ مولوی صاحب کی بیگم سے ملو ہمارے گھر والوں سے پیار لو۔ مگر اس کے میاں اتنے ناراض ہو گئے تھے کہ انہوں نے اندر آنا پسند نہیں کیا باسط بیٹی! ہمیں اس بات کا بہت افسوس ہے۔ ہم کب سے یہ بوجھ اٹھائے پھرتے تھے کہ تم سے ملنا ہو تو اس ''گستاخانہ تاکید'' کی معافی مانگیں۔ ملنا تو نہ ہوا۔ اب اس کے ابا کا ذکر آ گیا تو اپنے سر کا بوجھ اتار رہے ہیں۔ امید ہے امتہ الباسط اور اس کا میاں ہماری کوتاہی سے صرف نظر کریں گے اور معاف کر دیں گے۔ اب تو وہ ماشاء اللہ آل اولاد والی ہوگی۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ بعض اوقات ایک ذرا سی بات کتنے پچھتاوے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ (پچھلے سال ہم ٹورنٹو میں احمدیہ ابوڈ آف پیس کی عمارت کے سامنے کسی کے انتظار میں موٹر میں بیٹھے تھے کہ امتہ الباسط دور سے ہمیں پہچان کر آئی اور سلام کیا۔ ماشاء اللہ بڑی پیاری لگ رہی تھی مگر اس سے بات کرنے کا موقع تھا نہ وقت۔ الحمد للہ کہ اب وہ بھی یہیں کینیڈا میں آباد ہے۔ ہماری بیگم نے بتایا کہ اس کا بیٹا بھی اب ماشاء اللہ بڑا سا ہے۔)

خاموش عالموں میں سے حضرت مولوی محمد حسین صاحب سبز پگڑی والے بھی تھے۔ عام جلسوں میں تقریر کرنا تو آپ نے اس وقت شروع کیا جب کُبَرَنا مَوتُ الکُبَراء کے مصداق حضرت بانیٔ سلسلہ کے رفیقوں میں سے آپ آخری رفیق کے طور پر رہ گئے ورنہ اس سے پہلے جلسوں سے گریز پا ہی رہتے تھے۔ دیہاتی مبلغ تھے۔ اباجی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ گیانی واحد حسین صاحب جنہیں میں جماعت احمدیہ کے صوفیاء میں ایک نہایت بلند مرتبہ صوفی جانتا ہوں؛ بھی ایسے ہی عالم تھے۔ گورمکھی کے عالم تھے مگر ان کا تخصص گورمکھی نہیں سکھوں والی پنجابی زبان تھی۔ بولتے تو یونہی لگتا تھا سکھوں کا کوئی گیانی بول رہا ہے۔ حضرت مولوی محمد حسین صاحب بھی نہایت سادہ طبیعت عالم تھے۔ ہم نے کئی مرتبہ انہیں دیہاتیوں میں بیٹھے گفتگو کرتے سنا۔ خاموشی سے معترض کا اعتراض سنتے اور پھر آہستہ سے کوئی ایسا نکتہ بیان فرما

دیتے کہ معترض لاجواب ہو جاتا۔ گورمکھی کا ذکر آیا تو اپنے گیانی عباد اللہ صاحب یاد آئے۔ گیانی صاحب کا تخصص گورمکھی اور سکھ مت تھا۔ اس بارہ میں سکھ بھی انہیں گورو مانتے تھے۔ ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد یا پہلے ریڈیو پاکستان والوں کو مشرقی پنجاب کے سکھوں کے لئے ایک خاص پروگرام پنجابی دربار شروع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان لوگوں نے حضرت خلیفۃ المسیح سے کہہ کر اجازت مانگی کہ ہمیں گیانی عباد اللہ صاحب کی خدمات کی ضرورت ہے کیونکہ ان کے سوا کوئی ایسا نہیں جو سکھوں کا جواب سکھوں کی زبان اور ان کے لٹریچر سے دے سکے۔ گیانی عباد اللہ صاحب نے گورمکھی میں اور سکھوں کے بارہ میں نہایت مفید لٹریچر تخلیق کیا ہے جو نہ صرف سلسلہ کے لئے بلکہ قومی لحاظ سے پاکستان کے لئے اب تک مفید اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

گورمکھی کے ذکر سے بات اپنے بزرگ چوہدری عبد الواحد صاحب تک پہنچی۔ آپ ہندی کے ودوان تھے۔ ان کے صاحبزادے ماجد شاہد ہمارے ساتھ سائیکل پر چنیوٹ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ چوہدری صاحب نے بہت کوشش کی کہ ماجد اور اس کے ساتھ ہم ان سے اور کچھ نہیں تو ہندی لکھنا پڑھنا ہی سیکھ لیں مگر باوجود کوشش کے طبیعت ادھر نہیں آئی۔ اب اس عمر میں سویڈن والوں نے ہم سے فرمائش کی کہ آپ ہندی سیکھ لیں تو ہمیں آپ کو شعبہ ہندو پاکستان میں جگہ دینا آسان ہو جائیگا مگر ہماری طبیعت پھر بھی اس طرف مائل نہ ہوئی ورنہ ہمارے دوست اوم پرکاش عارف ہوشیار پوری نے تو ہمارے لئے ہندی کا ایک قاعدہ باقاعدہ تصنیف کر کے سٹاک ہالم سے بھجوا دیا۔ چوہدری عبد الواحد بھی بڑے ہی خاموش طبع بزرگ تھے۔ ہندی کے رسالے منگواتے اور پڑھتے رہتے تھے اور سلسلہ کے مفید مطلب حوالے نکالتے رہتے تھے۔ اصلاح وارشاد کے دفتر میں نائب ناظر تھے وضع داری سے شلوار قمیص کے اوپر ہاف کوٹ پہنتے اور ٹوپی اوڑھتے تھے ہم نے بہت کم انہیں کوٹ کے بغیر دیکھا۔ خالہ زینب ان کی بیگم ہم سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں ان کا گھر ہمارے لئے اپنا ہی گھر تھا ہم نے گھر میں بھی چوہدری صاحب کو خاموش اور مطالعہ میں مصروف پایا۔ عجیب کتابی قسم کے بزرگ تھے مگر خشکی انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ ان کے چہرہ پر ہر وقت ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ کچے کوارٹروں میں رہتے تھے تو ہم سائیکل پر ان کے گھر پہنچتے۔ ماجد باہر آتا اور ہم چنیوٹ کے لئے روانہ ہو جاتے۔ چوہدری صاحب کچھ دور تک ہمیں دیکھتے

رہتے پھر اندر چلے جاتے۔ ان کی دعائیں ہمارے ساتھ رہتیں۔

مکرم ملک سیف الرحمٰن مفتیٔ سلسلہ کے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ ہم نے قادیان میں حضرت سید سرور شاہ صاحب کو دیکھا ہؤا تھا وہ کبھی جبہ و دستار کے بغیر نظر نہیں آئے تھے۔ ان کے قریبی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے مرتبہ کا بہت لحاظ رکھتے تھے مبادا کوئی مسئلہ پوچھنے والا ان کے لباس کو دیکھ کر ان کے مرتبہ کا اندازہ نہ کر سکے اور ٹھوکر کھا جائے۔ مگر ہم نے مکرم ملک سیف الرحمٰن صاحب کو اور پھر اپنے قبلہ و کعبہ مولٰینا محمد احمدؐ جلیل کو اس بارہ میں بے پروا پایا۔ مولٰینا جلیل صاحب تو اکثر باہر جاتے ہوئے شیروانی زیب تن فرماتے ہیں مکرم ملک صاحب کو ہم نے کئی بار بلکہ اکثر بغیر شیروانی کے جامعہ آتے جاتے دیکھا۔ ٹوپی ضرور اوڑھتے تھے انہیں ننگے سر دیکھنا یاد نہیں۔ سلسلہ کے علماء میں سے ایک ایسے بزرگ کا بھی ذکر پڑھ رکھا ہے کہ وہ ٹوپی نہیں اوڑھتے تھے حالانکہ حضرت امام جماعت الثانی کے استادوں میں سے تھے۔ ان کا مسلک تھا کہ ٹوپی اوڑھنا کوئی دینی مسئلہ نہیں تہذیبی مسئلہ ہے اور نماز ننگے سر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ ہمیں اسی لئے وہ بزرگ بہت اچھے لگتے ہیں ۔ جملہء معترضہ۔ ابھی پچھلے دنوں عزیزم راجہ منیر احمد صاحب صدر خدام الاحمدیہ کی ایک دو تصویریں نگاہ سے گذریں جن میں آپ نے ایک نہایت ٹیکنی کلر ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ ہم نے انہیں پیغام بھجوایا کہ اگر صدر ایسی ٹیکنی کلر ٹوپی اوڑھے گا تو مہتممین کون سی ٹوپی اوڑھا کریں گے؟ ان کا جواب آیا کہ وہ ٹوپی آپ نے کسی کی تالیفِ قلب کے لئے اوڑھی تھی اس لئے مہتممین کے بارہ میں فکر مند نہ ہوں ہم اس وقت سے یہی سوچ رہے ہیں کہ اس فقرہ کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ مہتممین کسی کی تالیف قلب ہرگز نہیں کریں گے؟ یا تالیف قلب کے لئے ٹوپی اوڑھنا ہی پڑی تو ایسی ٹیکنی کلر ٹوپی نہیں اوڑھیں گے؟ ہم ملک سیف الرحمٰن صاحب کے ذکر سے چلے تو کہاں پہنچ گئے۔ مکرم ملک صاحب سے ہماری دوستی کا تعلق بھی ایسا ہی تھا۔ جہاں ملتے بہت شفقت فرماتے۔ دوستی یوں شروع ہوئی کہ ان کی بیگم امتہ الرشید شوکت لجنہ کے رسالہ مصباح کی ایڈیٹر تھیں اور ہم اس زمانہ میں مصباح میں خوب چھپا کرتے تھے کیونکہ یہ رسالہ ہماری نظمیں مضامین چھاپ دیتا تھا ایک بار رسالہ چھپنے سے پہلے مکرم ملک صاحب سے سرِ راہ ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے اب کی بار مصباح میں آپ کی نظم آ رہی ہے۔ بڑی اچھی نظم ہے۔ ہم نے شوخ چشمی کی اور کہا ''اچھا تو آپ ہیں امتہ الرشید شوکت؟''۔ ملک صاحب بہت ہنسے۔ ہماری

دوستی پکی ہوگئی۔ آپ جامعہ کے پرنسپل تھے۔ سلسلہ کے مفتی تھے مگر ذرا جوان کا مرتبہ ہماری اور ان کی دوستی میں حائل ہؤا ہو۔ پھر ان کے بچے ہمارے شاگرد ہوگئے تو ایک نیا رشتہ بن گیا۔ ملک صاحب بھی خاموش عالم تھے۔ تقریریں ''ضرورتِ شعری'' کی وجہ سے کرتے ہوں گے کہ جامعہ کے پرنسپل تھے مگر عام جلسوں میں انہیں تقریریں کرتے نہیں دیکھا۔ کالج کے ادبی اجلاسوں میں اور خاص طور سے مشاعروں میں ضرور تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک بار تساہل ہؤا۔ دعوت نامہ انہیں نہ پہنچا یا رستہ میں کہیں ضائع ہوگیا۔ اس کے باوجود تشریف لائے فرمانے لگے میں نے سوچا یہ تو ہو نہیں سکتا آپ نے دعوت نامہ نہ بھجوایا ہو یقیناً رستہ میں کہیں ضائع ہوگیا ہوگا اس لئے میں آ گیا ہوں۔ مگر دعوتوں کے بارہ میں بہت محتاط تھے۔ کالج کی ہر دعوت میں پرنسپل جامعہ ہونے کی وجہ سے مدعو ہوتے تھے اگر دعوت نامہ نہ پہنچ سکتا تو کبھی نہ آتے۔

ربوہ کے ناظر صاحبان وکلا صاحبان اور چنیدہ علما سلسلہ کو ہم 'ربوہ کی ولیمہ الیون' کے نام سے پکارا کرتے تھے کہ ہر ولیمہ میں یہی لوگ ربوہ کے ممتاز شہری ہونے کی وجہ سے مدعو ہوتے تھے اور ہیں۔ ملک صاحب اس الیون میں شامل ہونے کے باوجود دعوتوں کے رسیا نہیں تھے۔ شوگر کا مریض ہوجانے کے بعد تو محتاط بھی ہوگئے تھے مگر ہمیں یہ فلسفہ بھی ملک صاحب ہی نے سمجھایا کہ انسانی جسم کو ایک مناسب مقدار میں میٹھے کی ضرورت بہرحال رہتی ہے اس سے جسم کو محروم نہیں رکھنا چاہئے۔

اس طرح جسم کے صحت مند خلیے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا شوگر سپیشلسٹ یورپ کا مانا ہؤا شوگر سپیشلسٹ ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس کے زیر علاج رکھنے کا انتظام فرمایا ہؤا ہے۔ اس نے دیگر ہدایتوں کے علاوہ یہ ہدایت بھی دی ہوئی ہے کہ جسم کو مکمل طور پر شکر سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ شوگر زیادہ ہوجائے تو اس کا تدارک کیا جاسکتا ہے مگر جسم میں شکر کی کمی ہو جائے تو اس سے جسم کو ایسا نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے جس کا ازالہ نہ کیا جاسکے۔ یہاں تو ایسی بہت سی میٹھی غذائیں میسر ہیں جو شوگر کے مریضوں کے لئے ہی بنی ہیں اور بے دریغ شوگر کے مریضوں کو کھلائی جاتی ہیں ہمارے ہاں ابھی ایسی خوراک میسر نہیں اس لئے شوگر کے مریض بچارے ان سے محروم رہتے ہیں پچھلے برس ہم کینیڈا گئے تو عزیزی ہشام ملک نے ایڈمنٹن بلایا۔ ہم نے اسے مٹھائی کے کاروبار میں ملوث کیا لتھڑے ہوئے دیکھا تو یہی سوچا کہ ملک

صاحب خود تو میٹھے سے اس طرح فیضیاب نہ ہو سکے ۔ ہشام کو اس راہ پر لگا گئے ۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

ربوہ میں تاج الدین نام کے دو عالم تھے ۔ ایک قبلہ مولوی تاج الدین صاحب ناظم قضا اور دوسرے تاج الدین 'مولوی فاضل گر' کہلاتے تھے ۔ مولوی فاضل گر اس لئے کہ ان کے شاگرد مولوی فاضل کا امتحان دیتے تو پاس ہو جاتے خود امتحان میں بیٹھتے تو کامیاب نہ ہوتے تھے ۔ اس لئے فرمایا کرتے تھے میں مولوی فاضل نہیں مولوی فاضل گر ہوں ۔ نہایت حلیم الطبع اور منکسر المزاج بزرگ تھے ۔ سادہ سے لباس میں ملبوس رہتے ۔ کئی بار انہیں دیکھا کہ دودھ دہی کی دکان پر قطار میں کھڑے ہیں ۔ ایک دو بار احتراماً انہیں پہلے باری دینا چاہی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔ ان کے شاگردوں سے ان کے بارہ یہی سنا کہ بہت عالم آدمی ہیں ۔

جماعت احمدیہ کے عالموں اور دوسروں میں فرق دیکھنا ہو تو کسی پرانے استاد کا یہ شعر پیش نظر رکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے دوسرے علماء کو فخر ہے کہ '' ہم نہ نکہت ہیں نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں ۔ آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں ۔'' مگر ہمارے علماء جدھر جاتے پھول کی طرح مہکتے جاتے تھے ۔ ان کے علم کی خوشبو چاروں طرف پھیلتی رہتی تھی اسی خوشبو نے لاکھوں آدمیوں کو اپنی طرف کھینچا تھا اور کھینچتی ہے ۔

ذکر خاموش علماء کرام کا تھا ایک بزرگ تھے جنہیں جامعہ میں بائبل پڑھانے پر مامور دیکھا۔ ان کا اسم گرامی عبد الخالق تھا۔ عیسائیت سے تائب ہو کر احمدی ہوئے تھے ۔ بائبل کے ایسے عالم کہ گویا ساری بائبل ان کی انگلیوں کی پوروں پر تھی ۔ لوگ باگ بائبل کا حوالہ تلاش کرنے کے لئے لائبریری جانے کی بجائے انہیں جا ملتے تھے ۔ انہیں دودھ جلیبی کا بہت شوق تھا میٹھے کے عاشق تھے ۔ چنیا بیگم سے پرانی شناسائی تھی ایک بار انہیں سانپ نے ڈس لیا۔ ہفتہ دس دن بعد ٹھیک ٹھاک ہو کر جامعہ آئے تو دوستوں سے بڑی مایوسی کے عالم میں فرمایا کوئی کمبخت بڑا ہی بودا سانپ تھا۔ میری دو روپے کی دودھ جلیبی ضائع کروا دی خاک جو نشہ چڑھا ہو۔ اس نشہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو فلک سیر کے عادی ہوں انہیں سانپ کا زہر کچھ نہیں کہتا الٹا ان کے لئے لطف کا باعث بنتا ہے ۔ قبلہ و کعبہ مولینا جلیل صاحب مدظلہٗ سے تو ان کی دوستی تھی ۔ ہمارے ابا سے بھی ان کا پرانا تعلق تھا۔ جب کبھی ہمارے ہاں تشریف لاتے ابا ہمیں

بھگاتے کہ جاؤ بازار سے جلیبی لے کر آؤ۔ پھر اندر کہلواتے کہ دودھ میں جلیبی ملا کر باہر بھیج دیں۔ خوب آدمی تھے۔ خاموش اور اپنے آپ میں مگن۔ مگر بائبل کا ذکر آتا تو جیسے شیر ہو جاتے قرآن کے حافظ تو ہم نے بہت دیکھے شیخ صاحب بائبل کے حافظ تھے۔ اب ہم نے جس زمانہ میں انہیں دیکھا وہ ہمارے بچپن یا حد لڑکپن کا زمانہ تھا ہم ان کے مرتبہ اور مقام سے آشنا نہیں تھے مگر اپنے بزرگوں کو ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے دیکھا۔

اور اب بات ایک ایسے عالم پر آ گئی جس کے بارہ میں لکھنا آسان لگتا تھا مگر لکھنے لگا ہوں تو مشکل میں ہوں کیا لکھوں؟ وہ شخص محض عالم ہی نہیں تھا ہمسایہ بھی تھا ایسا ہمسایہ جس پر سارے ہی فخر کرتے تھے اور ہیں۔ حسب دستور ہماری اور ان کی عمروں میں بہت تفاوت تھا مگر ہم پر مہربانی فرماتے تھے۔ یہ ان کی ذرہ نوازی تھی ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا۔ مولوی محمد دین صاحب۔ صدر صدر انجمن احمدیہ۔ جوانی میں امریکہ میں مبلغ بھی رہے۔ ہمارے سکول کی زندگی سے پہلے ہیڈ ماسٹری بھی کی ہم نے جب سے انہیں دیکھا بزرگ اور عمر رسیدہ ہی دیکھا۔ انگریزی زبان سے بہت شغف رکھتے تھے انجمن کے دفتر میں صدر کی کرسی پر تھے ہم نے انہیں کبھی کتاب کے بغیر نہیں دیکھا ہاں آخری بیماری سے قبل بہت کمزور ہو گئے تھے مگر دفتر آنا جانا جاری تھا ڈاکٹروں نے عرق ریزی سے کام کرنا منع کر دیا ہوگا اس لئے خاموش اور اکیلے بیٹھے ذکرِ الٰہی کرتے رہتے تھے کیونکہ ان کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے۔

حضرت مولوی صاحب کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا ہم نے اپنی ہوش میں انہیں اچکن پہنے نہیں دیکھا سادہ سا کرتا اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتے تھے۔ پاؤں میں بھی سادہ دیسی جوتا ہوتا تھا۔ ہمارے ابا بھی اللہ بخشے لباس کے معاملہ میں بالکل دیہاتیوں جیسے طور رکھتے تھے شلوار تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ناظر بناتے وقت حکماً پہنائی۔ شلوار میں بہت بے آرامی محسوس کرتے تھے اس لئے تہبند باندھتے تھے۔ گھر میں تہبند اور اس کے اوپر بنیان مہمان بھی آتے تو اسی لباس میں ان سے ملتے تھے بے تکلفی ان کے مزاج کا حصہ تھی تقریبات سے اسی لئے گھبراتے تھے کہ ان میں لباس کا تکلف کرنا پڑتا ہے۔ سرکاری افسروں سے بھی اسی شان سے جا ملتے تھے اور افسران ان کی وجاہت اور دبدبہ کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ بات حضرت مولوی محمد دین صاحب سے چلی تو ان کے پڑوسی کو لپیٹ میں لے لیا۔ ان کا مکان

ہمارے گھر کے سامنے ہی تو تھا اکیلے ہی رہتے تھے دفتر اور گھر بس ان کی ساری تگ و تاز یہیں تک تھی ۔ بی اے کے امتحان کے دنوں میں ایک دو بار ان سے انگریزی کا کوئی محاورہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی مگر اس کے لئے اگلے دن صبح تک انتظار کرنا پڑا کہ دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلیں گے تو ان سے پوچھیں گے ۔طبیعت میں اس بات کا بہت حجاب رہتا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے پر انہیں خود دروازہ کھولنے کے لئے آنا پڑے گا۔ایک تانگہ انہیں لینے کے لئے آتا تھا اس میں دفتر جاتے تھے۔اباجی ربوہ میں ہوتے تو انہیں اپنی جیپ میں لے جاتے۔صدر صدر انجمن احمدیہ نے کبھی اس بات کی خواہش نہیں کی کہ انہیں لینے کو موٹر بھیجی جائے ۔ تانگہ کی سواری پر خوش اور قانع تھے عجیب صوفیانہ زندگی کرتے تھے جیسے زندگی کی آسائشوں سے انہیں کوئی علاقہ ہی نہ ہو۔

ہماری ہی گلی میں حضرت مولوی عطا محمدؓ صاحب تھے اپنے نسیم سیفی صاحب کے والد گرامی۔ایک اور نابغہ۔ جامعہ میں غیر ملکی طلبا کو اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ان کا طریق تدریس ایسا سادہ تھا کہ غیر ملکی لڑکے دنوں میں ہی فر فر اردو بولنے لگتے تھے۔مولوی صاحب بھی دیہاتی بود و باش رکھتے تھے گھر پر تو تہبند باندھتے مگر جامعہ جاتے وقت شلوار کرتا پہن لیتے پاؤں میں وہی دیسی جوتی۔سر پر پگڑی نہیں صافہ باندھتے تھے گھر سے نکلتے تو ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھے جامعہ کا رخ کرتے ذکرِ الٰہی باقاعدگی سے کرتے ایک دو بار انہیں بہ آوازِ بلند بھی ذکرِ الٰہی کرتے سنا۔واپس آتے تو گھر میں وہی دیہاتیوں والا لباس پہن لیتے۔نمازوں کے لئے باقاعدگی سے مسجد میں جاتے کڑکتی دوپہر میں جب چیل انڈا چھوڑتی ہے انہیں مسجد کی طرف رواں دواں دیکھا۔

پیچھے ہندی کا ذکر ہوا تو مہاشہ فضل حسین صاحب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔مہاشہ فضل حسین صاحب کو جس زمانے میں ہم نے دیکھا اس زمانہ میں ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا دائیں ہاتھ پر فالج کا اثر تھا چلنے میں بھی دقت ہوتی تھی مگر اپنے کام میں مگن رہتے تھے۔سلسلہ کی بہت سی مفید کتابیں انہی کی چھاپی ہوئی ہیں ۔ بہت احتیاط سے مواد اکٹھا کرتے اور چھاپتے تھے۔ربوہ کی وسط والی پہاڑی کے عین دامن میں بسوں کے پرانے اڈہ کے قریب ان کا مکان تھا گرمیوں میں ربوہ کا یہ حصہ آگ کا ٹکڑا بن جاتا ہے مگر مہاشہ صاحب کو ہم نے اس گرم مکان میں بھی ٹھنڈے دل سے کام کرتے دیکھا ہے۔ایک بار ایسا ہوا کہ

چلنے میں دقت کے باوجود مہاشہ صاحب حضرت مرزا بشیر احمدؓ صاحب سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت میاں صاحب ان کا بہت خیال رکھتے تھے اس روز خاص طور سے ان کے آنے پر ممنونیت کا اظہار کیا۔ مہاشہ محمد عمر صاحب ایک اور ہندی کے ودوان تھے ان کا بیٹا ہمارا کلاس فیلو تھا مگر مہاشہ صاحب ربوہ سے باہر کہیں اپنی تبلیغی مہم پر تھے اس لئے ان سے زیادہ استفادے کا موقع نہ ملا۔
ہندی کے ودوان تو ہماری لپیٹ میں آ گئے فارسی والے بچ گئے۔ مگر تا کجے؟ میاں عبدالحق رامہ ناظر بیت المال تھے مگر ہمارے انجمن سے چلے جانے کے بعد ناظر بن کر آئے۔ ہمارا خیال تھا اکاؤنٹس کے آدمی ہیں ادب سے کہاں تعلق ہوگا مگر یہ نہ سوچا کہ اردو کی تاریخ حساب دان ادیبوں شاعروں سے بھری پڑی ہے۔ مرزا محمدؐ ہادی رسوا ریاضی دان اور مہندس تھے' (بلوچستان کی ٹیڑھی میڑھی مشکل ریلوے لائن کا نقشہ رسوا صاحب ہی کا بنایا ہوا ہے) جناب پروفیسر دل محمدؐ تو ہماری ہوش کے زمانہ تک مشہور تھے جن کے دل الجبرا کا نام سن کر ہی ہم دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ رامہ صاحب فارسی کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے حضرت صاحب کی درِثمین فارسی کے تو حافظ تھے۔ آپ نے اس پر تحشیہ کیا تھا جواب آ کر ان کی آل اولاد نے چھاپا ہے اور اس کام کی تکمیل میں کچھ ہماری بھی تلقین وتحریص شامل تھی۔ ان کے سارے بیٹے ہی ہمارے شاگرد ہوئے۔ نعیم۔ سفیر۔ منا اور سب سے چھوٹا (غالباً عزیز الحق نام ہے) جو آج کل شاید شاہ تاج میں ہے۔ رفیعہ ہماری بیگم کی شاگرد ہوئی۔ ہم جاپان جانے لگے تو اس نے ایک گرم سویٹر ہمارے لئے بن کر ہمیں دیا جو مدتوں ہمیں اس کی یاد دلاتا رہا۔ اب تو اس کے ابا کی کتاب ان سب بچوں کو یاد دلانے کے لئے ہمارے شیلف پر رکھی ہے۔
رامہ صاحب کے ہاں پہلی بار حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک لمبی چوڑی میز کے پاس بیٹھے ہیں اور ساری میز پر کاغذ بکھرے ہوئے ہیں۔ اردگرد فارسی کے دواوین ہیں حافظ رومی انوری خاقانی بے دل غالب اور خدا معلوم کون کون۔ رامہ صاحب نے وہ درِثمین بھی دکھائی جس پر آپ نے تحشیہ کا کام کیا تھا۔ یہ کام جماعت کے فارسی ادب میں انمول اضافہ ہے۔
بات اردو کی بجائے فارسی کی طرف مڑ گئی تو بھائی مبشر احمد راجیکی یاد آئے۔ آپ حضرت مولانا راجیکی صاحب کے فرزند ارجمند تھے اردو فارسی میں یکساں روانی سے شعر کہتے تھے۔ ان کے فارسی اشعار میں

ان کے والد ماجد کے تصوف کا رنگ جھلکتا تھا۔

فارسی ہمارے سلسلہ کی ادبی روایت کا اہم جزو ہے' حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کا معتد بہ حصہ فارسی میں ہے اور اپنی شستگی رنگی میں اساتذہ کے کلام سے لگا کھاتا ہے۔ اس لئے ہم احمدی ہونے کے ناطے سے بھی فارسی سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ ہمارے فارسی شعرا میں سے حضرت حکیم عبید اللہ صاحب بسمل کا ذکر ہندوستان کے فارسی گوشعرا کے تذکروں میں بڑے احترام سے کیا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا انتقال ہوا ان کی فارسی نظمیں سلسلہ کے ادبی سرمائے کا بیش بہا حصہ ہیں۔ فارسی کی طرف کماحقہ توجہ دینا ضروری ہے ورنہ ہمارے علم کلام کا کثیر حصہ لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہ جائے گا۔ ہمیں تو یونہی لگتا ہے ہمارے ہاں فارسی جاننے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔

ایک بار ہمارے گھر کے سالانہ مشاعرہ میں ہمارا ایک شاگرد طاہر مرحوم ایک بزرگ کو اپنے ساتھ لوا لایا۔ کہنے لگا میرے نانا ہیں پنڈی میں رہتے ہیں اور فارسی میں شعر کہتے ہیں۔ تعارف ہوا تو ماسٹر عبدالرحمن خاکی نکلے۔ ان کا کلام سلسلہ کے پرانے جرائد میں نظر سے گذر چکا تھا ان بزرگ سے وہ پہلی اور آخری ملاقات تھی اس مشاعرہ میں تنویر صاحب مرحوم بھی موجود تھے ان کی خوشی قابلِ دید تھی۔

بات ربوہ سے نکل کر پنڈی پہنچ گئی تو لاہور کے دو تین خاموش عالموں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اپنے شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی' شیخ عبدالقادر صاحب بائیبل سکالر اور بھائی محمد احمد پانی پتی۔ شیخ اسماعیل پانی پتی حالی کے ہموطن تھے ان کے شاگرد تھے مگر شعر نہیں کہتے تھے۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں ان کا اور ان کے بیٹے شیخ محمد احمد پانی پتی کا نام بڑے وقیع نام تھے۔ نقوش والوں نے جو اتنے بڑے بڑے ضخیم نمبر چھاپ رکھے ہیں ان کی ترتیب و تدوین میں شیخ صاحب کی عملی معاونت بھی شامل ہے۔ شیخ صاحب سے ہمارا تعارف ان کے صاحبزادے مبارک محمود پانی پتی کی وساطت سے ہوا۔ کئی بار لاہور جانا ہوتا تو ان کے ہاں نمبر ۴ رام گلی میں قیام کا موقعہ ملتا قبلہ شیخ صاحب سے گھر پر تو کبھی ملاقات نہ ہوئی کیونکہ وہ صبح صبح اپنی ادبی فتوحات پر نکل جاتے تھے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا رکھتے جس میں کتابیں مسودے اور پتہ نہیں کیا کیا بھرا رہتا۔ سر پر پھندنے والی سرخ ٹوپی پہنتے۔ پاؤں میں گرد آلود جوتا' بر میں شیروانی۔ شیخ صاحب بہت تیز تیز بولتے تھے ان کی باتوں کو سمجھنے کے لئے خاص مشق بہم پہنچانا پڑتی تھی ورنہ یونہی لگتا تھا الفاظ

ان کے منہ سے ایک ہزار لفظ فی سیکنڈ کی رفتار سے نکل رہے ہیں۔ ہمیں سالک صاحب مرحوم کی بات یاد آتی ہے جو انہوں نے حسرت موہانی کے بارہ میں کہی تھی کہ ''ان سے پہلی بار ملنا ہوا تو میں بھونچکا رہ گیا یا اللہ ایسے ہوتے ہیں حسرت موہانی''؟ بس شیخ صاحب کو دیکھ کر بھی یہی احساس ہوتا تھا مگر صاحب کیا بلا کے عالم تھے۔ ان کا چھوٹا سا کتاب خانہ تھا نام شاید اس کا حالی بک ڈپو تھا یا کچھ اور۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں۔ مبارک محمود پانی پتی نے ابا کی وفات کے بعد اس کو چلانے کی کوشش کی تھی مگر کہاں؟ وہ شیخ صاحب والی علمیت کہاں سے آتی؟ ویسے مبارک محمود پانی پتی لاہور کی جماعت کا بڑا فعال کارکن تھا اللہ مغفرت کرے۔ شیخ صاحب کے بڑے صاحبزادے محمد احمد پانی پتی عربی سے ترجمہ کرنے میں فرد تھے۔ دیکھتے دیکھتے اس نحیف ونزار شخص نے عربی ادب کی شاہکار کتابیں اردو میں منتقل کر دیں اور ساری دنیا دیکھتی رہ گئی۔ پے در پے ان کے ترجمے شائع ہوئے تو دھوم مچ گئی۔ ہم نے پہلی بار انہیں دیکھا تو حیران رہ گئے۔ جسم نحیف ونزار مگر ذہن توانا۔ خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود کا مضمون ہؤا۔ اس نابغے کو جانے کس کی نظر کھا گئی؟ ان کا جوانی ہی میں انتقال ہوا تو ہم نے بوڑھے باپ کو صبر جمیل کا نمونہ دکھاتے ہوئے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ باپ بیٹا دونوں کے درجات بلند فرمائے۔ اب تو ہمارا دوست مبارک محمود بھی انہی رفتگاں میں شامل ہو گیا ہے۔ شیخ محمد احمد پانی پتی کی اولاد میں ایک بیٹا تھا طاہر محمود۔ بی ایس سی کر کے ربوہ میں کسی کام پر مستعد ہے خدا کرے باپ کے علمی ورثہ کا امین ہو!

اور اب بائیبل سکالر شیخ عبدالقادر صاحب محقق کا ذکر خیر۔ ہم اپنے شاگرد ڈاکٹر منیر احمد نذیر کے ہاں بیٹھے تھے کہ اندر سے شیخ صاحب تشریف لائے۔ منیر نے بتایا میرے ماموں ہیں۔ ہم شیخ صاحب کے علمی مرتبے سے تو واقف تھے لیکن اس رشتہ کا علم نہیں تھا۔ شیخ صاحب نے اس کے بعد ہمارے ساتھ زیادہ محبت اور شفقت کا سلوک روا رکھنا شروع کر دیا۔ لاہور میں طالب علمی کے دوران مسجد میں ان سے علیک سلیک ہوتی رہتی تھی وہ مانے ہوئے محقق تھے اور ہم محض طالب علم مگر جب کہیں ہمارا کوئی مضمون کسی اخبار یا رسالہ میں دیکھتے جمعہ پر ہمیں ڈھونڈ کر ملتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ لکھنے والے تھے اس لئے لکھنے والوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ شیخ صاحب نے اپنے ذاتی شوق وشغف سے بائیبل کا علم حاصل کیا اور اس باب میں ان کی تحقیق اداروں کے کام پر بھاری ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے اکاؤنٹس کے آدمی تھے مگر علمی لحاظ

سے بائیبل سکالر تھے۔ ''صحائف قمران'' پر آپ کی تحقیق شائع ہوئی تو عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ برپا ہوگیا۔ اگر شیخ صاحب کا کام انگریزی میں ہوتا تو بہت سی یونیورسٹیاں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دیتیں۔ ہمارے ہاں ایسا کون کرتا ہے۔ شیخ صاحب کی موت سے ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو بظاہر پر ہوتا نظر نہیں آتا مگر خدائی سلسلوں کے کام کبھی رکتے ہیں؟۔

اپنے اساتذہ کے بارے میں

اپنے استادوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر قلم رک رک جاتا ہے۔ کہیں ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے جو استاد یاد آتے ہیں وہ ماسٹر حسن محمد صاحب تھے۔ قادیان کے قریب ایک گاؤں کلّو سوہل تھا وہاں سے اپنی پھٹیچر سی سائیکل پر تشریف لاتے تھے۔ پرائمری سکول میں تیسری اور چوتھی جماعت کو پڑھاتے تھے۔ نہایت شفیق اور مہربان مگر سبق کے معاملہ میں سخت گیر۔ ان کا ایک ہاتھ کسی بیماری کے نتیجہ میں یا ویسے ہی مڑا ہوا تھا۔ اس لئے ایک ہی ہاتھ سے لکھنے اور سزا دینے کا کام لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے سردیوں میں اگر کسی روز سبق یاد نہ ہوتا تو آپ پاؤں پر بائیں ہاتھ سے ضرب لگاتے تھے۔ بعد کے زمانہ میں چنیوٹ کے اساتذہ کے ہاتھوں کنیر کی چھڑیوں سے ہاتھ سنسناتے ہوئے بھی محسوس کئے، مگر وہ بائیں ہاتھ کی پاؤں پر لگی ہوئی ضرب پھر بھی نہ بھولی۔

ماسٹر حسن محمد صاحب ربوہ میں ہی ہمارے محلہ میں قیام فرما رہے۔ جہاں کہیں مل جاتے نہایت شفقت سے پیار کرتے اور کندھے تھپتھپاتے تھے۔ اللہ کے فضل سے لمبی عمر پائی اور ربوہ میں ہی پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کے صاحبزادے حمید احمد چوہدری تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی کے استاد رہے پھر نائجیریا چلے گئے اور آج کل شاید جرمنی میں مقیم ہیں۔ قادیان کے زمانہ کے ایک اور استاد یاد آتے ہیں ماسٹر چراغ صاحب کھارے کے تھے۔ اونچے لمبے اور وجیہ مگر ان سے پڑھنا یا مار کھانا یاد نہیں۔ ایک اور استاد ماسٹر سولنگی صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ غالباً محمدؐ بخش نام تھا۔ قادیان کے سکول میں بہت سے اساتذہ کو دیکھا مگر پرائمری کے بچے کی یادداشت کیا؟ مگر سکول کا ماحول یاد ہے۔ اساتذہ کی شفقت، ماٹے کے چنے، ولایت حسین کے گلاب جامن یا ماسٹر زراعتی صاحب یاد ہیں۔ ماسٹر اللہ بخش صاحب زراعت پڑھاتے تھے۔ مگر زراعتی صاحب کے نام سے موسوم تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ ان کے صاحبزادے مجید طاہر نے ہمیں بتایا کہ جب سویڈن میں ہمارا دل کا اپریشن ہوا تو اتفاق سے زراعتی صاحب جرمنی میں آئے ہوئے تھے۔ ہر نماز سے پہلے سب کو بار بار تاکید کرتے کہ ناصر کے لئے بہت دعائیں کرو وہ میرا

چہیتا شاگرد ہے بلکہ میرا بیٹا ہے۔ ایسے استاد کس کو نصیب ہوتے ہیں؟

تقسیم کے بعد اپنے گاؤں کے سکول میں ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب سے کچھ دیر پڑھنا یاد ہے۔ ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب ہمارے پھوپھا راجہ عبدالرؤف خاں صاحب کے بڑے بھائی

تھے۔ تھوڑے عرصہ میں ہمیں پاس کے قصبہ قاضیاں کے مڈل سکول میں منتقل ہونا پڑا۔ قاضیاں اب تو بڑا شہر بن گیا ہے۔ اس زمانہ میں چھوٹا سا قصبہ تھا۔ قاضیاں سکول کے دو اساتذہ یاد ہیں۔ قاضی اکرم صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ قاضی صاحب انگریزی پڑھاتے تھے۔ ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی پہنتے اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اسے گھماتے رہتے۔ سبق پڑھانے میں بھی گھمانے کا یہ عمل جاری رہتا۔ ماسٹر عبدالجلیل صاحب اہل زبان مہاجر تھے۔ اور پتہ نہیں قاضیاں کیسے پہنچ گئے تھے۔ ان کی ٹیڑھی مانگ یاد ہے۔ پھر ہم ربوہ منتقل ہو گئے۔ ربوہ اس وقت کچے مکانوں کی آبادی تھی۔ ربوہ میں اس وقت ہماری عمر کے بچوں کا کوئی سکول نہیں تھا۔ چھوٹے بچے تو لڑکیوں کے ساتھ ہی پڑھتے تھے مگر ہمیں تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں جانا پڑتا۔ ربوہ سے ایک گاڑی صبح چھ بجے چلتی تھی ہم لوگ اس سے جاتے اور شام چھ بجے کے قریب واپس آتے۔ گاؤں میں تھے تو اتنا فاصلہ پیدل طے کرتے تھے۔ یہاں گاؤں کا ماحول نہیں تھا۔ اس لئے سارا دن گاڑی کا انتظار کھینچتے۔ سردیوں کے موسم میں صبح چھ بجے گاڑی سے چنیوٹ پہنچتے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے اور کھیتوں سے گاجریں مولیاں اکھیڑتے اکھاڑتے اور کھاتے سکول پہنچتے۔ گیٹ پر ڈے ماسٹر سے ملاقات ہوتی اور شڑاپ شڑاپ چھڑیاں پڑتیں اور ہم سوں سوں کرتے ہاتھ ملتے کلاسوں میں جا پہنچتے۔ سکول کی دیواروں کے ساتھ کنیر کی باڑھ تھی ہمارے استادوں نے وہ ہمارے ہاتھوں پر صرف کر دی۔ اب وہ سکول لنڈ منڈ نظر آتا ہے۔

چنیوٹ سکول کی یادوں میں حضرت سید محمود اللہ شاہ صاحب کا بارعب چہرہ یاد ہے۔ حضرت شاہ صاحب اپنے دفتر سے کم ہی باہر نکلتے تھے۔ مگر جہاں کہیں نظر آجاتے طلباء دبک جاتے۔ حالانکہ وہ کبھی طلبا سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ نہایت پروقار اور دھیمے دھیمے انداز سے چلتے تھے۔ سر پر ٹوپی آنکھوں پر کالی عینک، جسم پر سوٹ ان کا گھر سکول سے سامنے نظر آتا تھا اور خاصے فاصلے کے باوجود نظر آتا تھا اب تو درمیان

میں بے شمار عمارتیں بن گئی ہیں۔قبلہ شاہ صاحب سکول کھلنے کے وقت سے پہلے تشریف لے آتے
تھے ہم نے کبھی انہیں سکول کھلنے کے بعد آتے نہیں دیکھا۔اسمبلی میں نہایت وقار کے ساتھ خطاب کرتے
تھے۔مختصرالکلام تھے۔زیادہ باتیں کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔سکول میں ماسٹر محمد ابراہیم صاحب
سے جنہیں لوگ ان کی جموں کی رہائش کے لحاظ سے جمونی کہتے تھے۔انگریزی پڑھی۔ماسٹر صاحب
انگریزی خوب پڑھاتے تھے۔Tense یاد کروانا ان پر ختم تھا۔اب بھی جو دو چار لفظ انگریزی کے آتے
ہیں یہ انہی کا فیضان ہے ورنہ کالج میں استاذی مرزا خورشید احمد صاحب سے تو سوائے تلفظ کے اور کچھ نہیں
سیکھا اور حالت یہ ہے کہ اب تک Th کی آواز نہیں نکال سکتے۔(براہو بے تکلفی کا ہم اپنے استادوں سے
بھی چہل کرنے سے باز نہیں رہ سکتے)۔صوفی محمد ابراہیم صاحب اور صوفی غلام محمد صاحب سے سائنس۔
مکرم ماسٹر سعد اللہ خان صاحب سے تاریخ وجغرافیہ، مرزا عنائت اللہ صاحب سے عربی، پروفیسر محمد
ابراہیم صاحب ناصر سے حساب پڑھا۔اللہ کا شکر ہے کہ حساب کے باب میں تب بھی کورے تھے اور اب
بھی کورے ہیں۔ماسٹر نور الہیٰ صاحب سے ڈرائنگ پڑھی۔سیکھی ہوتی تو کچھ نہ کچھ کھینچنا آجاتا۔نہ
آیا۔!ہاں جس شخص نے ادب کی چاٹ لگائی وہ ماسٹر نذیر احمد صاحب رحمانی تھے۔اللہ اللہ کیا استاد تھے۔
سکول کا زمانہ۔لڑکپن کی عمر۔رحمانی صاحب غالب پڑھاتے تو یوں لگتا جیسے غالب نے ہمارے ہی لئے
شعر کہہ رکھے ہیں۔ذوق پڑھاتے تو زبان کی چاشنی اپنی زبان پر محسوس ہونے لگتی۔حالی کا ذکر کرتے تو
تمام باتیں سہل ممتنع میں بیان کرتے۔رحمانی صاحب نے زبان وادب کا ذوق پیدا کیا۔ان کے بیٹے سعید
احمد خاں قادیان کے زمانہ سے ہمارے کلاس فیلو تھے۔ہم لوگ اس طرح شیر و شکر تھے کہ سعید صاحب
ہمارے گھر کو اپنا گھر اور ہم سعید کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ہماری مائیں بھی ہمیں ایک جیسا پیار دیتی
تھیں۔وہ ہماری امی کو پھوپھی اور ہم اس کی امی کو پھوپھی کہتے تھے۔بات رحمانی صاحب سے چلی تو
پھوپھی صوفیہ تک چلی گئی۔مگر وہ رشتے ہی اتنے پکے تھے۔چار پانچ برس پہلے ہم بھائی رشید رحمانی کے گھر
پھوپھی صوفیہ سے کوئی پینتیس سال کے بعد ملے۔آپ نے اس طرح لپک کر ہمارا ماتھا چوما جیسے بچپن میں
چوما کرتی تھیں۔بہت ضعیف ہوگئی تھیں چونکہ ابا جان اور پھوپھی جی کی وفات کے ایک لمبا عرصہ بعد ان
سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لئے بھائی اور بہن کو یاد کر کے آبدیدہ ہوگئیں۔افسوس کہ دو سال پہلے پھوپھی

صوفیہ بھی اللہ کو پیاری ہوئیں! رحمانی صاحب تو کوئی پینتالیس برس پہلے رخصت ہو گئے تھے۔

سکول کے اساتذہ میں سے رحمانی صاحب کے بعد جس استاد نے زیادہ متاثر کیا وہ جمونی صاحب ہیں۔ پتلے جُثے کے آدمی ہیں۔ اچکن اتار دیں تو بالکل سینک سلائی نظر آتے ہیں۔ ان کی کرکٹ پروری کا یہ عالم ہم نے دیکھا ہے کہ سکول کی ٹیم اندر کھیل رہی ہوتی تھی، ادھر میاں صاحب باہر سٹیج پر کھیلتے تھے۔ باؤلر کے ساتھ بال کرواتے اور بیٹ مین کے ساتھ بیٹنگ اور بعض اوقات لپک کر کیچ بھی لیتے اور ہم لوگ ٹیم کی کرکٹ سے زیادہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی کرکٹ سے محظوظ ہوتے تھے۔

عزیزم مولانا عطاء المجیب راشد کی صدارت کے زمانہ میں میں کالج یونین کا انچارج تھا۔ ایک انگریزی مباحثہ میں ہم نے مکرم میاں صاحب کو جج کے طور پر مدعو کیا۔ آپ بہت خوش ہوئے کہ شاگردوں نے اپنے سکول کے استاد کو کالج کے مباحثہ میں جج بنایا ہے۔ میاں صاحب معمر آدمی ہیں مگر اللہ کے فضل سے ذہنی طور پر خوب مستعد ہیں۔ مباحثہ کے بعد سٹاف روم میں چائے پیتے ہوئے کہنے لگے۔ میاں! تم نے خوب چن کر مجھے مباحثہ کا جج بنایا! تمہیں معلوم ہے نا کہ میں ربوہ والوں کے لئے انگریزی کی ''ماں'' ہوں! میں نے عرض کیا'' درست فرمایا، آپ کی عمر کو پہنچ کر آدمی کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ماں ہے کہ باپ ہے!'' اس پر لمبا قہقہہ بلند ہوا اور سب سے بلند قہقہہ میاں صاحب کا تھا۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے ہیڈ ماسٹری سے بھی ریٹائر ہوئے۔ کرکٹ سے بھی اور امریکہ خدمت دین سے بھی! اب صرف مضمون لکھنے پر گزارا ہے۔ اللہ انہیں خوش و خرم رکھے۔ اب تو انہیں ہم سے رخصت ہوئے مدتیں ہو گئیں۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

کچھ بے نفس لوگ

حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ کی سوانح پڑھتے ہوئے حضرت حکیم عبید اللہ رانجھا صاحب کا نام سامنے آیا۔ زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا۔ قادیان کے زمانہ سے ہی ان سے گھر جیسے تعلقات تھے۔ ان کی بیگم پھوپھی رابعہ ہم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کی بیٹیاں غالباً صفیہ اور رقیہ نام تھا ہمیں بھائیوں کی طرح چاہتی تھیں۔ کبھی ان کے گھر جانا ہوتا تو ہمارے آگے پیچھے پھرتیں اور ہمارے ناز اٹھاتیں۔ پھر ربوہ میں بھی محلہ داری رہی۔ دارالرحمت وسطی کی جنوبی جانب آخری گلی میں ان کا مکان تھا۔ مکان کیا ایک کمرہ سا تھا اس کے ساتھ صحن۔ یہاں بھی ان کی محبتیں اسی طرح قائم رہیں۔ ہماری پھوپھی جی بیگم جی اور پھوپھی رابعہ کا بڑا دوستانہ تھا اس لئے کئی بار ان کے ہاں جانے کا حکم ہوتا تھا اب پھوپھی رابعہ سے یہ کہہ کے آؤ اب پھوپھی رابعہ کے ہاں یہ چیز دے کر آؤ۔ اور پھوپھی رابعہ اور ان کی بیٹیاں ہم سے اتنا پیار کرتی تھیں کہ ہمیں کئی کئی بار ان کے ہاں جانا کھلتا نہیں تھا۔

حکیم صاحب کو ہم حکیم صاحب ہی کہتے تھے۔ ان کی باتوں میں اتنی ملائمت ہوتی تھی کہ ہمیں ان جیسا ملائم گو اور کوئی یاد نہیں پڑتا۔ دھیمے مزاج کے بزرگ تو ہمارے ہاں سارے ہی تھے مگر بچوں سے جس ملائمت سے حکیم صاحب پیش آتے تھے وہ ان کے لئے خاص تھا پھر حکیم صاحب ہمارے پھوپا جی حضرت مولوی غلام نبی مصری صاحب کی طرح ہر وقت ذکرِ الٰہی کرتے رہتے تھے۔ حکیم اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے تو حکیم ہوں گے بھی مگر ہم نے انہیں کبھی طبابت کرتے دیکھا نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم ان کے گھر تو جاتے رہے ان کے مطب نہیں گئے۔ حکیموں میں سے تو ہمیں اپنے گھر میں ابا جی، محلہ میں حضرت حکیم عبد العزیز صاحب طبیہ عجائب گھر والے یاد ہیں۔ سنا ہے حضرت حکیم عبید اللہ بسمل صاحب بھی ہمارے محلہ دار تھے مگر ان کی کوئی یاد ذہن میں موجود نہیں۔ انہوں نے لمبی عمر پائی۔ ہمارے ابا کے حکمت میں استاد تھے اور ابا جی اکثر ان کا ذکر گھر میں کرتے تھے۔ حکیم عبید اللہ رانجھا صاحب حضرت مولوی شیر علی صاحب کے ہم وطن تھے اور پنجاب کے رہنے والے تھے مگر اردو بولتے تھے۔ شاید حضرت حکیم نورالدین صاحب کی

طرح حکمت کی تعلیم کہیں اردو بولنے والے علاقہ میں پائی ہو یا ہمارے پھوپھا جی کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے اردو بولنے کی عادت راسخ ہوگئی ہو کیونکہ ہم نے پھوپھا جی کو کبھی پنجابی بولتے نہیں سنا۔ پھوپھی رابعہ پنجابی بھی بڑی اچھی بولتی تھیں مگر وہ بھی ہمارے ساتھ اردو ہی میں بات چیت کرتی تھیں۔

حکیم عبید اللہ رانجھا صاحب کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ سر پر صافہ باندھتے تھے۔ بعض اوقات کلاہ والی پگڑی بھی ہم نے ان کے سر پر دیکھی ہے مگر صافہ انہیں پسند تھا۔ سفید ململ کا صافہ، سفید کرتا، ٹخنوں سے اونچی شلوار اور پاؤں میں دیسی جوتی۔ دور سے آرہے ہوں تو ہو بہو حضرت مولوی شیر علی صاحب لگتے تھے۔ نظریں زمین پر رہتی تھیں ہونٹ ذکرِ الٰہی سے تر رہتے تھے چلتے تو ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے مگر تیز قدم تھے۔ قد درمیانہ تھا اور جسم دبلا۔ ہم نے حکیم صاحب کو جیسا قادیان میں دیکھا ویسا ہی ربوہ میں پایا۔ دبلے پتلے اور مسکین طبع۔ ان کے گھر کی خصوصیت یہ تھی کہ صوفیا کے ٹھکانوں کی طرح سامانِ دنیا سے بے نیاز تھا۔ ہمیں حکیم صاحب کے گھر میں فرنیچر کے نام پر سوائے چارپائی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آئی مگر بے سروسامانی اس وجہ سے نہیں تھی کہ توفیق نہ رکھتے تھے اللہ کے فضل سے توفیق رکھتے تھے مگر سامانِ دنیا کی حرص سے بے نیاز تھے۔

بزرگوں کے ہاں حاضری دیتے رہنا ہم نے حکیم صاحب سے سیکھا۔ ان کے قریب ہی حضرت مولانا راجیکی صاحب کا دولت کدہ تھا۔ آتے جاتے وہاں حاضری دیتے تھے۔ ہماری گلی میں سے گذر ہوتا تو حضرت پھوپھا جی سے سلام کے لئے ضرور آتے۔ خاندان کے لوگوں سے عشق کی حد تک پیار کرتے۔ کوئی بچہ بھی سامنے آجاتا تو احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ یہ وصف حضرت مولانا شیر علی میں بھی تھا پھوپھا جی میں بھی تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے سارے ہی اصحاب میں موجود تھا۔ بانیء سلسلہ کے عشق کا رنگ ان کے ساتھیوں پر اتنا گہرا تھا کہ یہ لوگ ان کی اولاد بلکہ اولاد در اولاد کے لئے اسی عشق کا اظہار کرتے تھے۔

حکیم صاحب کو حکمت کرتے تو ہم نے دیکھا نہیں ان کی روزی کا کیا وسیلہ تھا ہمیں بالکل علم نہیں مگر اللہ کے فضل سے تونگر تھے اللہ تعالیٰ ان کی حاجتیں پوری کرتا تھا۔ جو اللہ پر توکل کیا کرتا ہے اللہ اس کے لئے بس ہے۔ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ۔ ان کی بیٹیوں میں سے ایک غالباً صفیہ رانجھا' بعد کو سکول میں استاد ہوگئی تھیں مگر بڑا ہو جانے کے بعد ان سے اس طرح رابطہ نہ رہا یا شاید پھوپھی رابعہ اور

حکیم صاحب کی وفات کے بعد ان قریبی تعلقات کو بھی زوال آ گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مگر حضرت حکیم صاحب کی یاد دل کے کسی کونے میں موجود تھی اب حضرت مولوی شیر علی صاحب کے حالات پڑھتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی اور ابھر کر ذہن کی سطح پر آ گئی اور ہم نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا کہ ایک بزرگ کا ذکرِ خیر کر کے کچھ نیکی ہی کما لیں۔ کیا خبر اللہ تعالیٰ اپنے ان محبوب دوستوں کے ذکر کے طفیل ہمارے لکھے کو کسی کی ہدایت کا موجب بنا دے۔

قادیان کے پڑوسیوں میں سے حضرت شیخ فضل احمد بٹالوی صاحب بھی تھے۔ ان کا بیٹا لطیف' ہمیں کب سے توجہ دلا رہا تھا کہ ہمیں شیخ صاحب کے ذکرِ خیر میں کچھ لکھنا چاہئے مگر ہم اسی حیلہ سے لطیف کو ٹالتے آ رہے تھے کہ وہ خود کیوں نہیں لکھتا؟ اب قادیان کے بے نفس اور خاموش لوگوں کا ذکر کرنے بیٹھا ہوں تو شیخ صاحب سامنے آ گئے ہیں۔ قبلہ شیخ فضل احمد صاحب بٹالوی حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ میں سے تھے۔ ہمیں حضرت مولانا راجیکی صاحب کے افادات سے معلوم ہوا تھا کہ قبلہ شیخ فضل احمد صاحب کی پھوپھی جی محمدی بیگم سے پہلے بھی کوئی بیگم تھیں جن سے اولاد نہ ہوئی اور شیخ صاحب محض اولاد نہ ہونے کی خاطر انہیں طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ رکھ لیا اور ان کی وفات کے بعد شیخ صاحب نے دوسری شادی کی۔ اس بیگم سے جو اولاد ہوئی ان میں سے بھائی جان محمد احمد واقف زندگی ہیں۔ بیٹیاں آپا بشریٰ امینہ وغیرہ ہماری بڑی بہنیں تھیں۔ بیٹوں میں سے لطیف ہمارا کلاس فیلو اور ہم عمر ہے مبارک مرحوم ایک دو برس بڑا تھا۔ رشید چھوٹا تھا اور لئیق تو بہت ہی چھوٹا تھا (لئیق سے مراد مولانا لئیق احمد طاہر مبلغ انگلستان ہیں)۔ قادیان کے زمانہ سے ہم ہمسائیگی کے ناطے ان کے گھر میں یوں آتے جاتے تھے جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ لطیف اور اس کے بہن بھائی ہمارے ابا کو ماموں اور ہم ان کی امی کو پھوپھی کہتے تھے۔ یہ تعلق ربوہ تک چلا بلکہ اب تک چلا آتا ہے۔ لطیف ربوہ سے نکلا تو افریقہ چلا گیا افریقہ سے نکلا تو جرمنی آ کر بس گیا۔ پچھلے برس اس کا ایک مضمون کینیڈا کے احمدیہ گزٹ میں چھپنے کے لئے آیا تو عزیزی ہدایت اللہ ہادی نے وہ مضمون ہمیں بھیج دیا کہ قادیان کے اہلِ محلّہ کا ذکر ہے۔ اس بہانہ سے لطیف سے کوئی چالیس برس بعد رابطہ ہوا۔ بھائی جان محمد احمد سے ایک بار جرمنی کے جلسہ پر ملاقات ہوئی تھی اگرچہ ان کی خیر خیریت کی خبر عزیزم محمود احمد ملک سے ملتی رہتی تھی۔ ہمیں اس شتر گربہ کی

کبھی سمجھ نہیں آئی کہ قبلہ شیخ فضل احمد صاحب بٹالوی شیخ کہلاتے تھے ان کی اولاد ملک کہلاتی ہے۔ ہم نے ایک دوست سے اس معمہ کا حل پوچھا تو اس نے کیا خوب صورت جواب دیا کہ بادشاہ لوگ ہیں جو چاہیں کہلائیں۔

شیخ صاحب کو ہم نے قادیان میں جس حال میں دیکھا ربوہ میں بھی عین مین وہی حال ان کا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی، سر پر پگڑی۔ صافہ نہیں باندھتے تھے کلاہ والی پگڑی ہوتی تھی۔ مسجد کی طرف رواں دواں۔ قادیان میں ہم لوگ محلہ دارالفضل میں رہتے تھے مگر مسجد نور قریب پڑتی تھی اس لئے سب لوگ مسجد نور میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ شیخ صاحب گھر سے نکلتے۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے دروازے کھٹکھٹاتے جاتے کہ چلو بھئی نماز کا وقت ہو گیا۔ ربوہ میں بھی ریلوے روڈ کے دروازوں پر دستک کے نشانات اگر موجود ہوں گے تو قبلہ شیخ صاحب کی چھڑی کے نشانات ہوں گے۔ ہم نے تو ہمیشہ انہیں بوڑھا ہی دیکھا۔ ظاہر ہے صحابی تھے تو بڑی عمر کے ہوں گے مگر ان کی اولاد ہماری ہم عمر تھی۔ ان کی بیگم پھوپھی جی محمدی بیگم بڑی ٹھسے والی خاتون تھیں۔ قادیان میں بھی محلہ میں ان کا دبدبہ تھا ربوہ میں بھی رہا۔ پٹیالہ کی تھیں۔ پان کھاتی تھیں ان کا پاندان بھی ہمیں یاد ہے۔ بہت بھاری ہوا کرتا تھا اور ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار حضرت اماں جان ہمارے گھر تشریف لائی تھیں تو پھوپھی جی نے بھگایا تھا کہ جاؤ پھوپھی جی محمدی بیگم کے ہاتھ کا پان لے آؤ اور جب ہم نے پان مانگا تھا تو پان کے ساتھ ساتھ پھوپھی جی محمدی بیگم بھی کھنچی چلی آئی تھیں حضرت اماں جان قادیان کے ہر گھر میں بلا تکلف آیا کرتی تھیں۔ ہمیں اپنے گھر میں ان کا ایک سے زیادہ دفعہ کا تشریف لانا یاد ہے۔ ہمارا گھر تو حضرت مرزا شریف احمد صاحب کی کوٹھی کے رستہ میں پڑتا تھا اس لئے شاید ستانے کے لئے رک جاتی ہوں۔ لیکن نہیں وہ تھکتی کہاں تھیں؟ ہم نے حضرت اماں جان کو دور دراز کے محلوں تک بھی جاتے دیکھا ہے چلنے میں انہیں انقباض نہیں تھا۔ حضرت مرزا شریف احمد صاحب نے شاید اپنی اماں سے یہ ورثہ پایا ہو مگر چلنا تو حضرت اقدس مسیح موعود کی سنت تھی۔ حضور کی واحد ورزش چلنا تھی اور حضور بہت چلا کرتے تھے۔

قبلہ شیخ صاحب کی طبیعت میں سنجیدگی اور متانت کا غلبہ تھا۔ ہم نے انہیں ہنستے نہیں دیکھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدانخواستہ سخت طبع یا سخت گیر تھے یا بچوں کے ساتھ درشتی سے پیش آتے تھے۔ نہیں۔

طبیعت کی سنجیدگی کا مطلب یہ ہے ان کی باتوں میں سنجیدگی کا عنصر نمایاں رہتا تھا۔ بحث نہیں کرتے تھے مگر اپنی بات پر سختی سے قائم رہتے تھے۔ پھوپھا جی حضرت مولوی غلام نبی مصری سے انہیں بہت تعلقِ خاطر تھا ان کے پاس بیٹھتے تو علمِ حدیث کی باتیں کرتے رہتے۔ ہمارے ابا جی سے ملتے تو ان سے ان کے کام کی باتیں سنتے۔ ہمارے دادا کے پاس بھی آیا کرتے تھے۔ ہمارے دادا آم کے درخت کے نیچے بیٹھے قرآن پڑھتے رہتے تھے شیخ صاحب آتے تو ان کی پائنتی بیٹھ جاتے اور شاید کچھ باتیں بھی کرتے ہوں گے ہمیں اس کے بارہ میں وثوق نہیں ہے ہاں دادا جان کے پاس انہیں بیٹھا ہوا دیکھنا یاد ہے۔ ملک صلاح الدین صاحب کو تو ہم نے دادا جان کے پاس بیٹھ کر آم چوستے ہوئے دیکھا ہے۔

ربوہ میں آ کر آباد ہوئے تو سلسلہ کے دیگر بزرگوں کی طرح انہیں بھی قادیان بہت یاد آتا تھا ہر کسی سے یہی کہتے تھے دعا کرو جلدی قادیان جانا ہو۔ دراصل قادیان واپس جانے کی تمنا اس زمانے کی سب سے بڑی آرزو تھی ہر شخص جو قادیان سے نکلا تھا قادیان واپس جانے کا آرزومند تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آزمائش کا دور لمبا کر دیا۔ خلافت ثانیہ اور ثالثہ میں یہ وقت نہ آیا خلافتِ رابعہ میں حضرت صاحب بڑی شان و شوکت سے قادیان تشریف لے گئے۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ قادیان کی واپسی کی تمنا صرف شیخ صاحب سے مختص نہیں تھی سب لوگ اسی تمنا کے اسیر تھے مگر شیخ صاحب کو دیکھا کہ قادیان کے ذکر پر ایک آہ سی بھرتے تھے۔ ہمارے استاد ماسٹر نذیر احمد رحمانی مرحوم نے یہ نکتہ ہمیں بتایا کہ قادیان کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ قادیان کے سینہ سے جو آہ سی نکلتی ہے اسے ہوک اٹھنا کہتے ہیں ہوک کا مطلب اس مثال سے ہمیں سمجھ میں آیا تھا۔

شیخ صاحب کے ذکر کا فیض ہے کہ اپنے دادا جان کے بارہ میں کچھ لکھنے کی تحریک ہوئی ہے' ہمارے دادا جان مولوی محمد فضل خان' چنگا بنگیال ضلع راولپنڈی کے مالک راجپوتوں میں سے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنے علاقہ کے معززین میں شمار ہوتے تھے

ئی۔ ہمارے ابا کی پیدائش

۱۹۰۸ کے اوائل کی ہے۔ دادا جان نے حضرت اقدس کی خدمت میں بچے کا نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضرت صاحب کی طرف سے خود حضرت صاحب کے دستخطوں سے جواب ملا کہ ''بچے کا نام احمد خان رکھیں اللہ تعالیٰ خادمِ دین بنائے''۔ یہ جواب جو ایک کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ دادا جان کو عین اس روز موصول ہوا جس روز حضرت اقدس کے وصال کی خبر پہنچی۔ دادا جان کو دکھ ہوا کہ ماموروقت کو پہچانا مگر اس کی صحبت میں رہنا کم کم نصیب ہوا۔ بس اسی وقت سے انہیں لَو سی لگ گئی کہ اب سب کچھ تج کر قادیان چلنا چاہیے۔

چنانچہ اسی سال دادا جان قادیان اٹھ آئے۔ معاش کے لئے پہلے حضرت نواب مبارکہ بیگم کی دربانی اختیار کی اُس کے بعد حضرت مرزا شریف احمد کی کوٹھی بن گئی تو وہاں منتقل ہو گئے اور مدت العمر ان کے اور بوزینب کے دربان رہے۔ تایا جان محمد خان ان کی طرح نواب محمد علی خان کے دربان رہے۔ چھوٹے تایا حافظ لعل خان نے یکہ چلانا شروع کیا اور قادیان کے مہمانوں کو بٹالہ تک لاتے لے جاتے رہے۔ حافظِ قرآن تھے ادھر سواری کو بٹھا کر روانہ ہوتے ادھر قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے۔ قادیان کی منزل تک پہنچتے پہنچتے مہمان کو قرآن کی کئی منزلیں سنا دیتے۔ فرمایا کرتے تھے ایک تو مہمانوں کے کانوں میں دین کی باتیں پڑتی رہتی ہیں دوسرے میرے تانگہ میں لغو گفتگو کوئی نہیں کرتا۔ دادا جان اللہ تعالیٰ کے فضل سے اونچے لمبے اور جسم کے مضبوط آدمی تھے۔ بڑھاپے میں قدِ خم کی کیفیت نمایاں ہو گئی تھی مگر اپنا کام خود کر سکتے تھے اور کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں کسی قسم کی محتاجی نہیں تھی بلکہ کئی بار دادی جان مرحومہ کی خدمت کے لئے وضو کے لئے پانی انہیں لا کر دیتے تھے۔ دادی جان بچاری موتیا کی وجہ سے آنکھوں سے لاچار ہو گئی تھیں۔ قادیان سے ہجرت کے وقت ان کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ آنکھوں سے معذور تھیں مگر چھڑی کے سہارے چل پھر لیتی تھیں۔ ہجرت کا صدمہ ایسا دل کو لگا کہ چارپائی سے لگ گئیں مگر چنگا بنگیال پہنچ کر جیسے ان کی توانائی عود کر آئی شاید اس لئے بھی کہ اپنے مستقر پر واپس آ گئی تھیں۔ ہر کام ان کے اشارے اور مرضی سے ہونے لگا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں ان سے ملنے کے لئے آنے لگیں تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اب انہیں اپنی پرانی مالکانہ ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں۔ ان کا رعب داب ایسا تھا کہ مزارعین خود گھر آ کر ان کے واجبات ادا کر جاتے تھے۔ جوار باجرہ مکئی کی فصلوں کی بٹائی کا حصہ ملنے لگا تو ہم لوگ بھوکوں نہیں مرے ورنہ یوں لٹ پٹ کے واپس آ بیٹھنے پر کون کسی کا پرسانِ حال ہوتا؟۔ دونوں

تایا زمینداری میں مشغول ہو گئے ۔ گھر میں پھوپھا جی تھے وہ دعاؤں میں لگ گئے ۔ غرض ابا جی کے ہندوستان سے رہا ہو کر آنے تک ہمارا وقت کشائش سے نہیں کٹا تو تنگی ترشی بھی اللہ کے فضل سے ہم نے نہیں دیکھی ۔

دادا جان کے سپرد حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا فارم بھی تھا ہم بے خوف وخطر اس فروٹ فارم میں جایا کرتے تھے مگر دادا جان کا رعب ایسا تھا کہ بھول کر بھی کسی پھل کو توڑنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی ۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم بھی دادا جان کی طرح اس باغ کے نگران ہیں ۔ دادا جان باغ میں بیٹھے قرآن پڑھتے رہتے ۔ کام کرنے والے اپنا کام کرتے رہتے ۔ ہم نے کبھی کسی شخص پر دادا جان کو ناراض ہوتے یا غصہ سے اونچی آواز میں بولتے نہیں دیکھا یا سنا۔ باغ میں ان کی موجودگی ہی اس بات کی ضامن ہوتی تھی کہ باغ کا رکھوالا چوکس ہے ۔ یہ باغ فروٹ فارم کہلاتا تھا۔ اس کے آم بڑے لذیذ ہوتے تھے۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا طریق تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے دوستوں کو آموں کا تحفہ بھیجا کرتے تھے ۔ ان دوستوں میں مولانا عبدالمجید سالک بھی تھے ۔ ہم کسی اور مضمون میں کسی جگہ یہ ذکر کر چکے ہیں کہ سالک صاحب نے ایک بار اپنے مشہور عالم افکار وحوادث میں لکھا تھا کہ " قادیان والے مرزا بشیر احمد صاحب کو قمر الانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔ وہ ہمیں ہر سال آموں کا تحفہ بھیجا کرتے ہیں وہ اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ ان آموں کو کھا کر ہم بھی انہیں " قمر الانبیہ " کہنے کو تیار ہیں " (انبیہ انبہ کی جمع ہے اور اہلِ زبان آم کو انبہ کہتے ہیں) ۔

دادا جان کو حکمت میں بھی شغف تھا۔ جڑی بوٹیوں کی پہچان رکھتے تھے اور ان سے علاج وغیرہ بھی کرتے رہتے تھے ۔ دم درود کرنے میں بھی انہیں مہارت تھی خاص طور سے سانپ کے کاٹے کا دم کرتے تھے اور لوگ دور دور سے ڈسے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر لاتے تھے ۔ دادا جان کے دم سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ٹھیک ہو جاتے تھے ۔

دادا جان کا ایک وصف ہم نے یہ دیکھا کہ ان کے داماد مولوی غلام نبی مصری بڑے عالم تھے دادا جان ان کا حد سے سوا احترام کرتے تھے ۔ پھوپھی جی سے پوچھتے رہتے تھے کہ مولوی صاحب کو کوئی تکلیف تو نہیں اسی طرح ہمارے تایا لعل خان جناب احمد نور کابلی کے داماد تھے ۔ وہ کبھی ہمارے گھر میں آتے تو دادا جان

دوسروں سے بڑھ کر ان کی قدر کرتے ان کا خیال رکھتے۔ کہتے تھے انہوں نے شہید کی خوشبو سونگھی ہوئی ہے۔ احمد نور کابلی صاحب کی ناک کسی مرض کی وجہ سے جھڑ گئی تھی ان کے منہ پر پلاسٹک کی ناک تھی جس کی پھننگ پر سنہری عینک دھری رہتی تھی۔ بچے ان کی غنغناتی گفتگو پر ہنستے تو دادا جان بہت برا مانتے۔ ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ دادا جان کا انتقال ہؤا تو ہمیں احمد نور کابلی صاحب کو اطلاع دینے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ کہیں اندرون شہر میں رہتے تھے۔ غالباً دادا جان کو غسل دینے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔

سید احمد نور کابلی صاحب حضرت صاحبزادہ عبداللطیف شہید کے شاگردوں اور جاں نثاروں میں سے تھے۔ سنگساری سے شہادت کے بعد شہید مرحوم کی نعش کئی دنوں تک وہیں پتھروں میں گڑی رہی۔ بادشاہ وقت کی طرف سے نعش مبارک کو وہاں سے ہٹانے کی ممانعت تھی۔ احمد نور صاحب نے کئی دنوں کے بعد ان کی نعش کو وہاں سے نکالا اور قبرستان میں جا کر دفن کیا۔ ان کی زبان سے ہم نے سنا کہ اتنے دنوں کے بعد بھی نعش مبارک سے خوشبو آتی تھی۔ ظالموں کا بغض مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہؤا انہوں نے قبرستان میں سے ان کی نعش نکال کر کسی نامعلوم جگہ دفن کر دی کہ شہید مرحوم کی کوئی ظاہری یادگار باقی نہ رہے۔ شہید مرحوم کی یادگار تو تذکرۃ الشہادتین کی وجہ سے اب تک باقی ہے وہ ظالم کہاں ہیں؟ ان کا نام بھی مٹ گیا نشان بھی مٹ گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

سید احمد نور صاحب کا چہرہ بہت نورانی چہرہ تھا۔ جریب ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ سر پر افغانوں والے صافہ کی بجائے پگڑی ہوتی تھی۔ لمبا چغہ سا پہنتے تھے۔ اواخر عمر میں شاید ذہن میں اختلال آ گیا تھا اس لئے کوچہ گرد ہو گئے تھے مگر ضعیف تھے جگہ بہ جگہ تھک کر بیٹھ جاتے تھے قادیان کے لوگ ان کے مرتبہ کو جانتے تھے اس لئے کوئی ان سے بدتمیزی سے پیش نہیں آتا تھا۔ ان کی باتیں بے ربط ہوگئی تھیں مگر کبھی کبھی ایسی کام کی بات ان کے منہ سے نکل جاتی تھی کہ لوگ سر دھنتے رہ جاتے۔ ان کے صاحبزادے چاچا جی سید محمد نور ربوہ میں لمبے عرصہ تک زندہ رہے۔ ان کی سلاجیت ربوہ میں بہت بکتی تھی۔ ان کی بیٹی جو ہماری تائی تھیں دو بیٹے چھوڑ کر جوانی ہی میں فوت ہوگئیں تو ہمارے تایا نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ ان کی دوسری بیٹی جنہیں ہم خالہ آمنہ کہتے تھے ہمارے ساتھ بڑی محبت کا سلوک روا رکھتی تھیں۔ ان کی اولاد یہاں کینیڈا میں آباد ہے کبھی کبھار انگریزی محاورہ کے مطابق ”نیلے چاند میں ایک دفعہ“ ان سے ملاقات بھی ہو جاتی

ہے۔ چاچا جی سید محمد نور کے بیٹے یا بھانجے سید حسن نے ربوہ کی یادوں کے بارہ میں ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔

خالہ آمنہ اللہ بخشے جب تک جیتی رہیں ہمارے ساتھ اسی محبت سے پیش آتی رہیں جیسے اپنے بھانجوں برکت اللہ سمیع اللہ سے پیش آتی تھیں۔ اب تو ان کے دونوں بھانجے بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کی بیٹی زکیہ چھوٹی سی تھی اور مڈل کا امتحان دینے کے لئے ہم سے انگریزی پڑھا کرتی تھی خدا معلوم اب وہ کہاں ہے؟ ہمیں وہ منی سی لڑکی اب بھی یاد ہے۔ خالہ آمنہ کا شفیق محبتوں والا چہرہ بھی یاد ہے۔ حامد نور صادق نور بھی یاد ہیں۔ خدا جانے سید احمد نور کابلی صاحب کا علمی ورثہ کہیں محفوظ ہے یا نہیں؟

ہماری مسجد کے امام ڈاکٹر محمد طفیل صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان کی گردن کوتاہ تھی۔ تیز تیز چلتے تھے۔ سر پر لنگی رکھتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ادھر گھر سے نکلتے تو لگتا تھا بھاگ کر مسجد میں پہنچ گئے ہیں ہم لوگ اگر ان کے ساتھ گھر سے نکلتے تو مسجد تک پہنچتے پہنچتے ایک رکعت قضا ہو چکی ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب دراصل ماسٹر صاحب تھے سکول میں پڑھاتے تھے۔ ہمیں جو زمانہ یاد ہے اس میں ریٹائر ہو گئے ہوں گے۔ لب سڑک ان کا مکان تھا۔ مسجد نور اور ان کے مکان کے درمیان میں کالج کا میدان تھا۔ وہ گھر سے نکلتے ادھر ادھر دیکھے بغیر مسجد تک جاتے ان کے جاتے ہی تکبیر کہی جاتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کی آمد و رفت گھڑی کی سوئی کے مطابق ہوتی ہے۔ ہمیں اس زمانہ میں اتنا شعور کہاں؟ مگر لوگوں سے سنی ہوئی بات ذہن میں رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی قرات بہت اچھی تھی نماز مختصر اور سنوار کر پڑھاتے تھے۔ نماز میں تیزی نہیں دکھاتے تھے۔

ڈاکٹر محمد طفیل صاحب کا ذکر آیا تو اپنے چوہدری مظفر الدین صاحب یاد آئے جو اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھتے تھے مگر ہمارے سب بچوں کے معالج تھے۔ چوہدری مظفر الدین بنگالی' ریویو انگریزی کے ایڈیٹر تھے مگر دیکھنے میں نہ ایڈیٹر لگتے تھے نہ ڈاکٹر۔ ان جیسے سادہ اور نرم و ملائم آدمی ہم نے دنیا میں کم دیکھے ہماری امی کو ان کے دستِ شفا پر بڑا اعتقاد تھا۔ بچوں میں سے کسی کو چھینک بھی آجاتی تو فوراً کہتیں جاؤ چوہدری مظفر الدین صاحب سے دوا لے کر آؤ اور آفرین ہے چوہدری صاحب پر کہ دوپہر ہو رات ہو ان کے آرام کا وقت ہو ہم کسی بھی وقت ان کا دروازہ جا کھٹکھٹاتے تھے ان کے چہرہ پر کبھی ناگواری کے

آثار ہم نے نہیں دیکھے۔ سفید ململ کا کرتا پہنے بیٹھک کا دروازہ کھولتے۔ مرض کی کیفیت سنتے اور چھوٹی چھوٹی کاغذ کی پرچیوں میں ہومیو پیتھک دوائیاں بڑے سلیقہ سے ڈال کران کی پڑیاں بنانے لگتے۔ وہ تحمل کے ساتھ وہ منی منی پڑیاں بناتے رہتے اور زیرلب کچھ پڑھتے رہتے۔ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی منی منی پڑیاں بڑی شفا بخش ثابت ہوتی تھیں اور یہ ساری خدمت وہ محض خدمت کی غرض سے کرتے تھے کوئی مالی منفعت ان کا مقصود نہ تھی۔ ہومیو پیتھک علاج ان کا ذریعہ ءروزگار نہیں ذریعہ ءخدمتِ خلق تھا اور ہم نے کم لوگوں کو اس خدمت کو بشاشت سے سرانجام دیتے دیکھا ہے۔ ہومیو پیتھک علاج کے سیاق وسباق میں ثابت قدمی اور بشاشتِ قلبی سے علاج کرنے والے حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع بھی تھے۔ وہ مریض کی بات جس انہماک سے سنتے تھے اور جس طرح خوش دلی سے دوا دیتے تھے وہ اپنی جگہ ضرب المثل ہے۔ چوہدری مظفرالدین صاحب بنگالی' قادیان کب آئے اور کب سے وقف کیا ہمیں علم نہیں ہم نے ربوہ میں انہیں دیکھنا شروع کیا۔ بال بچوں والے ہو گئے تو ان کے علاج سے استفادہ کا موقع ملا۔ ان سے زیادہ نرم خو کوئی نہ دیکھا۔

بنگال کے دو تین آدمی ہماری جان پہچان کے ہیں۔ اپنے صوفی مطیع الرحمٰن صاحب۔ امریکہ کے مبلغ رہے۔ ہم نے جب انہیں دیکھا اس وقت صاحب فراش تھے اور معذور۔ ان کا بیٹا خلیل ہمارا شاگرد ہوا۔ خلیل بچارا بھی اپنے باپ کی طرح معذوری تک پہنچا اور جوانی ہی میں اللہ کو پیارا ہوا۔ اللہ اس کے بال بچوں کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین۔ اس کی بہنیں بہت سی تھیں خدا معلوم اب کہاں ہیں؟ دوسرے اپنے ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب بنگالی۔ ہم نے ان سے انگریزی پڑھی۔ انگریزی کے اصل استاد تو میاں محمد ابراہیم صاحب جمونی تھے مگر کبھی کبھار ماسٹر بنگالی صاحب بھی کلاس لیتے تھے ان کی اولاد میں سے کمال الدین مرحوم اور جمال الدین ہمارے شاگرد ہوئے۔ کمال الدین بچارا جوانی میں تو جوان بچے چھوڑ کر راہیء بقا ہؤا۔ اب اس کی اولاد یہاں کینیڈا میں ہے۔ اس کی امی آپا امینہ اور چوہدری مظفرالدین صاحب کی بیگم آپا رشیدہ ہماری بہنیں ہیں۔ اب بات ایک اور بے نفس آدمی طرف مڑ گئی پہلے ان کا ذکر کر لیں تو بات آگے بڑھے۔

قادیان میں ہمارے محلّہ میں ایک بزرگ اور بوڑھے رسالدار رہا کرتے تھے رسالدار سردار کرم داد خان۔

آپ فوج سے اعزاز کے ساتھ ریٹائر ہوئے تو حضرت صاحب کی حفاظت پر مستعد ہو گئے ۔ ہم جلسہ سالانہ کی تصویروں میں سردار کرم داد خان صاحب کو اپنی وردی پہنے نمایاں طور پہچان سکتے ہیں ۔ سردار کرم داد خان صاحب کی شادی حضرت پیر منظور محمد (صاحب یسرنا القرآن) کی بیٹی سے ہوئی تھی ۔ ان کے بطن سے دو بیٹیاں تھیں ۔ بیٹیاں چھوٹی ہی تھیں کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سردار کرم داد خان بڑھوتی کی عمر میں تھے مگر ان کی ضرورت اور اخلاص کو دیکھتے ہوئے ہمارے دادا خسر حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب حلالپوری نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی ۔ ہماری ان پھوپھی کا نام عارفہ تھا اور وہ ربوہ میں لمبی عمر پانے کے بعد فوت ہوئیں ۔ ان کی بیٹیاں آپا امینہ اور رشیدہ تھیں ایک ماسٹر عبدالرحمٰن بنگالی کے عقد میں آئیں اور ایک چوہدری مظفر الدین بنگالی کے حبالہ ءعقد میں ۔ ہماری یہ بہنیں حضرت میر مسعود احمد میر داؤد احمد اور میر سید محمود احمد ناصر کی خالہ زاد بہنیں ہیں ۔ سردار کرم داد خان صاحب کو ہم قادیان کے زمانہ سے جانتے تھے اور انہیں پھوپھا جی ہی کہا کرتے تھے شاید اس وجہ سے کہ ہماری پھوپھی جی کی ایک بہن پھوپھی محمد بی تھیں وہ سردار نذر حسین بلوچ سے بیاہی ہوئی تھیں جو ان کے عزیزوں میں سے تھے ۔ ان کی بیٹی آپا لطیفی تھیں جنہوں نے چنیوٹ میں سکول کی تعلیم کے دوران ہماری بہت دیکھ ریکھ کی ۔۔ قادیان میں ہجرت کے وقت ہماری بیٹھک میں ایک تو چچا رفیق حیات کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک وصلی تھی الیس اللہ بکاف عبدہ اور ایک آپا لطیفی کی تصویر تھی جس میں وہ ہمیں گود میں اٹھائے بیٹھی ہیں ۔ ہجرت کے کوئی بارہ تیرہ برس بعد ہم قادیان گئے بیٹھک میں وہ تصویر اور وصلی اسی طرح موجود تھیں کوئی سردار صاحب اس گھر میں مقیم تھے ہم نے کہا یہ ہمیں دے دیں کہنے لگے نہیں یہ لکھائی بہت خوب صورت ہے میں نہیں دے سکتا اور دوسری تصویر تو یہ میری بیٹھک کی واحد ڈیکوریشن ہے ۔ ہم نے اسے بتایا کہ اس تصویر میں جو بچہ ہے وہ ہم ہیں ۔ کوئی صاحبِ ذوق تھا کہنے لگا '' تو پھر گود سے نکل کر بھاگ جائیں ۔ میں تصویر نہیں دے سکتا'' ۔

جن پھوپھی عارفہ کا ہم نے ذکر کیا وہ بھی بڑی صاحبِ ذوق تھیں ۔ ایک روز خود سنانے لگیں کہ میں حلالپور گاؤں میں استانی تھی ۔ لڑکیاں بہت بدتمیز اور جھگڑالو تھیں ۔ ایک روز بہت شور مچا رہی تھیں ۔ اور میں مسلسل انہیں چپ کروانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ چپ ہو کے نہیں دیتی تھیں ۔ سکول میں ایک مددگار

کارکنہ تھی اس کو بڑا غصہ آیا۔ وہ کلاس کے اندر آ گئی اور لڑکیوں سے کہنے لگی ''تم کس قدر بدتمیز ہو استانی جی کب سے بھونک رہی ہیں اور تم سنتی تک نہیں ہو خبردار اب جو کسی نے منہ سے آواز نکالی تو میں سب کا گھلا گھونٹ دوں گی''۔ کہنے لگیں اس بات پر سب سے زیادہ ہنسی اس کی ''محاورہ پسندی'' پر مجھے آئی مگر اس کی نیک نیتی تھی کہ لڑکیاں چپ ہو گئیں اور میں اب تک اس کے لطیفہ پر ہنس رہی ہوں۔

گودڑ میں کے لعل

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح شہر اپنے مکینوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ شہر محض گلی کوچوں پر مشتمل نہیں ہوتے۔ ہر شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور وہ مزاج اس کے مکینوں کی افتادِ طبع سے معین ہوتا ہے۔ ایسے شہر اور بستیاں جہاں لوگوں کی وفاداری کسی ایک محور کے گرد گھومتی ہو دوسرے شہروں سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ رہنے کو تو ایسی بستیوں میں بھی افراد ہی رہتے ہیں مگر ان افراد کا مزاج دوسروں سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ لوگ غریب ہوں یا امیر، چھوٹے ہوں یا بڑے معاشرہ انہی سے بنتا ہے مگر ایسی بستیوں میں کنکروں کے ڈھیر میں سے ہیرے بہت نکلتے ہیں یعنی گودڑ میں سے ایسے ایسے لعل ہائے بے بہا نکل آتے ہیں کہ ان کی آب و تاب سے آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ فارسی والوں نے اسی بات کو ذرا اور طریق سے کہہ دیا کہ ”خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر“۔ پھر خالقِ حقیقی کی سنت ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بعض شہروں میں ایسے وجود پیدا کرتا رہتا ہے جو اپنے اردگرد رہنے والوں کے لئے رشد و ہدایت کا موجب بنتے اور خاک کے ذروں کو کیمیا بناتے رہتے ہیں۔ آں را کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند! یہ مضمون ایسی ہی بستیوں کے ایسے ہی افراد کے ذکر پر مشتمل ہے جو بہ ظاہر غریب لگتے تھے مگر اپنے مرشدِ کامل کی نظر سے کیمیا بن گئے تھے۔ رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ !

ہم نے برصغیر کی تقسیم سے قبل ایک چھوٹے سے قصبہ میں آنکھ کھولی۔ سنِ شعور کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ قصبہ تو چھوٹا ہے مگر اس کے بسنے والے چھوٹے نہیں ہیں۔ ہر شخص جو دیکھنے میں غریب اور مسکین نظر آیا چشمِ بینا کی نگاہ سے دیکھا تو اسے علم اور حلم میں یکتا پایا۔ ایک بزرگ تو خود اپنے گھر کے اندر تھے۔ طبیعت کے غریب مگر علومِ دینی سے مالا مال۔ مرشد نے کہہ دیا کہ فلاں کتاب کا ایک ہی نسخہ ہے جو اس وقت مصر کے کتب خانہ میں ہے ہمارے پاس وہ کتاب ہوتی تو خوب ہوتا۔ یہ غریب الطبع شخص اٹھا، سفر کی اجازت چاہی، پاپیادہ مصر کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ یہ بیسویں صدی کی بات نہیں کہ ہر قسم کے وسائل سفر میسر ہیں۔ انیسویں صدی کے برصغیر کی بات ہے جس میں چار کوس کا سفر بھی کالے کوسوں کا سفر سمجھا

جاتا تھا۔ افتاں خیزاں، منزلیں مارتا، سفر کی صعوبتیں کھینچتا، مصر جا پہنچا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کتاب کو روشنائی سے نقل کرنے کی اجازت نہیں۔ باریک کچی پنسل سے نقل کرنا شروع کیا گھر پہنچ کر اس باریک تحریر کو سیاہی سے روشن کرتا اور جزو بہ جزو اپنے مرشد کو بھیجتا اور دعائیں سمیٹتا رہا۔ پھر کتب خانہ والوں نے اس پر بھی پابندی لگادی۔ کچھ حصہ اس کتاب کا باقی تھا۔ یہی طریق سوچا کہ ہر روز کچھ حصہ اس کا حفظ کرتا اور گھر پہنچ کر اسے لکھتا اور مرشد کی خدمت میں ارسال کرتا رہا تا آں کہ کتاب مکمل ہوئی۔ جتنا عرصہ وہاں گذارا، علما و صلحاء کی صحبت میں گذارا۔ مرشد کے حکم کی تعمیل کے بعد واپسی کا قصد کیا کہ اب وہاں رہنے کا کوئی جواز باقی نہ تھا۔ واپس پہنچے تو اپنے معاشرہ میں ''مصری'' کے نام سے موسوم ہوئے ایک دینی مدرسہ میں عربی زبان وعلوم اور حدیث کا درس دینے لگے۔ ہزاروں کو فیض پہنچایا۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو ہر شخص کو ان کا احترام کرتے پایا۔ جدھر سے ان کا گذر ہوتا لوگ باگ ازرہِ احترام رستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے مگر ہم نے انہیں کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھتے نہیں دیکھا۔ سر جھکائے، خاموشی سے گذرتے چلے جاتے۔ ہونٹ ہلتے رہتے، بعد کو ہم نے جانا کہ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم کا ورد کرتے ہیں۔ اول تو محفلوں میں جانا انہیں کھلتا تھا مگر کسی دینی مجلس میں شریک ہوتے تو خاموش بیٹھے کہنے والوں کی باتیں سنتے رہتے۔ ان کا سکوت پہاڑوں کا سکوت ہوتا تھا۔ یہ بزرگ ہمارے پھوپھا تھے۔ ہمارے دادا، کہ ہم نے انہیں دیکھا تو سو سے اونچے ہو گئے تھے مگر اس بڑھوتی کی عمر میں بھی توانا اور تانٹے تھے، قد بھی ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ تھا، بڑے رعب داب کے انسان تھے مگر ہمارے ان پھوپھا سے جو ان کے داماد تھے ملتے تو نہایت عاجزی اور احترام سے انہیں ملتے۔ کہتے تھے عالم آدمی ہیں ہم ان کی برابری کہاں کر سکتے ہیں؟ پھوپھا گھر میں تشریف لاتے تو ہماری پھوپھی سے پوچھتے ''ٹکڑا ہے؟'' جو کچھ ہوتا وہ پیش کر دیتیں اور یہ بسم اللہ کہہ کے ماحضر تناول کر لیتے۔ تھوڑے کی شکایت یا مزید کی فرمائش کرتے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔ تقسیم ملک کے بعد ہم لوگ اپنے آبائی گاؤں چنگا بنگیال میں جا بیٹھے۔ دادا کہ اس گاؤں میں زمین کے مالک تھے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، آبائی زمین جو کچھ بھی تھی بٹائی پر تھی، سارے خاندان کو اسی بارانی زمین سے اپنا رزق کشید کرنا تھا۔ اس وقت میں ہم نے پھوپھا جی کو کئی بار باجرہ اور مکئی کی روٹی کو پانی میں بھگو کر چباتے دیکھا۔ بچوں کے لئے گھر والے لسی کا انتظام کر

دیتے تھے مگر بڑوں کے لئے وہ لسی بھی کفایت نہیں کرتی تھی۔ بارے ہمارے ابا جو سیاسی قیدی کے طور پر سرحد پار دھر لئے گئے تھے ایک ڈیڑھ سال کی مشقت کے بعد رہا ہو کر آئے تو ہمیں بھی اس مشقت سے نجات ملی اور ہم بھی گاؤں چھوڑ کر اس نئی بستی میں آ بیٹھے جو اولوالعزم مہاجرین نے ربوہ کے نام سے بسائی تھی۔

مگر اس بستی میں جو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے صرف یہی ایک روشن جبیں نہیں تھے سارا شہر ہی چمکتی پیشانیوں والوں سے بھرا ہؤا تھا۔ ایک بزرگ کو دیکھا ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنے اپنی بھینس کو چارہ ڈال رہے ہیں۔ معلوم ہؤا ایف سی کالج کے گریجوایٹ اور انگریزی کے عالم ہیں اور قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ ان کا دور دور تک مشہور ہے اور مستشرقین اس کا حوالہ فخر سے دیتے ہیں ۔مشہور تھا کہ سلام کرنے میں کسی کو پہل نہیں کرنے دیتے۔ ہم نے ایک بار اپنے بچپنے کی ترنگ میں اپنے ایک ساتھی سے مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ ہرچہ بادا باد، آج ہم انہیں سلام میں پہل نہیں کرنے دیں گے۔ چنانچہ ہم نے دور سے دیکھا کہ وہ بزرگ اپنے خیالات میں مگن سر جھکائے چلے آ رہے ہیں۔ ہم لوگ ان کے گھر کی گلی میں کونے پر دبک کر کھڑے ہو گئے کہ آج بھلا یہ سلام میں پہل کیسے کریں گے ہم ان کے قدموں کی چاپ سنتے اور اندازہ لگاتے رہے کہ اب موڑ مڑے کہ مڑے، اتنے میں زور سے آواز آئی ''السلام علیکم''۔ ہم نے وعلیکم السلام کہہ کر پوچھ ہی لیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہؤا کہ ہم لوگ یہاں دبکے کھڑے ہیں؟ مسکرائے ، فرمایا'' میں گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے احتیاطاً السلام علیکم کہا کرتا ہوں آپ جواب نہ دیتے تو کوئی فرشتہ جواب دے دیتا''۔ ایسے لوگوں کو آدمی فرشتہ نہ کہے تو کیا کہے؟

ایک شاعر کو دیکھا کہ پریشان مو پھٹے حالوں پڑا پھرتا ہے۔ ایک روز اطلس و کمخواب کا ایک بقچہ اٹھائے نظر آیا۔ معلوم ہؤا نواب بہاول پور نے ان کے کسی شعر پر خوش ہو کر خلعت بھیجی ہے اور یہ پریشان ہیں کہ یہ بلا کہاں سے آ نازل ہوئی؟ اس کا کیا کروں؟ دوستوں نے کہا پہنو! حقارت سے فرمایا ہم ایسے خاک نشینوں کو سزاوار نہیں کہ اس تکلف سے اپنے بدن کو آلودہ کریں۔ یہ شاعر وہ شخص تھا کہ حفیظ جالندھری ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھتا تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ حفیظ کو یہ خلعت ملتی تو حفیظ کا ردعمل مختلف ہوتا۔ اس شاعر کا یہ حال تھا سر ظفر اللہ جب وائسرائے کی کابینہ میں وزیر تھے تو ان کا سامنا ہونے پر اپنی

گاڑی سے اتر آئے اور پیشکش کی کہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائیے، کہنے لگے روز روز مجھے ایسی سواری تو میسر نہیں آئے گی اس لئے بہتر ہے میں اپنی اوقات میں رہوں۔ وزیر نے کہا میری کوٹھی پر چل کر رہئے۔ کہا نہیں معاف رکھو کیوں فقیروں کی عادتیں بگاڑتے ہو! شہر سے اتنی دور رہ کر میرے دینی مشاغل میں خلل آجائے گا۔ چھ کی دہائی میں جب سر ظفر اللہ خاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر تھے، پریس والوں نے حسب روایت انہیں ڈنر پر مدعو کیا۔ آپ نے انکار کر دیا۔ پریس والوں کا صدر ملنے آیا اور پوچھا کیا واقعی آپ ہمارے ڈنر میں نہیں آئیں گے؟ سر ظفر اللہ نے کہا ہاں اس لئے کہ اس سے میرے دینی مشاغل میں خلل آتا ہے۔ کیا عجب کہ اس درویشِ بے پروا کی بات انہیں یاد ہو اور وہی ان سے یہ بات کہلوا رہی ہو!

بدیہہ گوئی میں اس شاعر کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ اقبال اس شاعر سے خط و کتابت رکھتے ہیں اور ان کے شعروں کی برجستگی کی داد دیتے ہیں۔ حفیظ کے ہاں تو ان کے پس خوردہ کے نشانات بہت عیاں ہیں۔ ہم نے اس شاعر کو صرف ایک بار دیکھا اور وہ بھی تقسیم ملک کے بعد۔ داڑھی کو مہندی سے رنگتے تھے، لمبے بالوں کو کبھی رنگ لیتے کبھی یونہی چھوڑ دیتے۔ طبیعت میں انتہا کا استغناء تھا۔ غربت کے باوجود خوددار تھے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے بلکہ دینے والے بھی سوچ سمجھ کر اور وقت دیکھ کر کچھ دیتے تھے کہ ان کا دیا ٹھکرا نہ دیا جائے۔ موت آئی تو لائل پور میں آئی دفنانے والوں نے مٹی کی امانت مٹی کو سونپنے میں عجلت دکھائی۔ اب ان کی ڈھیری کو بھی کوئی پہچاننے والا نہیں۔

پھر ایک دیہاتی وضع کے بزرگ کو دیکھا کہ تہمد باندھے دیسی جوتی پہنے سر پر پگڑی رکھے ہاتھ میں موٹا سا عصا پکڑے تیز قدموں سے چلتے ہوئے جا رہے ہیں مگر تیز قدمی کے باوجود چال میں وقار اور تمکنت ہے۔ مسجد میں نماز پڑھتے انہیں دیکھا تو سجدہ میں زار و قطار گریہ کر رہے ہیں گویا ان کی روح آستانہ ء الٰہی پر پگھل کر بہہ رہی ہے۔ ان کی دعا گوئی کا شہرہ صرف اس شہر میں ہی نہیں چار دانگ عالم میں تھا۔ لوگ دور دور سے انہیں دعا کیلئے لکھتے اور یہ ان کے لئے دعا کرتے تھے اور بارگاہِ ایزدی میں ان کی دعائیں مقبول ہوتی تھیں۔ ہم نے جب انہیں دیکھا اس وقت ضعیف تھے ان کے گھر کے دروازے ہر کس و ناکس کے لئے کھلے رہتے تھے لوگ آتے، بیٹھتے، دعا کرواتے اور چلے جاتے تھے۔

ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ دعا کے لئے کہا، آپ نے ہاتھ اٹھا دئے کہ آؤ مل کر دعا کرلیں، نہایت تضرع سے دعا کی اور فرمایا روشنی نظر آئی ہے بارگاہ ایزدی سے امید ہے دعا قبول ہوجائے گی۔ انشاء اللہ۔ یا یہ کہ کوئی اشارہ نہیں ہوا کوشش جاری رکھئے اور دعاؤں میں سستی نہ کیجئے۔ قبولیت دعا کو اپنی کرامت نہیں جتاتے تھے۔ کسی نے نذرانہ دیا کسی نے نہ دیا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بس فیض کا ایک دریا تھا جو بہتا تھا۔

متوکل اتنے کہ مرشد کی جانب سے کسی جگہ جانے کا حکم آیا۔ چل کھڑے ہوئے۔ گھر والے کہتے ہی رہ گئے کہ گھر میں کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، بچوں کی سکول کی فیس ادا ہونی ہے، آپ سفر پر جا رہے ہیں ہم کیا کریں گے؟ کہنے لگے اب میں خدا کی راہ میں چل پڑا ہوں اب میں رک نہیں سکتا۔ جس کی راہ میں نکلا ہوں وہی سب کا متکفل ہوتا ہے۔ ابھی گھر سے چار قدم ہی گئے تھے کہ ایک اجنبی دوڑتا ہوا آیا اور ان کے ہاتھ میں سو روپے رکھے کہ فلاں شخص نے اس تاکید کے ساتھ بھیجے ہیں کہ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ اسی لانے والے کو ساتھ لیا اور راستہ میں سے گھر کے لئے خورونوش کا سامان لے کر اسے دیا کہ میرے گھر پہنچا دو باقی رقم گھر میں بھجوادی کہ متفرقات میں کام آئے گی۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے متوکلین کے ساتھ کیسا کیسا پیار کا سلوک روا رکھتا ہے۔ ایسا کئی بار ہوا اور ان کی خودنوشت سوانح حیات ''حیات قدسی'' ایسے خوارق سے بھری پڑی ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک بالکل معمولی انسان لگتے تھے۔ علم کا دریا تھے بولتے تو سننے والے دم بخود ہو کر سنتے۔ ہم نے ان کی محفل میں لوگوں کو جاتے تو دیکھا مگر ان کے وعظ سے کسی کو اٹھتے نہیں دیکھا۔ ان کے خاندان کو لوگ سات پیڑھیئے ولیوں کا خاندان کہتے تھے۔ رعب داب اتنا کہ بے خوف ہو کر مخالفین کی صفوں میں درانہ چلے جاتے اور کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکتا نہ دم مار سکتا۔ انیسویں صدی کے اواخر کا زمانہ مناظروں، مباحثوں مجادلوں کا زمانہ تھا ہر جگہ ہر آن مختلف نظریات رکھنے والوں میں مباحثے ہوتے۔ یہ ایسی مجلسوں میں بھی جہاں لپاڈگی یا سر پھٹول کا احتمال ہوتا درانہ چلے جاتے اور فریق مخالف کی شورش سے ذرا خوف زدہ نہ ہوتے۔ ان کے ہاں وہ خطیبانہ رنگ نہ تھا جو اس دور میں بڑا زوداثر سمجھا جاتا تھا اور لوگ منبر رسول پر کھڑے ہو کر اپنے جھوٹ کا تانا بانا بھی فصاحت و بلاغت سے بنتے۔ تھے لفظوں کے طوطے مینا بناتے اور عام عوام سے واہ واہ وصول کرتے تھے مگر ان کی بات سادہ و پر تاثیر ہوتی تھی لفظوں کی جادوگری کی بجائے روحانیت کے خمیر سے اپنی باتوں کو جلا دیتے تھے۔ اسی

لئے لوگ ان کی محفلوں میں جاتے تو جم کر بیٹھ جاتے تھے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ بڑے بڑے مباحثوں میں گئے اور واپس آئے تو سینکڑوں کو نورِ ہدایت سے منور کر کے آئے۔

انہیں اللہ تعالیٰ کی تائید بھی بہت حاصل تھی جو بات کہہ دیتے خدا اسے پورا کرتا۔ پورے وثوق سے اپنے روحانی تجربات کا ذکر کرتے اور لوگ ان تجربوں کے گواہ ٹھہرتے۔ ہم نے اس بزرگ صوفی کو عام لوگوں کی طرح چلتے پھرتے، اور زندگی کرتے دیکھا مگر لگتا تھا اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس دنیا کے نہیں ہیں کسی اور دنیا کے باشندے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد یوں محسوس ہوا کہ ہمارے سروں سے قبولیت دعا کا سایہ اٹھ گیا اور ہم کڑی دھوپ میں ننگے کھڑے رہ گئے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں قبروں پر جا کر منتیں ماننے کا رواج نہیں ورنہ لوگوں سے بعید نہ تھا کہ پیر پرست لوگ ان کی ڈھیری کے مجاور بن بیٹھتے۔

ایک بزرگ کو دیکھا کہ سر پر بڑا سا پگڑ باندھے اور بر میں لمبا سا چغہ پہنے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا فقہ کے بڑے عالم ہیں اور دینی علوم میں تیرے ہوئے ہیں مگر باتوں میں وہ سادگی کہ دیکھنے والے کو ذرا گمان نہ گذرے کہ وہ کسی بڑے عالم اور محدث کے روبرو ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ کہ تم میں سے بڑا وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ ہم نے اپنے اردگرد ایسے بڑوں کو دیکھا تھا جو دیکھنے میں بڑے نہیں لگتے تھے۔ اب تو وہ زمانہ آ لگا ہے کہ چھوٹے بھی بڑے بنتے ہیں۔ جو دو حرف پڑھ گیا وہ گویا مولوی اور محدث اور مولانا ہو گیا حالانکہ ایسا علم جس سے تکبر پیدا ہو اور جس کا حاصل کرنے والا متکبر ہو جائے اس قابل ہے کہ اس پر تین حرف بھیجے جائیں۔ اور ایسے ہی خود ساختہ علماء کرام ہمیں لے بیٹھے ہیں۔

ایک میانہ قد کے ذرا فربہی مائل شخص کو دیکھا کہ اردگرد سے بے نیاز، اپنی دھن میں مست چلے آرہے ہیں۔ سر پر پرانی وضع کی کرشٹی کی سرخ ٹوپی ہے۔ ہاتھ میں کتاب ہے پاؤں میں مٹی سے اٹا ہوا جوتا ہے۔ انہیں کسی نے روک لیا ہے اور وہ اس کو کوئی مسئلہ سمجھا رہے ہیں۔ بات دھیمی لہجہ دھیما، مضمون مشکل مگر سمجھانے والے کا کمال ہے کہ اس نے اس مشکل مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ سننے والا مطمئن ہو کر اپنی راہ لیتا ہے سمجھانے والا اپنی دھن میں مگن آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ علم ادیان کے ماہر ہیں۔ نماز کے بعد مسجد میں درسِ حدیث دیتے ہیں تو لوگ عش عش کرتے ہیں اور دور دور سے ان کے درس میں شامل ہونے کے لئے آتے ہیں۔ ان کا تعلق دلی کے میر درد کے گھرانے سے ہے۔ ایک دینی مدرسہ کے میر مدرسہ ہیں۔ یتیموں

بے آسرا لوگوں کے کفیل ہیں، در در سے آٹا اکٹھا کرواتے اور بھوکوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ان بے آسرا لوگوں میں سے کئی اندھے ہیں کئی معذور ہیں مگر انہیں اپنے آذوقہ کی فکر نہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا ہوا اپنا کام کر رہا ہے۔بھئی کیا کام کر رہا ہے؟ دعا!اور ہم نے جس معاشرہ میں آنکھ کھولی تھی اس میں دعا کو ہی سب سے مقدم سمجھا جاتا تھا اور ہے۔غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے۔

اے لو یہ ایک اور بزرگ نظر آئے۔سادہ کپڑوں میں ملبوس سر پر کلاہ پر بندھی ہوئی لنگی، وضع قطع سے بڑے بارعب لگتے ہیں۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج کے پڑھے ہوئے ایم اے۔انگلستان میں اسلام کی اشاعت بھی کر چکے ہیں۔اب ایک عجیب وغریب ہیئت کی لمبے انجن کی گاڑی میں دھول میں اٹے بیٹھے ہیں۔معلوم ہوا انہیں مرشد کا حکم ہے کہ اپنے علاقہ سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں۔بھلا ایسی پھٹیچر گاڑیوں پر الیکشن لڑے جاتے ہیں؟ مگر مرشد کا حکم ہے اللہ نے چاہا تو جیت انہیں کی ہوگی۔اور ہوئی تقسیم ملک کے وقت یہ پنجاب اسمبلی کے رکن تھے مگر گرفتار ہوئے تو عام قیدیوں کی طرح انہیں سی کلاس میں سڑنا پڑا۔ ہمارے ابا بھی ان کے ساتھ قید میں تھے ان کا کہنا ہے کہ یہ ایم ایل اے (یعنی ممبر لجسلیٹو اسمبلی) غریب مفلوک الحال خارش زدہ قیدیوں میں جا بیٹھتا اور انہیں سمجھاتا رہتا، لوگ کہتے خارش چھوت کی بیماری ہے آپ کو لگ جائے گی جواب ملتا کیا فرق پڑتا ہے خارش ہی تو ہے کوئی مہلک بیماری تو نہیں!یہ معمول قید کا سارا عرصہ جاری رہا۔رہا ہو کر آئے تو اسمبلی کے اجلاس میں چلے گئے گویا پکنک سے واپس آئے ہیں۔ہم نے انہیں اپنے ابا کی دوستی کے ناطے بہت قریب سے دیکھا۔بڑے آسودہ حال زمیندار خاندان سے تھے مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر کے اس بستی میں اٹھ آئے تھے۔اپنی وفات تک کام میں منہمک رہے۔وقت آیا تو خاموشی سے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی تقسیم ملک کے بعد کے زمانہ میں اس نئی بستی کے اردگرد کے ماحول کی تربیت کا کام ان کے سپرد تھا اجنبی لوگوں میں گھل مل کر بیٹھ جاتے۔ان کی زبان میں ان سے گفتگو کرتے ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔دیکھتے دیکھتے نئے ماحول کی اجنبیت ختم ہوگئی لوگ انہیں اپنا جاننے اور سمجھنے لگے جیسے برسوں کے یارانے ہوں!

ایک بزرگ روئی بھرا لمبا چغہ (جسے دلی والے دگلہ کہتے ہیں) پہنے چلے آرہے ہیں۔سن شریف۔اسی سے

زیادہ ہوگا۔ لمبی سفید داڑھی ہے سر پر سبز رنگ کی پگڑی ہے۔ ہاتھ میں جریب نما لکڑی ہے۔ یہ بزرگ امریکہ اور دیار مغرب میں اسلام کا نام اونچا کر چکے ہیں۔ اب ضعیف ہو گئے ہیں مگر گھر میں بیٹھنا انہیں دو بھر ہے۔ نمازیں تو مسجد میں جا کر پڑھتے ہی ہیں صبح کی مشی ان کا معمول ہے۔ ان کی آواز میں بڑی ملائمت ہے۔ جوانی میں، اگر اپنے ملک میں ہوتے تو، شہر میں مستشرقین کے استقبال و مشایعت کا فرض انجام دیتے تھے۔ ہم نے ایک ہنگیرین مستشرق ڈاکٹر جولیس جرمانوش کی کتاب میں ان کا ۱۹۳۰ کا ایک فوٹو دیکھا جس میں یہ اپنے مرشد کے مزار پر دعا کرتے نظر آرہے ہیں۔ ہو بہو وہی قد و قامت اور سراپا ہے۔ اس مستشرق کو اس بستی کی دو ہی چیزیں یاد تھیں ان کے مرشد سے ملاقات اور ان کے ساتھ اس کی ملاقات۔ ہم نے انہیں بھی عجز و انکسار و فروتنی کا پیکر پایا۔ علم کے پھل سے لدے ہوئے درختوں کی طرح جھکے ہوئے!

یہ وہ لوگ تھے جنہیں ہم نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے زمانہ میں دیکھا اور سنا اور جن کی یادیں اب بھی آج بھی ذہن کو معطر رکھتی ہیں! ان میں سے اکثر کو ہم نے تقسیم ملک کے بعد اپنے نئے ماحول میں بھی چلتے پھرتے دیکھا مگر اب سڑک کے پار قبرستان کی جانب جانا ہو تو اس شہرِ خموشاں کا سناٹا بولتا اور ماضی کو آوازیں دیتا ہے۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں۔

(۲)

شہروں اور قصبوں میں آمد و رفت کے ذرائع اب تو بہت ہو گئے ہیں ایک زمانہ تھا کہ سوائے بیل گاڑیوں یا یکوں تانگوں کے اور کوئی وسیلۂ سفر میسر نہ تھا۔ غالب کے زمانہ تک یہ حال تھا کہ غالب نے کلکتہ تک کا اکثر سفر بیل گاڑی کے ذریعہ یا گھوڑے پر طے کیا تھا۔ اس زمانہ میں صاحبِ استطاعت لوگ گھوڑوں یا گھوڑا گاڑیوں میں سفر کرتے تھے عام لوگوں کی سواری یکہ تھا یا بیل گاڑی۔ گھوڑے جن گاڑیوں کو کھینچ سکتے تھے ان میں تنوع آتا چلا گیا۔ رتھوں اور بہلیوں کی جگہ یکوں یا اکوں نے لے لی۔ بات دور نکل جائے گی۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ جس بستی کے روشن جبینوں کا ذکر ہم نے کیا ہے، اس تک پہنچنے کے لئے ریل تو

بہت بعد میں آئی عام عوام وہاں تک پہنچنے کے لئے یکوں اور تانگوں میں بیٹھ کر جاتے تھے قریب ترین ریل کا سٹیشن بارہ میل کے فاصلہ پر تھا ۔عقیدت مند مرشد کی زیارت کے لئے آتے تو ریل انہیں بارہ میل پرے اتار دیتی وہاں سے آگے کا سفر تانگے یا یکے میں ہوتا یا پا پیادہ ۔ بارہ میل کا سفر، نہ کوئی سڑک نہ کوئی پختہ پگڈنڈی ،یکے والے اپنے اندازے سے سواری کو لے چلتے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا ! کچھ دور تک نہر کی پٹری ساتھ دیتی پھر وہی اونچا نیچا کھیتوں میں سے گذرتا ہوا راستہ ! مرشد کا بھی یہ عالم تھا کہ مہمان آتے تو بچھے جاتے ، رخصت ہوتے تو مشائعت کی غرض سے نہر کی پٹری تک ساتھ جاتے اور دعائیں دے کر رخصت کرتے کہ جاؤ اللہ کو سونپا۔

اس بستی کے عالموں کا ذکر آپ سن چکے وہاں کے یکہ بانوں میں بھی عجیب لوگ پیدا ہوئے ۔ایک صاحب تھے ۔حافظِ قرآن، ہاتھ پیر سے مضبوط ۔کوئی اور کام کرنے کی بجائے یکہ چلانے لگے۔ معمول یہ تھا کہ سواری بٹھاتے تو قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے۔ ہم نے اپنے ہوش میں انہیں یکہ بانی کرتے نہیں دیکھا کہ یہ کام وہ ترک کر چکے تھے اور زمیندارہ کا کام کرتے تھے وہاں بھی یہی عالم تھا کہ ہل جوتتے اور تلاوت کرتے رہتے ۔ بیلوں کو گالیوں کی بجائے دعائیں دیتے رہتے پھر وہ زمانہ بھی ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ قریب کے شہر تک جانے کی ضرورت ہوتی تو دوسروں کے یکہ میں نہ بیٹھتے ، پیدل چلتے یا گدھے کی سواری اختیار کرتے ۔ کہتے تھے میں یکوں میں اس لئے سوار نہیں ہوتا کہ یکہ بان اپنی روزی کمانے والے جانور کو کوستے اور گالیاں بکتے رہتے ہیں۔

اپنی ہوش میں ہم نے ایک تانگے والے کو دیکھا کہ گم سم اپنے تانگے پر بیٹھا رہتا ہے۔ سواری خود چل کر آئے تو آئے وہ کسی کو بلاتا نہیں۔ جو سواری مل گئی اس نے جو دے دیا سو لے لیا کبھی زیادہ کے لئے حجت نہیں کرتا۔ ہم نے سوچا خوب آدمی ہے ایسے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے چنانچہ ہمیں جب بھی تانگہ لینے کی ضرورت ہوتی اسی کو زحمت دیتے ۔ اسے بھی عام تانگے والوں کی طرح باتیں کرنے کا لپکا نہیں تھا خاموشی سے گھوڑے کو ہانکتا رہتا۔ کئی بار اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں کھلا ۔ایک بار ایک صاحب لاہور سے اپنی بچی کے جہیز کا زیور لے کر بس سے اترے ۔ یہی تانگہ موجود تھا اس میں بیٹھ گئے گھر میں اترے مگر زیور والا ڈبہ تانگہ میں بھول گئے ۔ تانگہ والا جا چکا تو انہیں یاد آیا کہ زیور تو تانگے ہی

میں رہ گیا۔ سٹی گم ہوگئی دیوانہ وار بسوں کے اڈہ کی طرف بھاگے۔ کچھ دور گئے ہوں گے کہ وہی تانگہ والا انہی کی جانب واپس آتا دکھائی دیا۔ انہیں دیکھ کر رکا اور بولا، یا حضرت آپ بھی کمال آدمی ہیں بھلا اتنا بھی کوئی لاپرواہوتا ہے کہ اپنا سامان بھی تانگے سے نہ اتارے۔ میں اڈہ پر واپس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آپ کی سیٹ پر کوئی چیز دھری رکھی ہے۔ وہ تو اللہ نے خیر کی کہ کوئی اور سواری ابھی تک نہیں بیٹھی اس لئے میری نگاہ پڑگئی اس لئے الٹے پیر واپس ہوا ہوں اپنی امانت لیجئے اور اللہ کا شکر کیجئے۔ انہوں نے لپک کر زیور کا ڈبہ لیا اور بے صبری سے کھول کر دیکھا۔ اس پر تانگہ والے نے کہا اچھی طرح جانچ لیجئے کہ آپ کی کوئی چیز ضائع تو نہیں ہوئی میں نے تو کھول کر بھی نہیں دیکھا کہ اس میں کیا ہے۔ انہوں نے اسے کچھ انعام دینا چاہا تو اس نے نہیں لیا۔ بہت مصر ہوئے تو اس نے کہا اچھا ایسی ہی بات ہے تو مسجد کے چندہ میں دے دیجئے میں اپنے ذاتی صرفہ کے لئے امانت داری کا انعام نہیں لے سکتا۔ ایسے ایمان دار بہت ہوتے ہیں کہ دوسروں کی امانت لوٹا دیں مگر ایسے کتنے ہیں کہ کوئی اپنی خوشی سے کچھ دے تو اسے مسجد کے چندہ کے طور پر دے دیں۔ ہوں گے۔ مگر یقیناً ''الشاذ کالمعدوم'' کے حکم میں ہوں گے۔ ہمارے آس پاس ایسے لوگ شاذ نہیں تھے بہت تھے۔

ایک صاحب کو دیکھا کہ ریلوے میں کسی ادنیٰ ملازمت پر ہیں اور لاہور میں تعیناتی ہے، جمعہ کے روز لاہور سے نوے میل دور اپنے مرشد کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کرنے باقاعدگی سے سفر کرتے ہیں کسی نے کہا کیا لاہور میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی؟ کہنے لگے ہوتی ہے مگر میرا مرشد تو یہاں رہتا ہے مجھے ریلوے کا مفت سفر کرنے کا پاس ملتا ہے، رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہوکر گاڑی میں بیٹھتا ہوں، صبح اپنے مرشد کے شہر میں پہنچ جاتا ہوں لنگر خانہ سے تبرک کھاتا ہوں جمعہ پڑھ کر واپس گاڑی پر بیٹھتا ہوں اور ڈیوٹی کے وقت واپس لاہور پہنچ جاتا ہوں۔ اب بتایئے میرا کیا حرج ہوتا ہے؟ مفت کا ثواب لیتا ہوں! یہ صاحب ریٹائر ہوئے تو اپنے بیوی بچوں سمیت اپنے مرشد کے شہر میں ڈیرے لگالئے۔ ہم نے بھی انہیں دیکھا، طبیعت کے نہایت مسکین، مزاج صوفیانہ، علم کا ذوق رکھنے والے، اپنے بیٹوں کو کالج کی تعلیم دلوائی اس ناطہ سے دونوں بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے۔ چھوٹا بیٹا کہ بڑا نغز گو شاعر تھا، کالج سے فارغ ہوا تو بنک میں ملازم ہوا اور ایک روز اپنی ڈیوٹی پر جاتا ہوا بس کے حادثہ میں شہید ہوگیا۔ ہم پرسے کے لئے حاضر

ہوئے تو باپ کا صبر دیکھ کر صبر جمیل کا مطلب سمجھ میں آیا۔ جزع فزع نہ بے صبری کا کوئی کلمہ! بوڑھا باپ کوہ وقار بنا بیٹھا تھا۔ دوسرے صاحبزادے سکول میں پڑھاتے اور علم بانٹتے ہیں۔ ان کے ابا کی وفات ہوئی تو ہم نے تعزیت کا خط لکھا جواب آیا کہ ہمارے ابا آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ ہم نے ان کی یاد کو یاد رکھا۔ آج ایسے غریب الطبع صالحین کا ذکر ہوا تو ان کا نام نامی سامنے آ گیا۔ اور لوگوں کی خوبیاں ہی تو یاد رہ جاتی ہیں!

اپنے سکول کالج کے زمانہ میں بعض ایسے کارکن دیکھے کہ حیرت ہوتی ہے وہ تھوڑے گزارے میں گذرا کیسے کرتے تھے؟ آمدن اتنی کم کہ آج کے دور میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا مگر وضع داری ایسی کہ مالی قربانیوں کے وقت سب سے آگے۔ ہمارے ایک استاد تھے، عربی فارسی کے منتہی، ادب کے عاشق، آمدن وہی جو ایک عام اوٹی کی ہو سکتی تھی مگر ہر مہینے اپنی تنخواہ کا چوتھا حصہ خدا کی راہ میں باقاعدگی سے دیتے تھے اور وصیت تھی کہ میرے ترکہ کا بھی چوتھا حصہ راہِ مولا میں صرف ہو۔ ان سے ایک رشتہ اور بھی تھا کہ ان کا بیٹا جو (پاکستان کی آڈٹ سروس کے سب سے اونچے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے) ہمارا کلاس فیلو تھا۔ اس طرح ان کے گھر میں آنا جانا تھا۔ ہمیں ان کے ہاں کسی تنگی کا احساس نہ ہوا شاید اس لئے بھی خود ہمارے ابا بھی اتنے ہی گذارے پر قانع تھے۔ دراصل وہ وقت ہی ایسا تھا کہ لوگ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے قربانیاں بھی کرتے تھے اس لئے دینے والا ان کے رزق میں برکت ڈال دیتا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ ایک بار ہماری کوئی چیز کسی رسالہ میں چھپی ہوئی دیکھی۔ راستہ میں مل گئے تو باہیں پھیلا کر ہمیں اپنے سینہ سے لگا لیا اور اپنی جیب سے اپنا بٹوہ نکال کر ہمیں دے دیا اور فرمایا میں اتنا خوش ہوں کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہیں دیتا ہوں۔ ہمیں اپنے ادب کے استاد کی یہ حوصلہ افزائی بہت خوش آئی اور آج تک یاد ہے۔ اس بٹوہ میں تو شاید صرف چار چھ آنے کی رقم تھی مگر اس رقم کے ساتھ جو پیار تھا وہ انمول تھا۔ ہمیں اللہ نے ایسے استاد دئے تھے۔ قبلہ شیخ منظور الہیٰ صاحب درِ دلکشا نے ایک بار ہمیں لکھا معلوم ہوتا ہے بچپن میں آپ کو اچھے استاد میسر آئے کہ آپ بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے انہیں یہی کہا ''جی الحمدللہ یہ سب استادوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ دو چار حرف لکھنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔ اور استاد بھی ایسے استاد! کہ دنیا انہیں دیکھ کر دنگ رہ جائے''۔ ان کی زندگی دست با کار اور دل بایار کا

نمونہ تھی فارغ وقت میں خالی نہ رہتے ذکرِ الٰہی کرتے رہتے۔ سکول سے فارغ ہوئے تو مسجد۔ ورنہ دینی کتب کا مطالعہ۔ کوئی نہ کوئی کتاب ہر وقت ان کے ہاتھ میں نظر آتی۔ ایسے استادوں کے تذکرے اب قصہ کہانیوں کی طرح رہ جائیں گے کیوں کہ قدریں بدل گئی ہیں۔ درس وتدریس اب کمائی کا ذریعہ بن گئی ہے اس لئے استادوں کے کہے میں برکت نہیں رہی۔ وہ استاد معدوم ہوئے جن کا فیض اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی سکھاتا تھا۔

انہی کی عمر کا ایک شیر فروش بھی یاد ہے۔ پٹھان۔ رعب داب والا آدمی۔ رزق کمانے کے لئے شیر فروشی کرتا تھا۔ سامنے بڑے کڑاہے میں دودھ پڑا ہے اس پر بالائی کی یہ موٹی تہ جمی ہوئی ہے۔ جس نے جتنا دودھ لیا اس کے حصہ کی بالائی علیحدہ سے اس کے دودھ کے اوپر ڈال دیتا ہے۔ اپنے وطن میں خوش حال آدمی تھا مگر مرشد کے قدموں میں رہنے کی آرزو اس جگہ کھینچ لائی ہے۔ کڑاہے کے پاس بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ گاہک آیا۔ اسے فارغ کیا پھر تلاوت میں مگن۔ بھلا ایسے نیک لوگ دودھ میں ملاوٹ کیوں کرنے لگے؟ سادگی کا عالم یہ ہے کہ ہمارے ابا کی روایت کے مطابق ایک صاحب آئے اور ان سے کہا کہ مجھے حکیم نے ایک دوا کھانے کو تجویز کی ہے مگر اس کا بالائی کے ساتھ کھانا ضروری ہے، بالائی دے دیجئے، کہنے لگے بالائی تو نہیں ہے۔ اس نے حجت کی کہ سامنے کڑاہا رکھا ہے اور اس پر بالائی کی یہ موٹی تہ ہے آپ کہتے ہیں بالائی نہیں ہے۔ کہنے لگے میاں یہ بالائی ان لوگوں کے لئے ہے جو دودھ لینے آتے ہیں کیوں کہ یہ انہی کے حصہ کے دودھ سے اتری ہے میں آپ کو دوسرے کے حصہ کی بالائی کیسے دے دوں؟ دیر تک حجت ہوتی رہی۔ فیصلہ اس بات پر ہوا کہ آپ کی مجبوری ہے کہ دوا کے لئے آپ کو بالائی چاہئے اس لئے میں بالائی تو دوں گا مگر اس بالائی کے پیسے نہیں لوں گا آپ وہ پیسے مسجد کے چندہ میں دے دیں۔ اسی بزرگ شیر فروش کو پاکستان میں بھی ہم نے دیکھا مگر اب شیر فروشی چھوڑ دی تھی ان کا کہنا تھا اب خالص دودھ کا خریدنا اور بیچنا ممکن ہی نہیں رہا اس لئے کون اپنی عاقبت خراب کرے۔

ایک عمر رسیدہ خاتون اس بستی کے گلی کوچوں میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پڑی پھرتی تھیں اور بلند آواز سے گاتی تھیں۔ فاطر العقل ہوں گی؟ نہیں جناب! اپنے ہوش وحواس میں ہیں، پوری ہوشمند۔ فلمی گیت گاتی ہوں گی؟ جی نہیں کان لگا کر سنئے نعتیں پڑھ رہی ہیں۔ یا بہ آوازِ بلند ذکرِ الٰہی کر رہی ہیں۔

بستی والے ان کا احترام روا رکھتے ہیں ۔ یہ دن چڑھے سفید صاف ستھرے کپڑے پہن کر اپنی روند پر نکل پڑتی ہیں ۔ تھک جائیں گی تو کسی گھر کے سامنے دم لینے کو رکیں گی ۔ گھر والی خاتون انہیں پانی وانی کا پوچھے گی، سادہ پانی تو قبول کر لیں گی مگر کوئی مشروب یا کھانے کی چیز نہیں لیں گی ۔ کھانے کا وقت ہو گا تو سیدھی لنگر خانے جائیں گی اور وہاں سے سیر ہو کر پھر صلِّ علیٰ نبیّنا صلّ علیٰ مُحمّد اس بزرگ خاتون کو ہم نے تقسیم کے بعد دیکھنا شروع کیا ۔ ان کا بیٹا ملک کا نامور صحافی تھا، بھلا سا نام تھا اس کا ہاں یاد آیا ضیاء الدین احمد سلہری، جو زیڈ اے سلہری کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا تھا ۔ ماں کی وفات ہوئی تو بھی اس بستی میں نہ آ سکا کہ ملک سے باہر تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے آخری دیدار سے بھی اسے محروم رکھا! ہاں اس کا پوتا ضرور آیا اور دادی کو مٹی دی ۔ یہ خاتون بڑی مستجاب الدعوات تھیں دوسروں کے حق میں ان کی دعائیں بڑی قبول ہوتی تھیں مگر اپنے بیٹے کے باب میں ان کی تضرعات نہ سنی گئیں ۔ یہ معاملہ تو سننے والے اور مانگنے والے کا اپنا معاملہ ہے ۔

ایک بزرگ اور بھی تھے جسے چاہتے راہ میں روک لیتے اور وہی بات کہتے جو عین اس کے دل میں ہوتی، سننے والا ہکا بکا انہیں دیکھتا ۔ فرماتے میں نجومی یا رمال نہیں ہوں اللہ کا ایک حقیر بندہ ہوں بس تم توبہ استغفار کا دامن پکڑو اور تقویٰ اختیار کرو میرا مقصد محض تنبیہ کرنا ہے کچھ مانگنا نہیں ۔ لوگ ان کی بھی بہت عزت کرتے تھے دعاؤں کی درخواست کرنے ان کے در پر جاتے تھے ان کا وطیرہ یہ تھا کہ کوئی اپنی مرضی سے بھی نذرانہ دیتا تو قبول نہ کرتے ۔ مشہور تھا کہ یہ بھی مستجاب الدعوات ہیں ۔ ہم نے انہیں گلیوں کوچوں بازاروں میں دیوانہ وار ذکر الٰہی کرتے دیکھا ۔ پیدل چلتے تھے ۔ اپنے گھر سے بہت دور اپنے مرشد کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے آتے تھے سردی ہو یا گرمی ان کے معمول میں فرق نہ آتا تھا فرق صرف اس روز آیا جس روز ان کی سناونی آئی!

پرانے تذکروں میں بعض اولیاء اللہ کے بارہ میں مذکور ہے کہ رزق کمانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے مگر بہ باطن ولی ہوتے تھے ۔ ہم نے ایک دو نہیں کئی اولیاء کو اپنے معاشرہ میں دیکھا ۔ گدھے پر بار برداری کا کام کر رہے ہیں، نماز کا وقت آیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں پہنچے ہوئے ہیں، نماز ختم کی پھر اپنے کام میں مصروف اور لبوں پر درود اور ذکر الٰہی ۔ دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود! جوتے

گانٹھ رہے ہیں مگر لب ذکرِ الہیٰ سے اور آنکھیں خشیتِ الہیٰ سے تر ہیں۔ جسمانی محنت مشققت کا کام کر رہے ہیں مگر اپنے دینی مشاغل سے غافل نہیں ہیں۔ لوگ باگ دور دور سے دعاؤں کی درخواست کرنے آتے ہیں۔ کریانے یا منیاری کی چھوٹی سی دکان ہے، نماز کا وقت ہوا تو سیدھے مسجد! پیسے کا گاہک ہے یا روپے کا، اب نماز ختم ہونے کا انتظار کرے۔ نماز کے وقت سارے شہر کے بازاروں میں کاروبار کا بند ہو جانا ہم نے اسی عجیب بستی میں دیکھا اور اس میں کسی جبر و اکراہ کا دخل نہیں۔ لوگ اپنے وقت پر نماز کے لئے خود اپنی دکان بڑھا دیتے ہیں۔

تقسیم سے پہلے کا ہمیں یاد ہے کہ بازار میں ہندو سکھ بھی تھے مگر وہ اونچے مینار سے نماز کا بلاوا سنتے تو اپنی دکانوں کے پردے گرا دیتے تھے۔ شہر کیا ہے اللہ والوں کا ڈیرہ ہے مگر یہ نہیں کہ صرف ان پڑھ یا کم کمین یہاں بستے ہیں۔ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے اور پی ایچ ڈی تک تعلیم یافتہ لوگ سب اس معاشرہ میں موجود ہیں مگر ان کی پہلی ترجیح دین کو دنیا پر مقدم کرنے کی ہے کہ اس بات کا عہد انہوں نے اپنے مرشد سے باندھا ہوا ہے۔

اب یہاں یورپ اور شمالی امریکہ کے دنیادار معاشرہ میں ویسی بے نفسی، بے لوثی اور نیک طبعی کو ڈھونڈتا ہوں تو آنکھیں ناکام لوٹتی ہیں۔ کہاں گیا وہ زمانہ کہاں گئے وہ لوگ؟ اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔

رشتۂ مودّت

اللہ کے کچھ نیک بندوں کا ذکر آپ سن چکے مگر بات یہیں تک نہیں رہتی آگے بھی چلتی ہے۔ ان بستیوں میں جن کا ذکر ہم نے کیا، لوگوں کا آنا جانا بہت تھا، کوئی زیارت کے لئے آتا تھا کوئی تحقیقِ حق کے لئے آتا تھا۔ مرشد کا عالم یہ تھا کہ ہر آنے والے کی راہ میں آنکھیں بچھاتے، مہمانداری کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مہمان میرے بلائے سے تو آئے نہیں خدا نے بھیجے ہیں ورنہ میں تو غریب و بیکس و گمنام و بے ہنر ہوں لوگ اسی کے بھیجے ہوئے آتے ہیں اس لئے ان کی مہمانداری فرض جان کر کرتا ہوں۔ اس مہمانداری کی روایت نے اس مرشد کے ماننے والوں میں مہمانداری کی ایک عظیم الشان روایت کی بنیاد رکھ دی جو اب ایک تناور درخت بن چکی ہے۔

آنے والوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ایک بار آئے تو پھر پاؤں توڑ کر یہیں بیٹھ رہے۔ ایک مرید باصفا ایسے تھے کہ اپنی حکمت اور طبابت کے بل بوتے پر بادشاہوں کے درباروں تک رسائی رکھتے تھے۔ مرشد سے ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا اب تو آپ یہیں رہیں گے نا؟ اس شخص نے جس نے اپنے وطن مین اپنے نئے مکان کی نیو اٹھا رکھی تھی، پیچھے کہلا بھیجا کہ اب تعمیر ملتوی کر دو ہمیں مرشد کی جانب سے واپسی کا اذن نہیں ملا۔ مکان کی تعمیر ملتوی ہوئی، پھر ارشاد ہوا کہ آپ علمی ذوق کے آدمی ہیں اس جگہ آپ کو کتابوں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہوگی اپنا کتب خانہ منگوالیں، چنانچہ کتب خانہ آ گیا۔ پھر دونوں بیویاں آگئیں۔ اس باوفا نے پھر بھول کر بھی اپنے وطن کو یاد نہیں کیا۔ وہی بستی ان کا وطن بن گئی اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ہم نے ان کا مزار مبارک دیکھا ہے۔ اپنے مرشد کے پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں۔

ایک وہ لوگ تھے جو آتے تھے کہ اپنی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھیں جس نے اس زمانہ کا مرشد ہونے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ لوگ آتے، مہمانخانہ میں ٹھہرتے، اپنے مرشد کی اقتداء میں نمازیں پڑھتے، ان کے ملفوظات سنتے، ان کے اردگرد بیٹھنے اٹھنے والوں کو دیکھتے۔ اکثر لوگ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتے، کچھ ایسے بھی ہوتے کہ عہد بیعت باندھ کر واپس پہنچتے تو وطن میں ایک طوفانِ بلا ان کا منتظر ہوتا۔ ایسے ہی ایک نجیب الطرفین سید بزرگ کابل کی سرزمین سے اس چھوٹے سے قصبہ میں وارد ہوئے۔ بیعت سے

مشرف ہوئے۔ رخصت ہوئے تو مرشد نہر تک مشایعت کی غرض سے آئے۔ جانے والا بار بار مرشد کے چہرے کی طرف دیکھتا اور کہتا تھا شاید یہ مبارک چہرہ مجھے دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہی ہوا۔ اپنے وطن واپس پہنچے تو طوق وسلاسل کو منتظر پایا۔ لوگ کشاں کشاں انہیں بادشاہ وقت کے پاس لے گئے کہ مرتد ہو گیا ہے، کفر کو گلے لگا کر واپس آیا ہے۔ علماء سوء نے کافر وزندیق قرار دیا۔ بادشاہ وقت نے کہ ان کے خاندان کا معتقد تھا بہت سمجھایا کہ توبہ کرلیں اور اپنے عہدِ بیعت کو توڑ لیں۔ اس نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہدایت پانے کے بعد پھر ضلالت کی جانب لوٹ آؤں؟ علماء نے فتویٰ دیا کہ ایسے کافر کی سزا یہ ہے کہ سرِ بازار سنگسار کیا جائے۔ بادشاہ وقت کے حکم کے موافق ان کی ناک چھید کر اس میں نکیل ڈال دی گئی اور اسی نکیل کے ساتھ کھینچتے ہوئے مقتل میں لے گئے۔ لعنت ملامت کرتا ہوا تماشائیوں کا ہجوم ہمراہ گیا۔ کمر تک زمین میں گاڑ دیئے گئے۔ بادشاہ نے آخری بار پھر پوچھا کیا اب بھی توبہ کرتے ہو؟ جواب ملا ہدایت سے توبہ؟ اس چار دن کی زندگی کی خاطر؟ تم جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو، میں اپنے عہد بیعت سے منحرف ہونے کا نہیں۔ مکفر علماء نے بادشاہ سے کہا پہلا پتھر آپ چلائیں۔ بادشاہ نے کہا فتویٰ دینے والے آپ ہیں آپ ہی پہل بھی کریں اس پر اس معصوم پر پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ سنگسار کر دینے کے بعد ان کا بغض ٹھنڈا ہوا۔ لاش چار دن تک وہیں پتھروں میں گڑی رہی۔ پانچویں دن ان کے ایک معتقد نے لاش وہاں سے نکالی اور دفن کی۔ شہید کی لاش سے شہادت کی خوشبو آتی رہی۔ مرشد کو اپنے اس باوفا مرید کی قربانی کی اطلاع ملی تو بہت آزردہ ہوئے مگر اس کے اہلِ وطن کو انتباہ بھی کیا کہ اے کابل کی سرزمین تو خدا کی نگاہوں سے گر گئی۔ اور یہ بھی کہ شہید کا خوں رائیگاں نہیں جائے گا۔ اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ رائیگاں نہیں گیا۔ کابل کی سرزمین زبانِ حال سے مرشد کی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ”کوئی لطیف ہے ان پتھروں میں سویا ہوا“۔

یہ تو ان جاں نثاروں کا احوال تھا جو دین کے ہو رہے یا اپنی جان کا نذرانہ دے بیٹھے۔ مگر دراصل ذکر اس چھوٹی سی بستی کے مہمانوں کا تھا۔ ایک بار رات کے وقت ایک مہمان دور کی منزلیں مارتا اس بستی میں پہنچا۔ مرشد کو معلوم ہوا کہ کوئی مہمان وارد ہوا ہے۔ کھانے پینے کا اہتمام کر چکے تو معلوم ہوا کہ چارپائیاں اور بچھونے تو پہلے سے موجود مہمانوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ مرشد نے لالٹین جلائی، ایک مزدور کو جگا کر بلایا،

ان بنی چارپائی اس کے حوالے کی کہ لو میاں جلدی جلدی ہاتھ کے ہاتھ اسے بن دو۔ خود لالٹین ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوگئے کہ کسی اور کو کیوں تکلیف دیں، ادھر مہمان کو چارپائی ملنے میں توقف ہوا تو اس نے مہمان خانہ میں جھانکا کہ اس توقف کا سبب کیا ہے؟ دیکھا کہ اس کا مرشد لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور کھٹ بنے سے کہہ رہا ہے میاں ذرا تیز ہاتھ چلاؤ مہمان کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چارپائی بنی گئ مہمان کو دے دی گئی اور یہ سب کچھ یوں ہوا گویا کچھ ہوا ہی نہیں، بستی میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ رات مرشد نے ایک نو وارد مہمان کی مہمانداری میں کیا زحمت اٹھائی ہے۔ ایک مہمان کے بارہ میں رات گئے معلوم ہوا کہ زمیں دار طبقہ سے متعلق ہیں اور رات کو سونے سے قبل دودھ پینے کی عادت ہے۔ مرشد اسی وقت اٹھے کسی خادم کو جگانے کی بجائے خود ایک گلاس دودھ کا بھرا اور مہمان کو جا کر دیا اور معذرت کی کہ آپ کی اس عادت کا علم پہلے نہ تھا اس لئے آپ کی خدمت میں دودھ پیش نہ کیا جاسکا۔ یہ تو اس وقت کی باتیں ہیں جب اس بستی کو اور بستی والے مرشد کو دنیا جانتی نہ تھی، پھر تو وہ رجوع خلائق ہوا کہ مہمان بھی بہت ہو گئے خدمت کرنے والے ان سے زیادہ میسر آ گئے۔ اس بستی میں دسمبر کے مہینہ میں ایک سالانہ جلسہ ہوتا تھا اس میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سالانہ جلسے میں حاضر ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ لاکھوں لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست کرنا کوئی آسان کام نہیں مگر ہوتا تھا، مشکلیں ہوتی تھیں مگر آسان ہوتی چلی جاتی تھیں۔ ایک بار کی بات ہمیں یاد ہے۔ جلسہ پر لاکھوں مہمان حاضر تھے، ان کا کھانا تیار کرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں نانبائی درکار ہوتے ہیں، کسی دشمن نے خدا جانے ان نانبائیوں کے کان میں کیا پھونک دیا کہ ان میں سے آدھے لوگ ہڑتال کر کے بیٹھ گئے کہ ہم روٹیاں نہیں پکائیں گے۔ منتظمین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ اب کیا ہوگا؟ نانبائی روٹی پکانے سے انکاری ہیں ادھر صبح کاذب کا وقت ہوا چاہتا ہے اب تک نصف سے زیادہ چولھے اور تنور روشن نہیں ہوئے صبح ہاہا کار مچ جائے گی۔ مہمان کیا کریں گے؟ ہزاروں پر نہیں لاکھوں پر نوبت ہے، کیا بنے گا؟ ڈرتے ڈرتے مرشد کو خبر کی کہ یہ مسئلہ درپیش ہے۔ لاکھوں مہمانوں کے لئے صبح دم روٹی مہیا کرنا ممکن ہی نہیں۔ مرشد نے پوچھا ایک ایک روٹی مہیا کر سکتے ہو؟ منتظمین نے کہا جی ایک ایک روٹی تو مہیا کی جاسکتی ہے۔ مرشد کی جانب سے اعلان ہوا کہ آج کوئی مہمان ایک سے زیادہ روٹی طلب نہ کرے

۔مہمانوں نے ایک ایک روٹی کھائی اور جلسہ سننے کے لئے چل پڑے۔ کچھ بھی نہیں ہوا، شام کے کھانے سے پہلے پہلے نانبائیوں کا مسئلہ حل ہوگیا۔ سب کام اپنے معمول کے مطابق ہونے لگے۔ یہ ابتلا آیا اور گذر گیا۔ ہم ایک قیام گاہ میں مہمانوں کی مہمان نوازی پر متعین تھے۔ اس فرودگاہ میں پنجاب کے اس علاقہ کے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے جو دس دس بیس بیس روٹیاں تو بغیر ڈکار لئے کھا جاتے ہیں، اس روز صبح ہم نے دیکھا کہ ایک مہمان مہمان نوازی پر مستعد بچوں پر ناراض ہو رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا کیا ہوا؟ فرمانے لگے امام کا حکم ہے ایک روٹی کھاؤ اور یہ بچہ مجھے دو روٹیاں دے کر میرے ایمان کو آزما رہا ہے! جہاں مہمان نواز ایسے تھے وہاں مہمان بھی ان سے کم نہیں تھے۔

مہمان نوازی کا ذکر ہؤا تو ایک بزرگ یاد آئے جو فیصل آباد کے کسی دور دراز کے علاقہ سے سائیکل پر آیا کرتے تھے۔ بوڑھے آدمی تھے اپنی ہی ہم عمر سائیکل پر آتے تھے، پنجاب میں دسمبر کے مہینہ میں خاصی سردی پڑتی ہے، مگر وہ ایک کمبل اوڑھ کر سائیکل پر بیٹھ جاتے اور چل میرے سائیکل بسم اللہ کہہ کر روانہ ہو جاتے۔ بستی میں وارد ہوتے تو سیدھے وہاں تشریف لاتے جہاں ان کے علاقہ کے لوگ قیام کرتے تھے اتفاق سے کئی برس ہمیں اس علاقہ کے مہمانوں کی مہمان داری کا شرف ملا۔ ہم نے کہا آپ اس سردی میں اتنی دور سے سائیکل پر آتے ہیں! فرمانے لگے دور سے؟ تمہارا کیا مطلب ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے مجھے دور جانا پڑتا تھا۔ اب تو اللہ میاں مرکز اور مرشد کے ڈیرہ کو کھینچ کر میرے پاس لے آیا ہے۔ فیصل آباد کون سا دور ہے یہی تین چار دن کا سفر ہے بیس دنوں کا سفر تو نہیں! یہ لوگ اپنے مرشد کی باتیں سننے کو آتے تھے۔ سارا وقت جلسہ میں بیٹھے رہتے۔ اس بستی میں لہو ولعب تو ویسے بھی نہیں ہوتا تھا مگر جلسہ کے دنوں میں تو اس بستی میں روحانی رونقیں بہت ہوتی تھیں۔ درس ہے، تہجد ہے، نمازیں ہیں، جدھر نکل جاؤ اللہ رسول کا ذکر اذکار ہے۔ مگر مولویوں کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ جب تک اس جلسہ پر پابندی نہیں لگوا لی انہیں چین نہیں آیا۔ اب کے برس اس تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے جرمنی میں جمع ہوئے۔ پچاس ہزار لوگ تھے۔ یورپ والوں کے لئے یہ عجوبہ تھا کہ لوگ دور دراز سے محض اپنے مرشد کو سننے کے لئے کھچے آرہے ہیں اور جرمنی کے مقامی لوگ عجیب محبت کے ساتھ ان کی خدمت پر مستعد ہیں، مہمانوں کو اپنے گھروں میں ٹھہرا رہے ہیں ان کے کھانے پینے کے سفر حضر کے ذمہ دار ہیں۔ ان لوگوں کا آپس میں کیا

رشتہ ہے؟ جرمنی میں تو باپ بھی اپنے بیٹے کو اپنے گھر میں بصد انکسار ٹھہرنے کی اجازت دیتا ہے یہ کون لوگ ہیں جن کی روایتیں ایسی مہمان نوازی کی اجازت دیتی ہیں؟ جرمنی کے ایک سفیر ہمارے دوست ہیں انہیں باور ہی نہیں آتا کہ پچاس ہزار مہمانوں کو مفت قیام و طعام کی سہولت مہیا کی گئی۔ ہم نے کہا میاں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ جاؤ اور جا کر کسی مہمان سے پوچھ لو کہ اس نے اپنے قیام و طعام کے لئے اپنے میزبان کو کیا ادائیگی کی ہے؟ وہ بھی پکے اور کھرے جرمن ہیں۔ ہم سے چھپ کر ایک دو لوگوں سے پوچھ بیٹھے جب لوگوں نے ان کو بتایا کہ لاکھوں مہمانوں کی مہمان داری کرنا ہماری روایت ہے تب انہیں یقین آیا۔ ورنہ ہماری باتوں کو باور کرنے پر وہ تیار نہیں تھے۔

ہمیں اپنے قیام جاپان کی بات یاد آئی۔ ٹوکیو سے ہمارے جاپان کے امام نے ہمیں بتایا کہ جاپان کی کسی کمپنی نے ڈنمارک کی کسی کمپنی سے مشینری منگوائی ہے اس مشینری کو لگانے کے لئے ایک ہمارے ہم مسلک مسلمان انجینئر آئے ہوئے ہیں وہ اوساکا کی سیر کے لئے آنا چاہتے ہیں کیا آپ انہیں وقت دے سکیں گے؟ ہم نے کہا چشمِ ما روشن دلِ ما شاد! بسم اللہ تشریف لائیں۔ قدم نما و فرود آ کہ خانہ خانہء تست۔ وہ یورپ کے رہنے والے ہم جنوبی ایشیا کے باشندے! ایک دوسرے کو دیکھا ہے نہ جانتے ہیں۔ وہ تشریف لائے ہم ریلوے سٹیشن پر انہیں لینے کو حاضر تھے۔ ایک ''السلام علیکم'' کی آواز ابھری اور ساری اجنبیت ختم ہوگئی۔ عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام! ہم لوگ ایسے ٹوٹ کر ملے جیسے برسوں سے آشنا ہیں۔ اگلے روز ہم نے اپنے جاپانی رفقاء کار کو اپنے مہمان سے ملانے کے لئے اپنے گھر پر مدعو کر رکھا تھا ساتھ میں ہماری یونیورسٹی کے ڈینش زبان کے اساتذہ بھی مدعو تھے۔ سب لوگ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے رہے کہ آپ کس رشتہء اخوت میں منسلک ہیں؟ ہم نے انہیں سمجھایا کہ یہ رشتہ دنیا کے باقی رشتوں سے زیادہ پائیدار ہے۔ اسی طرح ایک بار پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام جاپان میں کیوتو کے مقام پر ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ ہم نے انہیں اپنی یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دی وہ تشریف لائے۔ اب پھر ہمارے رفقاء کو حیران ہونے کا موقع ملا کہ کہاں فزکس کا ایک نابغہ اور کہاں ادب کا ایک ادنیٰ استاد! دونوں میں کیا قدرِ مشترک ہے کہ ایک دوسرے کو یوں جانتے پہچانتے ہیں اور وہ نابغہء روزگار شخص جس سے ملاقات کا موقعہ حاصل کرنے کے لئے لوگ سالوں انتظار کھینچتے ہیں اس شخص کی

دعوت پر بلا تکلف کھنچا چلا آیا ہے ۔وہ موقع ہماری یونیورسٹی کے لئے واقعی یادگار موقع تھا۔ جب پروفیسر سلام کو نوبل پرائز ملا تو ہمیں مبارکباد کا جو پہلا خط جاپان سے آیا وہ ہمارے انہی وائس چانسلر صاحب کا تھا یہ محبت کے رشتے یونہی قائم نہیں ہو جاتے ان کے پس پردہ کسی مرشد کی قوت قدسی کارفرما ہوتی ہے۔ اور سارے رشتے سارے تعلق اس تعلق کے آگے ہیچ ہو جاتے ہیں۔

مودت کا وہ رشتہ جو مرشد نے اپنے نمونہ سے اپنی جماعت کے اندر قائم کیا تھا اب بھی اسی طرح استوار ہے اور مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ اچھی روایتیں یونہی قائم ودائم رہتی ہیں

خدا کے کچھ متوکل بندے

میں اپنی بستی کے روشن جبینوں کا ذکر کر رہا ہوں تو بار بار ان کے خوارق میرے سامنے آتے ہیں یعنی ان کی حیاتِ مبارکہ کے ایسے واقعات جو عام زندگی میں وقوع پذیر ہوتے نظر نہیں آتے۔ ان لوگوں کا اپنے خدا سے ایسا پختہ تعلق تھا کہ ان کا خدا بھی ان کے ساتھ ویسا ہی پیار کا سلوک روا رکھتا تھا۔ ہمارا معاشرہ بہ حیثیت قوم خوارق اور معجزات سے مایوس ہو چکا ہے اور اس مایوسی کی وجہ سے ہم اپنے مالک و خالق کو بھی اپنے جیسا مجبور و مقہور اور گونگا بہرا سمجھنے لگے ہیں حالانکہ وہ بولتا بھی ہے سنتا بھی ہے۔ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ! کہ پکارنے والے مجھے پکاریں تو میں جواب دیتا ہوں۔

ان اللہ والوں کے ہاں توکل الی اللہ کی ایک صفت مشترک تھی، جسے دیکھا متوکل اور مطمئن پایا۔ ایک وجود کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی تو سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہ نکال پائے کہ اس شخص کو توکل کا جو مرتبہ حاصل تھا وہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اپنے مطب میں بیٹھے ہیں، مرشد اپنے مستقر سے باہر دہلی میں ہیں۔ حکم آتا ہے کہ ”فوراً دہلی پہنچیں“۔ وہیں اور اسی وقت اٹھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تک نہیں کہ اندر گھر والوں کو اطلاع ہی کر دیں کہ مرشد کی طرف سے طلبی ہوئی ہے اس لئے دہلی جا رہا ہوں۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ جیب میں زادِ راہ بھی ہے یا نہیں؟ لباس کی، بستر کی ضرورت ہوگی۔ اتنا سوچنا تو دور کی بات تھی جوتا پہننے کی طرف بھی توجہ نہیں چلتے جاتے ہیں اور پاؤں سے اپنا جوتا سیدھا کرتے اور پہنتے جاتے ہیں۔ بارہ میل کا سفر طے کر کے ریل کے سٹیشن تک پہنچے تو ایک شخص کو منتظر پایا اس نے کہا میرے گھر سے بیمار ہیں انہیں دیکھ لیجئے۔ فرمایا میں رک نہیں سکتا۔ اس نے کہا ابھی گاڑی کے آنے میں کچھ دیر ہے اتنی دیر میں آپ دیکھ سکتے ہیں میرا گھر قریب ہی ہے۔ گئے۔ مریضہ کو دیکھا نسخہ لکھ دیا۔ اس نے کچھ رقم بہ طور نذرانہ جیب میں ڈال دی ٹکٹ لینے لگے تو اتنی ہی رقم تھی جتنی انہیں ٹکٹ کے لئے درکار تھی۔ اتنے میں ان کا خادم ان کا سامان سفر لے کر پہنچ گیا ورنہ یہ تو اسی بے سروسامانی کے عالم میں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

ان کے توکل کا عجیب ترین واقعہ وہ ہے جو انہیں ایک ریاست میں پیش آیا۔ مہاراجہ کے درباری معالج تھے اپنی داد و دہش اور صدقہ و خیرات کی عادت کی وجہ سے ایک بنئے کے تقریباً ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کے

مقروض تھے۔ایک دوسرا بنیا جوان کا مریض بھی تھا انہیں ''سمجھایا'' کرتا تھا کہ بھگوان کی راہ میں خرچ کرنا اچھی بات ہے مگر کچھ اندوختہ بھی ہونا چاہئے کیونکہ ریاست کی نوکری ہے اور ویسے بھی آپ کے بہت سے لوگ دشمن ہیں جانے کیا لگائی بجھائی کریں۔آپ سنتے اور مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔آخر وہی ہوا۔ دشمنوں کا وار چل گیا اور مہاراجہ نے انہیں اچانک ایک روز فارغ کر دیا۔آپ اطمینان سے گھر آئے اور واپسی کے سفر کی تیاری کرنے لگے حالانکہ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔وہ دوسرا بنیا خیر خواہ بن کر آیا اور کہنے لگا اسی دن کے لئے میں آپ کو متنبہ کیا کرتا تھا اب آپ اتنا قرضہ کیسے ادا کریں گے اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کئے بغیر آپ کو یہاں سے جانے کون دے گا؟ اتنے میں مہارانی کا کارندہ کچھ رقم لے کر آیا کہ مہارانی نے بھیجی ہے۔کرایہ کی رقم کا تو اللہ نے انتظام کر دیا۔ابھی وہ بنیا وہیں حاضر تھا کہ اس قرض خواہ بنیے کا کارندہ آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضرت مجھے اپنے مالک کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ آپ کو سفر حضر میں جتنی بھی رقم کی ضرورت ہو وہ حاضر کروں فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔وہ بنیا خاموش بیٹھا یہ سارے ''تماشے'' دیکھتا رہا۔آخر اس سے رہا نہ گیا کہنے لگا یہ بھگوان کے معاملے بھی عجیب ہیں انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ہم کسی کے مقروض ہوں تو قرض خواہ جان عذاب میں کر دیتا ہے اور ایک یہ ہیں کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے مقروض ہیں اور قرض دینے والا مزید روپیہ پیش کر رہا ہے۔ غرض حکیم صاحب بڑی عزت آبرو اور اطمینان کے ساتھ ریاست کو چھوڑ کر اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔ہم نے حضرت حکیم صاحب کی تصویر دیکھی ہے ان کی آنکھوں میں توکل کی عجیب کیفیت نظر آتی ہے ان کی خود نوشت سوانح حیات ''مرقاۃ الیقین'' ایسے خوارق سے بھری پڑی ہے۔

ایک بزرگ ہیں جنہیں ہم نے اپنی ہوش میں بڑے قریب سے دیکھا۔وہی جو توکل علی اللہ، پا پیادہ مصر کے سفر پر نکل پڑے تھے۔ان کی عام زندگی بھی عجیب متوکلانہ زندگی تھی۔دست با کار دل بایار! ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے۔اپنے مرشد کی ایک تصنیف منیف کا عربی میں ترجمہ کر رہے تھے، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یہی دھن سوار رہتی کہ اس کام کو مکمل کر لیں۔اپنے مرشد کے طریق کی پیروی میں چلتے ہوئے لکھتے تھے۔ان کے مرشد کا طریق یہ تھا کہ ایک دوات کمرہ کے ایک کونہ میں اور دوسری دوات دوسرے کونہ میں رکھ لیتے اور قلم کو روشنائی میں تر کر کے لکھتے لکھتے دوسری جانب روانہ ہو جاتے، وہاں

پہنچتے تو قلم کو روشنائی میں ڈبو لیتے اس طرح چلتے چلتے لکھتے تھے۔ان بزرگ کو بھی ہم نے اسی طرح لکھتے دیکھا مگران کا خط اتنا پاکیزہ تھا جیسے موتی پر دئے ہوں۔عربی رسم الخط میں لکھنے کی عادت پختہ ہوگئی تھی۔ مصر میں اپنے مرشد کی مطلوبہ کتاب کو نقل کرتے کرتے یہ عادت راسخ ہوگئی۔پاکستان بننے کے بعد تک ان کا ترجمہ کا کام جاری تھا۔کتاب کے صفحات کو علیحدہ کر کے ہر صفحہ کے ساتھ ایک سادہ کاغذ جوڑ لیتے اور اس پر ترجمہ لکھتے جاتے،کانٹ چھانٹ کرتے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔پانچ حصوں کی اس ضخیم کتاب کا ترجمہ کر کے دم لیا۔ترجمہ ہو چکا تو یوں لگتا تھا اسی ترجمہ کے انتظار میں جی رہے تھے ادھر فارغ ہوئے ادھر بلاوا آ گیا۔ہم نے ان کی وفات پر شہر بھر کو روتے دیکھا۔زندگی میں ہم نے انہیں کبھی روپیہ پیسہ کا ذکر یا حساب کرتے نہیں دیکھا۔جب گذارہ ملتا رومال میں لپیٹ کر لیتے اور اسی طرح اپنی اہلیہ کو دے دیتے۔ ملتان کے ایک رئیس ان سے حدیث کا درس لیا کرتے تھے ایک بار وہ انہیں ملنے کو آئے اور جاتے ہوئے علیحدہ بلا کر ایک لفافہ ہمیں دیا کہ جا کر اپنی پھوپھی جی کی خدمت میں پیش کر دوں۔پھوپھی جی نے وہ خط کھولا تو اس میں نذرانہ کی کچھ رقم تھی ساتھ میں دعا کی درخواست۔یعنی انہیں استغنا بھی اتنا تھا کہ کسی سے نذرانہ لینا بھی انہیں کھلتا تھا۔

ایک بزرگ تھے لاہور میں کسی کے ہاں مقیم ہوئے۔واپسی کا عزم کیا تو میزبان مصر ہوا کہ کچھ دیر مزید ٹھہریں۔مگر یہ واپسی کا عزم کر چکے تھے نہ رکے۔ان کا سامان میزبان کی تحویل میں تھا اس نے روک لیا۔ یہ اپنے ساتھی کے ہمراہ چل پڑے اور پیدل چلتے چلتے مرید کے پہنچ گئے۔آدھی رات کے وقت پہنچے ایک مسجد میں قیام کیا۔بھوک سے برا حال تھا۔اس وقت کون ان کو پوچھتا؟اس پر طرہ یہ کہ ساتھی کو تیز بخار نے آلیا۔ایک اور آزمائش کھڑی ہوگئی۔وضو کر کے اللہ کے حضور کھڑے ہو گئے کہ وہی شافی اور کافی اور قریب ہے۔نماز ختم کی تو دروازہ پر دستک ہوئی۔دروازہ کھولا تو ایک شخص تازہ تیار شدہ کھانے کا تھال لئے کھڑا تھا کہ لیجئے اور تناول فرمائیے۔ پوچھا برتنوں کا کیا ہوگا کہنے لگا یہیں رکھ دیجئے گا میں بعد میں لے لوں گا، دونوں مسافروں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ایک مسافر اور بھی موجود تھا اس کو بھی کھانا نہیں ملا تھا اس نے بھی سیر ہو کر کھایا۔ساتھی کی بھوک رفع ہوئی تو بخار بھی اتر گیا۔ فارغ ہو کر برتن ایک طرف رکھ دئے۔صبح نماز کے لئے اٹھے تو دیکھا کہ مسجد کا دروازہ اندر سے بند ہے اور برتن وہاں موجود نہیں ہیں۔

انہی بزرگ کا بیٹا بیمار ہوا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ بخار ہے کہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ بیوی نے کہا ڈاکٹر کو بلائیں ورنہ بچہ چٹ پٹ ہو جائے گا۔ کہنے لگے اس وقت ایک ڈاکٹر قریب ترین ہے اسی کو بلا سکتا ہوں اور بلاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وضو کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور اس وقت سلام پھیرا جب بچے نے خود آواز دے کر ان سے پانی طلب کیا سلام پھیرا تو بچہ ٹھیک ٹھاک بیٹھا کھیل رہا تھا اور بیماری کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اسی طرح ایک بار گھر سے کہیں دور سفر پر تھے ان کے ایک اور بچہ کو ٹائیفائیڈ ہو گیا اور ۲۹ دن تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آنکھیں متورم ہو گئیں حتیٰ کہ ان میں پیپ پڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا اول تو بچہ کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ بچ بھی گیا تو آنکھیں تو ضائع ہو ہی جائیں گی۔ بذریعہ تار انہیں واپس آنے کی ہدایت کی گئی۔ آئے۔ بچہ کو دیکھا۔ دل میں درد پیدا ہوا۔ آستانہء الہٰی پر جھک گئے۔ کمرہ بند کر کے دیر تک گڑگڑاتے رہے آخر اللہ تعالیٰ نے تسلی دی۔ کمرہ کھول کر باہر آئے تو بچہ کا بخار جا چکا تھا ڈاکٹر تو بچے کی آنکھوں سے مایوس ہو ہی چکے تھے اس لئے اپنے نسخہ سے بچہ کی آنکھوں کا علاج شروع کیا اس کی آنکھیں صاف ہو گئیں۔ ان بزرگ کے یہ صاحبزادہ ہمارے دوست تھے۔ ہم نے انہیں دیکھا ہے ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ نظر بھی بہت تیز تھی۔ اس کی وجہ ان بزرگ کی خود نوشت سوانح حیات ''حیات قدسی'' پڑھنے پر معلوم ہوئی۔ ہمارے یہ دوست اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ باپ کی طرح متوکل اور دعا گو۔

ایک گاؤں کے بڑے زمیندار سے ملنے گئے۔ اس نے ان کے مرشد کی شان میں بہت نازیبا کلمات کہے آپ نے اسے ٹوکا کہ اللہ والوں کے باب میں ایسا نازیبا کلام مناسب نہیں ہوتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی بڑی غیرت ہوتی ہے۔ اس پر وہ زمیندار بہت برافروختہ ہوا اور ان سے بدتمیزی سے پیش آیا کہنے لگا میں بڑا زمیندار ہوں اتنی زمین میری ملکیت ہے کیا تم اور تمہارا مرشد میری زمین چھین لو گے؟ آپ وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بزرگ لاہور میں اپنے ایک ہم عقیدہ وکیل کے ہاں بیٹھے تھے کہ دیکھا وہی زمیندار وہاں پھٹے حالوں اس وکیل سے استمداد کے لئے سائلوں میں بیٹھا ہے۔ انہیں دیکھا تو لپک کر ان کے پاس آیا اور بتایا کہ وہ زمین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور اب مقدموں میں پھنسا ہوا ذلیل ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے اس کے لئے دعا کریں کہ اسے ان مصیبتوں سے نجات ملے۔ تب

اسے یاد آیا ہوگا کہ اس نے ان کے مرشد کی شان میں جو گستاخی کی تھی اس کے سارے ابتلا اس کے نتیجہ میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کے مرشد کو اللہ تعالیٰ نے بشارت دی تھی کہ جو تمہاری اعانت کرے گا میں اس کی اعانت کروں گا اور جو تمہاری اہانت کے در پے ہوگا میں اس کو اہانت سے دوچار کروں گا۔ ہم نے اس بزرگ کی حیات قدسی میں بہت سے واقعات اہانت کی وعید کے بارہ میں پڑھے ہیں۔ اور خود ہمارے اپنے تجربہ میں بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ جو کوئی بھی، اس مرشد کی اہانت کے در پے ہؤا، خود اہانت کا شکار ہوا۔ اِنّی مُہِینٌ مَن اَرادَ اِہانَتَکَ! بھلا جن لوگوں نے اپنے خدا کے ایسے خوارق دیکھے ہوں وہ اپنے خدا کی قدرتوں پر توکل کیوں نہ کریں؟

سرخ رومال والا صوفی

ہم جن بستیوں کو یاد کر رہے ہیں وہاں بڑے بڑے نابغے رہتے تھے، دیکھنے میں سیدھے سادے ۔ عاجزی انکساری اور فروتنی کے پیکر مگر باطن میں علم کا سمندر ۔کسی علمی مسئلہ پر گفتگو کیجئے تو معلوم ہو کہ دانائی اور حکمت کا بحرِ ذخار ہیں ۔ہم ایک دو بزرگوں کا اشارۃً ذکر کر چکے ہیں مگر آج جس پیکرِ علم و عرفان کا ذکر کرنا مقصود ہے وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے ۔ادیب ایسے کہ اہلِ زبان ان کے سامنے پانی بھریں، سیرت نویسی پر وہ عبور کہ ان کی لکھی ہوئی ''سیرۃ خاتم النبییّن'' سے زیادہ مستند اور کوئی سیرۃ نہ سمجھی گئی کیونکہ سیرۃ کی اس کتاب کا ماخذ قرآن ہے، ام الکتاب ! تاریخ نویسی میں فرد ۔غرض صاحبِ اسلوب، صاحبِ طرز انشا پرداز تھے ۔اس ایک شخصیت میں بے شمار صفات یکجا ہو گئی تھیں ۔علوم ظاہری کی تحصیل میں بہ ظاہر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے عربی میں ایم اے کیا تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فٹ بال بھی کھیلا تھا مگر مبدءِ فیض سے انہیں دانش اور علم و حکمت کے خزانے عطا ہوئے تھے ۔چہرے پر وہ تمکنت اور دبدبہ کہ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے زہرے آب ہوں مگر طبیعت میں وہ فروتنی اور گفتگو میں وہ عاجزی اور اپنائیت کہ ان سے ہمکلام ہونے والے کو اجنبیت کا ذرا سا بھی احساس نہ ہو ۔جس بستی میں رہتے تھے اس کے مالکوں میں سے تھے مگر ان کی وضع قطع چال ڈھال سے بالکل محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کون ہیں ۔ ایک وضع داری البتہ ہم نے دیکھی کہ سرخ رومال گلے میں لپیٹتے تھے ۔کوٹ ہے تو کوٹ کی جیب میں سرخ رومال موجود ہے ۔ یہ سرخ رومال ٹوپی کے ساتھ بھی ہم نے دیکھا پگڑی کے ساتھ بھی ہم نے دیکھا یہ رومال ان کے لباس کا جزو لاینفک تھا ۔اس کی لم ہمیں معلوم ہے نہ ہمیں ہمت ہوئی کہ ان سے پوچھ ہی لیتے ۔تقسیم سے قبل ہم نے انہیں دور سے دیکھا تھا ۔سٹیج کے آدمی نہیں تھے ان کا میدان قلم تھا ۔کتابیں البتہ ان کی اس وقت دیکھی تھیں ۔ تقسیم کے بعد ہم جس بستی میں اٹھ آئے وہاں یہ وجود باجود بھی موجود تھا ۔ اب پگڑی اوڑھتے تھے ۔پھر ہماری خوش نصیبی کہ ہمیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ مل گیا ۔پہلے روز کام پر حاضر ہوئے تو سرسری طور سے ہمارے مشاغل کے بارہ میں پوچھا ۔جب ہم نے بتایا کہ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا ۔اپنے بعض مضامین ہمیں امتحان کے طور پر لکھوائے اور پھر پڑھوا کر

سنے۔اس طرح ہمیں دہرا فائدہ ہوا لکھنے میں قلم رواں ہو گیا اور پڑھنے میں الفاظ کے لہجہ کی پہچان کا سلیقہ آ گیا۔

ان کا اپنا عالم یہ تھا کہ جب تک کسی لفظ کے مفاہیم و مطالب کے بارہ میں پورا یقین نہ ہو تا وہ لفظ استعمال نہ کرتے۔لکھنے میں بہت احتیاط کرتے تھے فرماتے تھے جو لفظ جس طرح چھپ جاتا ہے وہ آئندہ نسلوں کے لئے سند بن جاتا ہے۔بعد میں کوئی اس بات کی تحقیق نہیں کرتا کہ لکھنے والے نے کس سیاق و سباق میں یا قرینہ میں وہ لفظ استعمال کیا تھا۔ہمیں اپنی بعد کی زندگی میں اس نکتہ نے بہت فائدہ دیا۔

پھر یہ بات بھی ہم نے اسی بزرگ سے سیکھی کہ جس لفظ کے بارہ میں ذرا سا بھی شبہ ہو فوراً لغت دیکھو۔ جب تک اس کے معین معانی کے باب میں یقین نہ ہو وہ لفظ استعمال نہ کرو۔ہم اس بات پر حتی الوسع عمل کرتے رہے۔ہمارے طلباء اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ کلاس میں بھی اگر کسی لفظ کے معانی کے بارہ میں ہمیں شبہ ہوا تو ہم نے اپنے بچوں سے برملا کہہ دیا کہ ہمیں اس لفظ کے معانی کے بارہ میں وثوق نہیں لغت دیکھنے کے بعد دوبارہ اس لفظ کے بارہ میں بتائیں گے۔یہ احتیاط ہم نے انہیں بزرگ سے سیکھی اور یہ ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ قلم پکڑنے کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں احتیاط اور غنا دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔یہی دو صفات ہیں جو انسان کو درویش بناتی ہیں۔اسی لئے قیام پاکستان کے بعد انہیں درویشوں کے کام کی نگرانی سونپی گئی۔ان ۳۱۳ درویشوں کے کام کی نگرانی جو ہماری بستی میں اپنے مرشد کے در پر دھونی رما کر بیٹھ گئے تھے۔ان درویشوں کے اہل و عیال، ماں باپ، عزیز و اقارب پاکستان میں تھے وہاں وہ لوگ بتیس دانتوں میں زبان کی طرح بیٹھے تھے۔مجبور اور محصور۔ہم نے اس بزرگ کو دیکھا کہ دن رات ان کے غم میں گھل رہے ہیں۔اگر وہ درویش حالتِ خوف میں تھے تو یہاں ان کے مفادات کا نگہبان بھی حالتِ امن میں نہیں تھا۔ اگر درویشوں کے کسی عزیز کے بارہ میں خبر ملتی کہ اسے فلاں تکلیف درپیش ہے تو جب تک اس کے ازالہ کے لئے پوری پیش بندی نہ کر لیتے انہیں کسی کل چین نہ پڑتا۔ہجرت کے بعد سب لوگ ہی مہاجرت کے مصائب کا شکار تھے۔ہر خاندان مصائب کا مقابلہ کر رہا تھا مگر یہ بزرگ تو تین سو تیرہ خاندانوں کے مسائل کا سامنا کر رہے تھے۔جب ہم نے ان کے ساتھ خدمت شروع کی اس وقت ہجرت پر کافی عرصہ

گذر چکا تھا مصائب کی شدت کم ہوگئی تھی مگر اس بوجھ نے ان کی اپنی صحت پر بڑا برا اثر ڈالا تھا۔ ان کے لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں فرق آگیا تھا مگر اس کے باوجود اتنا لکھتے پڑھتے تھے کہ ہم نوجوانوں کو رشک آتا تھا بھلا کوئی شخص اپنے ہر فارغ لمحہ کو کتاب کے مطالعہ میں صرف کرسکتا ہے؟ یہ بزرگ کرتے تھے۔ اگر پڑھ نہیں رہے ہوتے تھے تو لکھ رہے ہوتے تھے۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی تھی کہ آپ نے کچھ مضامین ہمیں لکھوائے ورنہ ان کا کام تو کئی جلدوں پر محیط ہے۔

ان کے گھر میں ہمیشہ دو تین یتیم اور بے آسرا بچے پرورش پاتے تھے۔ یہ انہیں اپنے بچوں کی طرح پالتے پوستے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے تھے۔ غریب پروری ان کا شیوہ تھا۔ شہر کے بیمار، نادار، یتامیٰ، مساکین، ضرورت کے وقت انہیں کی طرف دوڑتے تھے اور مایوس نہیں لوٹتے تھے۔ اس بات کا تجربہ ہمیں اس عرصہ میں ہوا جب ہم ان کے ساتھ خدمت کر رہے تھے۔ ایسے سفید پوش، جو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے مشکل وقت میں ان کے پاس آتے اور یہ بزرگ ان کی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے ہوئے ان کی دست گیری کرتے۔ ان میں سے کئی لوگوں کی اولادوں کو ہم جانتے ہیں کہ اب ماشاء اللہ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ اس نیکی کے اخفاء میں انہیں اس قدر غلو تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے پاتی تھی۔ ہم تو اسی کام پر مامور تھے کہ رقوم کا ریکارڈ رکھیں اس لئے ہمیں تو پتہ چل جاتا تھا مگر ہدایت یہ تھی کہ بھول کر بھی کسی ضرورت مند محتاج کا نام زبان پر نہ آنے پائے۔ حساب میں اتنے محتاط کہ ایک بار پانچ روپے کی ایک رقم کا دوبارہ اندراج ہوگیا۔ اس پر باقاعدہ ایک کمیشن بٹھا کر تحقیقات کروائی کہ ایسا کیوں ہوا؟

علو مرتبت کے باوجود عالم یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد میں جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے لوگوں کے کاندھوں کے اوپر سے پھلانگ کر جانا انہیں بہت کھلتا تھا۔ مرشد قصبہ میں موجود نہ ہوتے تو انہیں امارت سونپ کر جاتے مگر یہ خطبوں کے لئے یا نمازوں کی امامت کے لئے دوسرے علما کو نامزد کردیتے۔ اپنی جائے نماز ساتھ رکھتے جہاں جگہ مل گئی مصلیٰ بچھا لیتے اور بیٹھ جاتے، خطبہ کو غور سے سنتے، نمازیں توجہ سے پڑھتے۔ لوگ باگ لپک لپک کر ان سے مصافحہ کرتے اور یہ سب سے مصافحہ کرتے اور دعائیں دیتے جاتے مگر مصافحہ کرنے کے لئے رکتے نہیں تھے۔ چلتے چلتے ہاتھ ملاتے تھے اور لوگ ان کے ہاتھ

کے لمس کو ہی بہت جانتے تھے۔ نمود سے بہت گھبراتے تھے۔ جمعہ کا دن بظاہر چھٹی کا دن سمجھا جاتا تھا مگر یہ جمعہ کی نماز سے فارغ ہوتے ہی اپنا کام لے بیٹھتے دفتر کی ڈاک دیکھتے، تصنیف کا کوئی کام جاری ہوتا تو اس میں مصروف ہو جاتے، غرض ان کی زندگی کام سے عبارت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں ہماری اس نئی بستی کے کالے ننگے پہاڑ بھٹی کی طرح تپنے لگتے ان کے گھر کا رخ ایسا تھا کہ دھوپ سیدھی ان کے برآمدہ میں اترتی تھی، اس پر چقیں ڈال دیتے مگر اس سے روشنی تو رک جاتی تمازت کہاں رکتی؟ اس لئے اپنے کمرہ میں پانی کا ٹب رکھوا لیتے اس ٹب میں برف کا ایک ڈلا تیرتا رہتا، اوپر بجلی کا سقفی پنکھا ہلکی رفتار سے چلتا رہتا اس طرح کچھ سکون میسر آ جاتا مگر گرمی کی حدت الامان والحفیظ! اب ہم انیس کی طرح یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ''بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر'' مگر پہلے مصرعہ کی ہم عینی گواہی دے سکتے ہیں کہ ''گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر''۔ اس اضطراب کے باوجود ان کا کام جاری رہتا۔ ایک بار ہم نے گرمی کا شکوہ کیا تو فرمایا میاں ہمارے مرشد نے اس زمانہ میں اسی (۸۰) تصنیفات مکمل کی تھیں جب بجلی تو دور کی بات ہے گرمی سے بچاؤ کے دوسرے مروجہ سامان بھی میسر نہ تھے اس لئے ہمیں شکوہ کرنا زیب نہیں دیتا۔ ہمیں تو سقفی پنکھا، برف اور چقیں میسر ہیں۔ ہمارے مرشد تو ہاتھ سے پنکھا جھلا کرتے تھے۔ اتنا کہتے کہتے آواز گلوگیر ہو گئی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اسی کمرہ میں ان کے بڑے بیٹے نے جو بہت بڑے سرکاری افسر تھے اپنے ابا کی آسائش کے لئے ائرکنڈیشنر لگوا دیا۔ کام میں انہماک اسی طرح جاری رہا یہ نہیں کہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں نیند کے جھونکے آنے لگے ہوں۔ وہ آسائش بھی ان کی زندگی میں نہیں ان کے کام میں سہولت میسر کرنے کا باعث بنی۔ بعد کو اسی بزرگ نے بتایا کہ اللہ کا حکم ہے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو اور یہ بھی تو اللہ کی نعمت ہی ہے کہ اس نے بیٹے کے دل میں باپ کی خدمت کرنے کی تحریک پیدا کی! کیسے شکر گزار لوگ تھے اور اللہ کی نعمتوں کا کیسے کیسے طریق سے شکر ادا کرتے تھے اسی لئے تو اللہ کا سلوک بھی ان لوگوں کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ وہ جو ارشاد ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا شکر گذار نہیں بنتا وہ اللہ کا شکر گذار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس روز اس کی معنویت سمجھ میں آئی۔ بزرگوں کی صحبت میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حکمت کی نئی نئی باتیں سیکھتا رہتا ہے۔ ہم نے اس بزرگ کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ سیکھا۔

ایک عجیب بات ہم نے ان کے بارہ میں پڑھی۔ ان کے خسر ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے۔ ان کے ہاں آ کر رہتے تو یہ کبھی ان سے عقیدہ کے بارہ میں گفتگو نہ کرتے۔ پھر انہیں بھی ان کے مرشد کے ہاتھ پر بیعت ہونے کی توفیق مل گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے بھول کر بھی کبھی ان سے تبدیلیٔ عقیدہ کا نہیں کہا تھا وہ میرے اور میرے گھر والوں کے عمل کو دیکھتے رہے جب انہیں یقین ہو گیا کہ عقیدہ کے اختلاف کے باوجود ہم ان کا پورا احترام روا رکھتے ہیں تو وہ خود ہمارے مرشد کی اطاعت کے زمرہ میں آ گئے۔ ان کی طبیعت کی اس صفت کا اندازہ ہمیں اس دور میں بھی ہوا کہ ان کے گورنمنٹ کالج کے زمانہ کے دوست اور ساتھی جو ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے انہیں ملنے کو آتے تو اکرام ضیف کے طور پر ان کی خوب خدمت کرتے مگر بھول کر بھی عقیدہ کا ذکر درمیان میں نہ لاتے مبادا مہمان یہ سمجھیں کہ اکرام ضیف میں کوئی غرض شامل ہے۔

اختلاف عقائد کے باوجود وہ حقدار کو اس کا حق دینا جانتے تھے، حمید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت کا انتقال ہوا تو ان کی حق گوئی اور بیباکی کے بارہ میں اک زوردار شذرہ اخبار میں لکھ کر شائع کروایا۔ پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ملنے کو تشریف لائے تو کسی نے تعارف کروایا کہ یہ مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں تو لپک کر ان کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا پھر تو آپ سے ہمارا دوہرا رشتہ ہے! اور یہ دوہرا رشتہ اس لئے کہ ظفر علی خاں ان کے مسلک کے مخالف تھے۔ یہ بزرگ لوگ اپنی مثال آپ تھے ان کی زندگیاں ہزاروں لوگوں کے لئے مشعل راہ تھیں لوگ ان کا نمونہ دیکھ کر اپنی زندگی کی ڈگر بدل لیتے تھے ۔ یہ اس زمانہ کے صوفیاء تھے جو دنیا میں رہ کر بھی دنیا میں ملوث نہیں ہوتے تھے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای۔ نیز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش! کہ ہمیں دریا کی گہرائی کے درمیان تختہ بند کر کے چھوڑ دیا ہے اور اب کہتے ہو کہ ہشیار دامن تر نہ ہونے پائے! یہ انہی ہشیار لوگوں میں سے تھے جن کا دامن دنیا میں رہنے کے باوجود دنیا سے آلودہ نہیں ہوتا اور ہماری خوش نصیبی کہ ہمیں ان کے ساتھ کچھ دیر کام کرنے اور ان کی خدمت کرنے کا موقعہ میسر آیا۔

مددگار کارکن

بعض الفاظ کسی ماحول کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس ماحول سے ہٹ کر استعمال میں آئیں تو لوگوں پر ان کے معانی واضح نہیں ہوتے حالانکہ الفاظ میں کوئی ہیر پھیر یا گنجلک نہیں ہوتی یہی حال سیاق وسباق کا ہے اور علمِ معانی والوں نے الفاظ کی صحیح روح کو سمجھنے کے لئے سیاق وسباق پر بہت زور دیا ہے یہ باتیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض الفاظ جماعتِ احمدیہ کے ماحول کے ساتھ مخصوص ہیں اور دوسروں کے سامنے وہ الفاظ استعمال ہوں تو دوسرے ان لفظوں کو سمجھنے کے باوجود ان کی معنویت سے آشنا نہیں ہو پاتے ایسے دو لفظ ہیں ''وقارِ عمل'' اور ''مددگار کارکن''۔ ہمیں یاد ہے کالج کے ایک مباحثہ میں ہمارے دوست منور احمد نمی نے جو قائدِ حزبِ اختلاف تھے قائدِ ایوان کے ساتھیوں کو قائدِ ایوان کے مددگار کارکن کہہ کر مخاطب کیا تو سارا ہال بے حال ہو گیا مگر باہر سے آئے ہوئے مقررین بتر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بات صرف اتنی تھی کہ ربوہ کے ماحول میں مددگار کارکن کا لفظ ایک خاص معنویت کا حامل تھا جس معنویت سے باہر والے آشنا نہیں تھے۔ اسی طرح وقارِ عمل کا لفظی ترجمہ ہے عمل کا احترام یا عمل کرنے کا اعزاز۔ مگر جماعت احمدیہ کے ماحول میں یہ ایک اصطلاح ہے جو اجتماعی خدمت خلق کے لئے استعمال ہوتی ہے ہاتھ سے کام کرنا۔ محنت کا کام کرنے میں عار محسوس نہ کرنا۔ خلقِ خدا کی خدمت کے لئے جسمانی مشقت سے بھی گریز نہ کرنا۔ وہ جو ذوق نے کہا ہے ''نام مطلوب ہے گر فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا' چاہ بنا 'مسجد و تالاب بنا'' یہ ساری باتیں جماعت کی اصطلاح میں ایک دو لفظی ترکیب میں سمٹ کر آ گئی ہیں وہ اصطلاح ہے ''وقارِ عمل'' اور حقیقت یہ ہے کہ جماعت احمدیہ میں خدمت خلق ایک بنیادی عمل ہے دوسرے ایسے عمل کرتے ہیں نہ وقارِ عمل کے معنوں ہی کو سمجھ پاتے ہیں۔ اس مضمون کا اصل نکتہ تو ''مددگار کارکن'' ہیں۔ ایسے مددگار کارکنان جنہوں نے اپنی زندگیاں سلسلہ کے لئے وقف رکھیں اور تا دمِ آخر خدمت پر مستعد رہے۔ مددگار کارکن کی اصطلاح حضرت مصلح موعود (خدا آپ سے راضی ہو) کی وضع کردہ ہے کہ ادنیٰ خدمت پر مامور ہونے والے کارکنوں کو احساسِ کمتری نہ ہو۔ یہاں سویڈن میں رہ کر احساس ہو رہا ہے کہ ان لوگوں نے شاید یہ جذبہ جماعت احمدیہ سے سیکھا ہے۔ یہاں ہر کام کرنے والا برابر ہے کوئی کسی

سے کمتر یا برتر نہیں۔ ہم نے اپنی یونیورسٹی کے شعبہ میں صفائی کرنے والے کارکن کو صدر شعبہ کے دوش بدوش ایک ہی میز پر بیٹھے کھانا کھاتے دیکھا ہے پاکستان میں یا دوسرے اسلامی ممالک میں ایسی برابری یا رواداری کہاں؟ ہاں ربوہ میں ہم نے ناظروں اور مددگار کارکنوں کو ایک ہی صف میں بیٹھ کر کھانا کھاتے دیکھا ہوا ہے۔ ہم اس مضمون میں انجمن کے بعض مددگار کارکنوں اور ان کے اخلاص کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی انجمن کی کلرکی کے دوران بیت المال کے کارکن سرفراز خاں سے ہماری دوستی ہوگئی۔ سرفراز خاں اونچے لمبے قد کے چھریرے بدن کے آدمی تھے پنجابی بھی وہی پٹھانوں والی بولتے تھے۔ نسوار کے بھی رسیا تھے۔ ہم نے انہیں ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک ڈاک لے جاتے دیکھا ہے۔ ان کی نسوار ان کی مستعدی پر ذرا اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ یہاں سویڈن میں سویڈ لوگوں کو جگہ بجگہ نسوار تھوکتے دیکھتے ہیں تو سرفراز خاں کی نفاست یاد آتی ہے کہ نسوار تھوکنے کو گناہِ کبیرہ جانتے تھے۔ کچے کوارٹروں کی بات ہے۔ حافظ غلام محی الدین کے چائے خانہ میں چائے پیتے ہوئے سرفراز خاں کو دیکھا حضرت مولوی مصلح الدین راجیکی ایک بنچ پر اکڑوں بیٹھے تھے ان سے مؤدب فاصلے پر سرفراز خاں بیٹھے تھے۔ حافظ صاحب نے کوئی بات کی تو سرفراز خاں کہنے لگے حافظ صاحب ''یہ بزرگوں کی اولاد سامنے بیٹھی ہے بس انہیں کو دیکھنے سننے کے لئے بیٹھا ہوں''۔ سرفراز خاں کی یہ بات ہمیں بہت اچھی لگی بالکل اکل کھرا چٹا ان پڑھ پٹھان مگر بزرگوں کی اولاد کا یہ احترام کہ پہروں سامنے بیٹھ کر انہیں دیکھتے رہنا۔ جس زمانہ کی یہ بات ہے سرفراز خاں کی عمر پچاس پچپن برس تو ضرور رہی ہوگی۔ اس کے بعد ہم نے انہیں مدتوں خدمت پر مستعد دیکھا۔ سر پر صافہ لپیٹتے تھے ایک سفید چادر کی بکل مار لیتے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاید بکل انہوں نے مولوی مصلح الدین صاحب کے تتبع میں اختیار کی ہو۔ واللہ اعلم۔ ہمیں سرفراز خاں کی اس ایک بات کے علاوہ اور کوئی بات یاد بھی نہیں مگر یہی ایک بات کیا کم ہے؟ پھر ہم نے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے مددگار کارکن بشیر کو دیکھا۔ بشیر شاید انجمن کا کارکن نہیں تھا حضرت میاں صاحب کا ذاتی خدمتگار تھا مگر دفتر کی ڈاک گھر لے جانے اور گھر سے دفتر کی ڈاک واپس لانے کا کام اس کے سپرد تھا بھاری بھر کم جسم۔ پاؤں میں ہوائی چپل۔ بشیر دفتر آتا تو سب سے ہاتھ ملاتا اور مدتوں بعد جب تک وہ جیا جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوا بشیر نے لپک کر ہاتھ ملانے میں ہمیشہ پہل کی۔ اس شخص کی باتوں میں حضرت میاں صاحب کی

صحبت میں رہ کر اتنی ملائمت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی شخص کے لئے اسے نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ بشیر نام کا ایک اور مددگار کارکن دفتر الفضل میں بھی تھا جو تنویر صاحب یعنی روشن دین تنویر ایڈیٹر الفضل کا حد سے زیادہ خدمت گذار تھا اور تنویر صاحب اس کے ناز اٹھاتے تھے۔ وہی تنویر صاحب کے گھر کا سودا سلف لاتا۔ ڈاک لاتا ان کا حقہ بھرتا غرض ہر لحاظ سے خدمت کرتا تھا۔ ہم نے بشیر کو جوانی سے بال سفید ہو جانے تک تنویر صاحب کی خدمت پر مستعد دیکھا تنویر صاحب کہا کرتے تھے اگر کوئی ''دھوپ میں بال سفید کر لینے'' کے محاورہ کی عملی تصویر دیکھنا چاہے تو ہمارے بشیر کو دیکھے''۔

کالج کا مددگار کارکن بابا شادی تو اپنی ذات میں انجمن تھا۔ زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا۔ اتنا مخلص۔ اتنا مستعد۔ اتنا جاں نثار۔ دھن کا پورا۔ کام کا پکا۔ آدمی کیا تھا مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی پن چکی تھی:

نہر پر چل رہی ہے پن چکی۔ دھن کی پوری، ہے کام کی پکی

شادی اور کالج لازم وملزوم تھے۔ دونوں ایک دوسرے میں یوں مدغم تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں تھا شادی دو چار دن کے لئے بھی کہیں کالج سے باہر چلا جاتا تو کالج کی فضا سونی سونی لگتی تھی۔ وہ سٹاف اور طلبا میں یکساں مقبول تھا۔ خدا جانے کس مٹی کا بنا ہؤا تھا ہم نے کیا کسی نے بھی اسے تھکتے نہیں دیکھا۔ دن رات مستعد۔ دن میں کالج کی مددگار کارکنی رات میں کالج کی چوکیداری۔ اس کی چوکیداری کا یہ عالم تھا کہ ہم نے رات کے اوقات میں بھی اسے کم ہی سوتے دیکھا یا غافل پایا۔ وہ اساتذہ اور طلبا کو ان کی چال سے پہچان لیا کرتا تھا اور اس کی یہ پہچان کبھی غلط نہیں ہوئی۔ ہم دو سال کالج کے ہوسٹل میں بھی رہے۔ رات کو دیر سے ہاسٹل واپس آتے تو شادی کو چوکنا پاتے۔ وہ بغیر دیکھے اپنے لحاف کے اندر سے ہی ہمیں نام لے کر پکارتا اور کہتا کہاں سے آ رہے ہو؟ طلبا میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پچھلے برس جرمنی میں کالج کے ایک پرانے طالب علم کے ہاں شادی کا ذکر آ گیا۔ وہ اٹھا اندر گیا اور اپنے البم میں سے شادی کے دو فوٹو نکال لایا کہ یہ دیکھیں شادی کی تصویر۔ کون کہتا ہے وہ مر گیا وہ ہمارے دلوں میں زندہ ہے۔ ہمارے ساتھ اس کی دوستی کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے شادی کے ہاتھوں میں کھیل کر کالج کی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر اس کے سامنے ہی کالج کے سٹاف پر ہماری

تعیناتی ہوئی تھی۔ شادی اس تعلق پر بہت خوش تھا۔ ایک دو بار بعض لوگوں نے کہا بھی کہ یہ تم کیا اس کے لئے ہر وقت چائے ڈھوتے رہتے ہو؟ کہنے لگا یہ میری آنکھوں کے سامنے اسی کالج میں پڑھا اور اسی کالج میں پروفیسر بنا ہے اس لئے مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ شادی کی محبت تھی ہم بھی حتی الوسع اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے مگر خدا شاہد ہے کہ شادی نے ہماری خدمت کے عوض کبھی کسی معاوضہ کی توقع نہیں رکھی۔ اتنا بے لوث اور اتنا بے نفس آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔ مدتوں بعد گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ایک بہشتی ہماری خدمت پر مستعد ہوا۔ وہ ہمارے لئے بڑے دور سے ڈھو کر پینے کا پانی لاتا تھا۔ ایک بار ہم نے اسے انعام کے طور پر کچھ پیسے دینا چاہے تو اس نے انکار کر دیا کہنے لگا'' پانی پلانے کے پیسے لوں''؟۔ ہمیں اس کی یہ ادا بہت بھائی۔ یونہی خیال آیا کہ اس کے طور اطوار احمدیوں والے ہیں یقیناً احمدی ہوگا جو خوفِ فسادِ خلق سے خاموش ہے اور ہمارا اندازہ درست نکلا۔ جس روز ملاؤں کی شہ پر کالج کے بعض لوگوں نے (ہمارے طلبا و طالبات نے نہیں) ہمارے خلاف احمدی ہونے کی وجہ سے ہنگامہ برپا کیا وہ چپکا کھڑا دیکھتا رہا جب امی جمی ہوگئی تو ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا'' سر جی حضور کو دعا کے لئے لکھیں تو مجھے نہ بھولیں '' خدا معلوم اب وہ کس حال میں ہے؟ ریٹائر ہو گیا ہوگا۔ بات شادی سے چلی تو اس بہشتی کی طرف مڑ گئی کیونکہ اس کا نام بھی شادی تھا۔ شاید شادی نام کے سارے کارکن ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی کا کالج میں رعب داب بھی بہت تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سب لوگ اس کے خلوص کے گرویدہ تھے ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثالث خلافت پر فائز ہونے سے کچھ ہی عرصہ قبل کئی دنوں بلکہ مہینوں تک کالج میں تشریف نہ لا سکے کیونکہ ان کے کندھوں پر انجمن اور جماعت کے دیگر اداروں کا بوجھ تھا۔ ایک روز ذرا سی فرصت ملی تو کالج تشریف لائے۔ گاڑی کاریڈور میں کھڑی کی اور دفتر میں جانے کے لئے بڑھے۔ شادی نے دیکھا تو تو دور سے ہی آوازہ لگایا'' بسم اللہ بسم اللہ'' اج فوجاں کدھر بھل پیاں نیں؟'' یعنی آپ آج بھول کر کدھر نکل آئے ہیں؟ یہ شادی ہی کا جگرا تھا۔ حضرت صاحب نے مسکرا کر شادی کی طرف دیکھا اور دفتر میں چلے گئے۔ خلافت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد حضرت صاحب کالج تشریف لائے۔ سارا سٹاف استقبال کے لئے ایستادہ تھا شادی بھی ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ جب سٹاف سے مصافحہ کر چکے تو شادی نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا '' حضور صاحب جی ایک عرض کروں؟''۔ حضرت صاحب نے

فرمایاہاں شادی کہو کہنے لگا ’’بس اتنی ہی عرض ہے کہ مرجاؤں تو یہیں کہیں کالج ہی میں توپ تاپ دینا باہر نہ پھینکنا‘‘۔ شادی نے اتنے خلوص سے یہ بات کہی کہ سب کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔کالج قومیایا گیا۔ شادی نے خدمت جاری رکھی مگر ریٹائرمنٹ کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے کسی عزیز کو ملنے کے لئے سرگودھا کے قریب کسی گاؤں میں گیاوہاں موت نے آلیا۔کسی نے اس کی خبر بھی کالج والوں کونہیں دی۔ شادی بے چارہ اجنبی زمین میں پیوندِ خاک ہوگیا ہمیں یقین ہے کہ شادی کالج میں مرتا تو کالج سے باہر نہ دفنایا جاتا۔مگر شادی مرا کہاں ہے؟ کالج کے اساتذہ اور طالبعلموں کے دلوں میں زندہ ہے۔

اب ایک اور مددگار کارکن باباشریف۔اصلاح وارشاد کے دفتر میں مددگار کارکن تھے وہاں سے ریٹائر ہوئے تو مسجد مبارک میں خادم مسجد کے طور پر کام سنبھالا۔ جہاں ملتے بڑے پیار سے ملتے تھے۔ پرائیویٹ سکرٹری کے دفتر کے دومددگار کارکن یاد ہیں مگران کے نام یادنہیں۔دن رات خدمت پر مستعد مگر خوش۔ ہمارے ابا کے دفتر کے مددگار کارکن یعقوب تھے۔ہمارے اباجی مرحوم گھر میں ہمیشہ ایک دودھیل بھینس پالتے تھے۔ یعقوب دن میں دفتر کا کام کرتا اور شام کو بھینس کا چارہ کاٹ کرلاتا اس محنت کے اسے الگ سے پیسے دیے جاتے۔عیالدار آدمی تھادن رات کی محنت سے بمشکل بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اباجی مرحوم ہمیشہ اس سے سلوک کرتے رہتے تھے۔ہمارے گھر میں اکثر گاؤں کے مہمان آتے رہتے تھے جو گھی، گڑ، ’مکئی کے بھٹے‘ گنے لاتے رہتے تھےان تمام تحفوں میں سے یعقوب کا حصہ پہلے اور الگ سے نکلتا تھا۔ہمیں یاد ہے اباجی کی وفات کے بعد بھی یعقوب ہمارے گھر کا کام کرتا رہااور ہماری امی پابندی کے ساتھ اس کا معاوضہ اوراس کے حصے کے تحفے اسے دیتی رہیں۔ہم سب بہن بھائیوں کوسختی سے تاکید تھی کہ یعقوب کے ساتھ ہمیشہ ادب واحترام سے پیش آیا جائے۔اس باب میں اباجی مرحوم کسی کا کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے اب بھی ہم اور ہماری اولادیں سب یعقوب کا اسی طرح احترام کرتے ہیں۔

دو مددگار کارکن ایسے تھے جن کی اولادوں کو اللہ تعالی نے علم کی دولت عطا کی ایک تو ہمارے چوہدری محمد رمضان صاحب تھے جو تبشیر کے دفتر میں مددگار کارکن تھے مگران کی اولاد میں سے ماسٹر محمد اعظم مرحوم نے بہت نیک نامی کمائی۔ ماسٹر صاحب اپنے طلباء میں بہت مقبول تھے ان کا جواں عمری ہی میں انتقال ہوا تو

ربوہ میں ان کا بہت سوگ منایا گیا۔ دوسرے بیٹے برادرم پروفیسر محمد ارشد نے فزکس میں ایم ایس سی کیا اور ہماری طرح ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر ربوہ کالج میں تعینات ہوئے وہیں سے افریقہ کے کسی ملک میں تشریف لے گئے آجکل ربوہ میں آباد ہیں اور الفضل انٹرنیشنل میں خوب خوب مضمون لکھ رہے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ نے کینیڈا میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور ہم نے لوگوں سے ان کی بہت تعریف سنی ہے ہماری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ سب ان کے دادا کی خدمتگزاریوں کے صلے ہیں۔ اللھم زدفزد۔ دوسرے مددگار کارکن بابا غلام محمد تھے آپ مددگار تو نہیں تھے بہشتی مقبرہ میں گورکن تھے۔ ان کا بیٹا سلیم ہمارا کلاس فیلو تھا۔ اسے کالج کی تعلیم کے دوران جسمانی محنت ومشقت کرنے میں کبھی عار نہیں آئی۔ فارغ اوقات میں لاریوں کے اڈے پر مزدوری کرتا اور نہ صرف اپنی تعلیمی ضرورتیں پوری کرتا بلکہ باپ کی خدمت بھی کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا صلہ یہ دیا کہ سلیم نے ایم اے تک تعلیم پائی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے اس کی شادی کینیڈا کے ایک مخلص گھرانے میں کروائی اور اسے کینیڈا بھیج دیا۔ سلیم نے وہاں بھی اپنی نیک نامی قائم رکھی۔ مدتوں بعد ہم سے ملاقات ہوئی تو اصرار کیا کہ ہم اس کے گھر آئیں اور اس کے بچوں سے ملیں مگر قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ پہلے سفر میں ہم اس کے ہاں نہ جا سکے دوسرے سفر سے پہلے سلیم ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے ابا بابا جی غلام محمد جب تک زندہ رہے ہم پر شفقت فرماتے رہے اب تو سلیم کی اولاد ماشاء اللہ بڑی ہے اور دنیاوی لحاظ سے بڑی خوش حال ہے یہ بھی ان کے دادا اور نانا کی قربانیوں کی برکتیں ہیں جو ان کی اولاد سمیٹ رہی ہے۔

یہ مضمون یہیں تک لکھا تھا مگر بعد میں میاں احمد دین بہت یاد آئے۔ میاں احمد دین حضرت مولانا جلیل صاحب کے کسی دفتر کے مددگار کارکن تھے مگر جب تک جیا کئے مولانا صاحب کے گھر کے کام کاج کرتے رہے۔ میاں احمد دین دبلے پتلے آدمی تھے۔ بڑھاپے نے اور زیادہ کمزور کر دیا تھا مگر غلہ منڈی سے رنگش رنگش کرتے چلتے اور جامعہ احمدیہ میں قبلہ مولانا جلیل صاحب کے دولت کدہ تک آتے تھے۔ گھر کا سودا سلف لانے میں انہیں خوب مہارت تھی اور تھے بھی انتہا کے دیانتدار آدمی۔ ہماری ساس جنہیں ہم امی کہتے تھے میاں احمد دین کی خاطر تواضع بھی بہت کرتی تھیں۔ میاں احمد دین آتے تو سب سے پہلے

انہیں چائے کا ایک پیالہ پیش کیا جاتا ساتھ ان کے بڑھاپے کی رعایت سے کوئی خوردنی چیز۔ رس یا بند یا روٹی جو کچھ میسر ہوتا دیا جاتا۔ میاں احمد دین کھانے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو جاتے۔ بوڑھے آدمی تھے مگر یہ نہیں کہ کام کو ٹالتے ہوں۔ اگر انہیں کوئی ایسا سودا لانا پڑتا جو گول بازار سے یا قریب کی دکانوں سے نہ ملتا تو غلہ منڈی کی طرف چل پڑتے اور جب تک مطلوبہ چیز مل نہ جاتی انہیں چین نہ آتا۔ یہ کبھی نہیں ہؤا کہ میاں احمد دین کے ذمہ کوئی کام کیا گیا ہو اور وہ نہ ہؤا ہو۔ میاں احمد دین کو ہمارے بچوں کے ساتھ انتہا کا پیار تھا کیونکہ سب ہی ان کی آنکھوں کے سامنے پلے تھے۔ میاں احمد دین نہایت دیندار، نیک اور خدا ترس آدمی تھے۔ ہم نے کم از کم تیس پینتیس سال تو انہیں آتے جاتے دیکھا۔ سر پر صافہ باندھے پاؤں میں لیترے ہلگائے' ایک سفید چادر اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر رواں دواں رہتے تھے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے انہوں نے ہماری اور ہمارے بزرگوں کی اور ہمارے بچوں کی بہت بے لوث خدمت کی ہے۔ جماعت احمدیہ کے یہ بظاہر چھوٹے کارکن تھے مگر درحقیقت بڑے لوگ تھے ان کا مقام ان کے خلوص' دیانت' تقوی' محنت اور نیکی کی وجہ سے بہت بڑا مقام ہے اور یہی لوگ ہیں جو آئندہ نسلوں کے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ اللہ تعالی ان کے فیضان کو جاری رکھے۔ آمین۔

اگرچہ سر بتراشد قلندری داند

مشتاق احمد یوسفی نے ہمارے بزرگ دوست شیخ منظور الٰہی صاحب درِ دلکشا کو ''درویشِ بے ریا و ریش'' کہا ہے۔ ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ وہ واقعی ''اگر چہ سر بتراشد قلندری داند'' کے مصداق ہیں۔ ہم جن ہستیوں کا ذکر کر رہے ہیں ان میں بھی ہم نے دو ایک ایسی ہی ہستیوں کو دیکھا کہ دیکھنے میں دلی والوں کے محاورہ کے مطابق'' کلا سوف تعلمون'' کی تصویر ہیں مگر دل کے غنی اور درویش تھے اور درویش بھی ایسے کہ ان کے سامنے بڑے بڑے درویش سر تسلیم خم کرنے کو اپنے لئے اعزاز جانیں۔ ہمارے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر وزیر الحسن عابدی تھے، لوگ انہیں داڑھی منڈا ولی کہا کرتے تھے۔ غرض ہم نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے مگر جن لوگوں کا ذکر ہم کرنے چلے ہیں وہ اپنے اس وصف میں بھی یکتا تھے۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

ایک بزرگ کو دیکھا کہ سر پر رومی ٹوپی اوڑھے، سفید براق شلوار قمیص پر ہاف کوٹ پہنے، بڑے وقار سے اپنے دفتر کی سب سے اونچی افسری کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ داڑھی تقریباً منڈی ہوئی ہے۔ زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں کاغذات دیکھتے اور فیصلے صادر کرتے جاتے ہیں۔ رائے میں اصابت ہے فیصلے دوٹوک ہیں جیسے گہرے تدبر اور غور و خوض کے بعد صادر کئے گئے ہوں۔ بعد کو جب ان سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا کہ ان کے فیصلوں کے پس پردہ ان کی تیز بصیرت کارفرما تھی معاملہ کی تہ تک پہنچنے میں انہیں زیادہ بحث و تمحیص میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں تیز فہمی کا ہنر دیا تھا مگر وہ فیصلے صادر کرتے وقت زیر لب استغفار پڑھتے رہتے تھے۔ ایک بار ہمارے اپنے افسرِ اعلیٰ رخصت پر تھے ان کی عدم موجودگی میں بعض اہم معاملات میں ہمیں ان سے فیصلہ کروانے کی ضرورت پیش آئی۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ وہ فیصلہ کرتے وقت استغفار کا دامن نہیں چھوڑتے۔ خدایا یہ کیسا داڑھی منڈا ولی ہے؟ ان کے حالات پڑھے تو معلوم ہوا کہ اپنے باپ کے تتبع میں سرکاری نوکری کی، انگریزوں کے زمانہ میں عدالت کی کرسی پر بیٹھے، وہاں بھی یہی عالم رہا کہ فیصلہ کرنا ہوا تو استغفار کا دامن پکڑ لیا کہ اے خدا تو ہی بندوں کی پردہ پوشی

کرنے والا اور بخشش کرنے والا ہے اگر میرے اس فیصلہ میں کوئی سقم ہے تو اس کی پردہ پوشی فرما اور غلطی ہے تو اس سے درگذر فرما۔ ہم نے ایسا افسر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دنیا میں تو ایسا ہونا انہونی بات سمجھی جاتی ہے مگر ہم نے ایسی انہونی ہوتے دیکھی ہے۔

پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ وہی افسر ایک روز چلتا چلتا ہمارے دفتر میں آیا۔ ہم احترام کے طور پر اٹھنے ہی کو تھے کہ جلدی سے ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے روک دیا۔ کہنے لگے تمہاری ایک ادبی چیز ایک ادبی رسالہ میں دیکھی تھی مجھے پسند آئی اس کی داد دینے آیا ہوں ابھی ہم اس بے پناہ داد کے ''صدمہ'' سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ وہ برق کے کوندے کی طرح جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔ الہیٰ کیسا افسر اعلیٰ ہے کہ اپنے ایک ادنیٰ ماتحت کی حوصلہ افزائی کرنا نہیں بھولتا؟ اس کے بعد بھی بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ اپنے اس افسر اعلیٰ سے داد ملی مگر اس پہلی داد کا نشہ اب تک نہیں اترا۔ راہ چلتے دیکھا تو سڑک کے کنارے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھنے کی قسم ہے۔ سواری سے گھبراتے ہیں اس لئے پیدل چلنا پسند ہے۔ ایک دو بار ہمارے ابا نے اپنی جیپ میں لفٹ دینے کی پیشکش کی۔ مسکرا کے ٹھکرا دی۔ دونوں میں بے تکلفی تھی دوستی تھی۔ احترام کا رشتہ دونوں جانب استوار تھا۔ ہمارے ابا بیمار ہوئے تو جن بزرگوں کو دعا کرنے کی درخواست کی ان میں ایک یہ درویش بھی تھے۔ عیادت کے لئے بھی سب سے پہلے جو گھر پر آئے اور پیدل چل کر آئے۔ وہ یہی بزرگ تھے۔

طبیعت کے دھیمے تھے ہم نے انہیں پندرہ بیس برس تو ضرور دیکھا ہوگا کبھی انہیں کسی پر خفا ہوتے دیکھنا ہمیں یاد نہیں پڑتا۔ زیادہ میل جول بھی انہیں پسند نہیں تھا بس اپنے لگے بندھے دوستوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان کے پڑوس میں ایک بزرگ تھے کہ ''شریعتِ حُقہ'' کے ''کماحُقہ'' پابند تھے بس ان سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کے حجرہ میں تین ''محققین'' باقاعدگی اور پابندی سے جمع ہوتے، حسبِ توفیق دادِ تحقیق دیتے اور بس! زیادہ مجلسوں میں ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔ دور سے دیکھنے والوں کو ان کی باغ و بہار شخصیت کے شگفتہ پہلو نظر نہیں آتے تھے مگر قدرت نے انہیں صاف ستھرا ادبی ذوق عطا فرمایا تھا۔ ادب کے رمز شناس تھے۔ خود کچھ لکھتے تھے یا نہیں ہمیں اس بارہ میں کچھ پتہ نہیں مگر ان کے ابا اپنے وقت کے مانے ہوئے اور مستند ادیب تھے۔ ہم نے ایک بار ان سے اجازت چاہی کہ اگر وہ اجازت دیں

تو ہم ان کے ابا کے بعض قلمی مضامین کو جو مختلف علمی موضوعات پر لکھے گئے تھے، ایڈٹ کر کے چھاپ دیں۔ کہنے لگے ان کا حقِ اشاعت میرے پاس نہیں۔ ہم نے کہا کس کے پاس ہے فرمایا مجھے علم نہیں۔ وہ مضامین اب تک غیر شائع شدہ پڑے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کسی وقت پنجاب یونیورسٹی کا کوئی محقق ان کو کھود نکالے گا۔

ان کی اولاد میں سے ان کے بڑے بیٹے ہمارے استاد اور چھوٹے ہمارے کلاس فیلو تھے۔ اس ناطہ سے ایک دو بار ان کے ہاں جانا بھی ہوا مگر گھر میں بھی وہ اسی طرح لئے دئے رہتے تھے جیسے دفتر میں یا باہر رہتے تھے۔ ایک بار ہمارے ایک بزرگ انگلینڈ سے آئے تو ان کے لئے ڈن ہل کا ایک ڈبہ لیتے آئے۔ ہم انہیں پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو لے کر جلدی سے اپنے تکیہ کے نیچے سرکا لیا۔ اپنے چھوٹے بیٹے کا نام لے کر فرمانے لگے اس کو پتہ چل گیا تو غائب کر دے گا۔ ہم نے اپنے اس دوست کو چھیڑا کہ تم تو کہتے تھے ابا کو میری اس عادت کا علم نہیں آج تمہارے ابا نے یہ فرمایا ہے۔ کہنے لگا حد ہو گئی میں تو پچھلے پانچ برس سے یہی سمجھتا رہا کہ انہیں میری اس علت پر آگاہی نہیں۔ خود ہمارے ساتھ ایسا ہی حادثہ ہوا۔ ہم بھی اپنی دانست میں اپنے ابا سے چھپ چھپا کر سگرٹ نوشی کیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے زمانہ میں ایک بار وہ ہمارے ہاسٹل میں تشریف لائے سامنے ایک بہت بڑا چاندی کا کپ پڑا تھا جو ہم نے انہیں دنوں جیتا تھا۔ اس کے اندر ہمارے سگریٹ کے باقیات جمع رہتے تھے۔ قبلہ وکعبہ نے کپ کو دیکھنے کی غرض سے اٹھایا اور اس کا ڈھکنا کھول کر اندر جھانکا۔ ہمارا تو وہ حال ہوا کہ" کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"۔ مگر قبلہ وکعبہ کا حوصلہ تھا کہ اسی خاموشی سے کپ کا ڈھکنا رکھ دیا۔ پرانے بزرگوں کی کیا بات تھی زبان سے کچھ کہہ کے نہیں دیا کوئی اور ہوتا تو نصیحتوں کے دفتر کھول لیتا یا طعن و تشنیع کے تیر آزمانے لگتا۔ ہمارے بزرگ حوصلہ مند تھے پردہ پوشی کرنا حوصلہ مندوں کا کام ہی تو ہے!

دفتر میں ان کا مقام سب سے اعلیٰ افسر کا مقام تھا۔ لوگوں میں ان کا اتنا اعتبار تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میرا معاملہ ان کے روبرو پیش ہے تو مجھے کسی ناانصافی کا خدشہ نہیں اور حقیقتاً ایسا ہی ہوتا تھا۔ ان کا اپنا یہ حال تھا کہ ادنیٰ کارکن سے لے کر اعلیٰ کارکن تک سب سے یکساں ملاتفت سے پیش آتے۔ دعوتوں میں ہم نے ایسا بھی دیکھا کہ اپنے دفتر کے چپڑاسی کو اپنے ساتھ بٹھا رکھا ہے اور دونوں اکٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔

ایک بے تکلف دوست نے ٹوکا تو فرمانے لگے ہمارے دیہات میں چھوٹے بڑے لوگ ایک ہی حقہ سے حقہ پیتے ہیں کیا ہم ایسے گئے گذرے ہیں کہ اتنی بھی رواداری ہم میں نہ ہو؟ ادنیٰ اور اعلیٰ کی تمیز ہمارے معاشرے میں ویسے بھی نہیں تھی مگر یہ بزرگ اس مساوات کے نمایاں علمبردار تھے۔ آخر کس دادا کے پوتے تھے؟ ان کے دادا کی سنت بھی تو یہی تھی کہ سب مہمانوں کے درمیان بیٹھ کر کھانا کھاتے اور جب سب لوگ اپنا اپنا کھانا نکال چکتے تو وہ اپنا پیالہ اٹھا کر سب سے غریب اور دور پیچھے بیٹھے ہوئے مرید کے پاس چلے جاتے کہ آؤ میاں اب ہم بھی کھانا کھالیں اور اسی پیالہ میں آقا کے ساتھ ان کا خادم بھی شریک ہو جاتا۔

ان کا وصال ہؤا تو ان کی جگہ ایک اور ولی نے لے لی۔ ہم نے انہیں ان کی جوانی کے زمانہ میں اپنا الیکٹرانکس کا کارخانہ چلاتے دیکھا تھا یہ ان کی ہابی بھی تھی اور روزگار بھی۔ تقسیم سے پہلے ان کے کارخانہ کا بناہؤا الیکٹرانک کا سامان دور دور تک مشہور تھا بلکہ دساور کو بھی بھیجا جاتا تھا مگر تقسیم ملک کے بعد انہوں نے زمیندارہ کی طرف توجہ کی۔ چاہتے تو اپنے کارخانہ کے عوض یہاں اچھے سے اچھا کارخانہ الاٹ کروا لیتے مگر ہماری بستی کے مکینوں نے اپنی متروکہ جائیدادوں کا کلیم داخل ہی نہیں کیا۔ نئی بستی کے ماحول میں ابتدا میں بجلی کے پنکھوں کا کارخانہ انہوں نے قائم کیا مگر خدا جانے کیا ہؤا کہ اس کی صف لپیٹ دی اور زمیندارہ کرنے لگے اور اس ذوق وشوق سے کرنے لگے جیسے جدی پشتی زمیندارہ کرتے آئے ہوں۔ چن چن کر غیر آباد زمینیں حاصل کرتے اور انہیں آباد کر کے سرسبز وشاداب بنا دیتے۔ ہم نے کئی بار انہیں دیکھا کہ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں، جب محاورہ کے مطابق چیل انڈا چھوڑتی ہے، یہ اپنے زمیندارہ کی طرف رواں دواں ہیں، کبھی گاڑی ہے کبھی گاڑی نہیں ہے، کبھی ٹریکٹر پر ہی ٹنگے ہوئے ہیں، مگر ان کا سفر جاری ہے۔ سر پر کھڑے ہو کر گندم کی فصل اگاتے اور اٹھاتے ہیں۔ تھریشر چل رہا ہے، گرد کے طوفان اٹھ رہے ہیں مگر یہ اپنے کام میں مگن ہیں۔ ہاں اس حالت میں بھی کلے میں پان دبا ہؤا ہے۔ پان کے رسیا ہیں، یہ ان کی دادی اماں کی دین ہے جو دلی والی ہیں یا ہوسکتا ہے ننہال کی نوابی کا کوئی اثر ہو مگر پان منہ میں ہے اور ان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔

ان کے کھانے کا طور بھی نرالا ہے، دل کے مریض ہیں مگر پراٹھے نہیں چھوڑ سکتے، ان کے لئے تو پکتے ہی

ہیں اس سارے لاؤ لشکر کے لئے بھی پراٹھے ہی پکتے ہیں جوان کی فصل کی کٹائی یا گاہی پر مامور ہے۔
ہمارے ابا سے پرانا یارانہ ہے اور ہمارے گھر کا اچار انہیں بہت پسند ہے انہیں کیا ان کے اور ہمارے مرشد کو بھی بہت پسند ہے بلکہ مرشد کو تو پراٹھے بھی ہماری امی کے ہاتھ کے بنے ہوئے پسند ہیں جہاں یہ تینوں دوست اکٹھے ہو جاتے ہیں جشن کا سماں ہوتا ہے۔ زمیندارہ ہو یا شکار، پراٹھے، اچار اور لسی تینوں کی موجودگی ضروری ہو جاتی ہے۔ جس روز ابا کو ان دوستوں کے ساتھ جانا ہو گھر میں ہماہمی ہوتی ہے۔
ہمارے ابا مرحوم گھر میں ہمیشہ دودھیل جانور پالتے تھے اس لئے ہمارے گھر میں تازہ خالص دودھ اور خالص گھی مکھن موجود رہتا تھا۔ جب ان تینوں دوستوں کا پروگرام بنتا خالص گھی کے پراٹھے پکتے، اعلیٰ سے اعلیٰ تیل میں بڑے چاؤ رچاؤ سے ڈالا ہوا اچار نکالا جاتا۔ لسی کے دونے الگ سے تیار کروائے جاتے تب جا کر ان تینوں دوستوں کے کھانے کا اہتمام ہوتا۔ مگر ہمارے ابا مرحوم دل اور شوگر دونوں کے مریض تھے اس لئے اپنے لئے علیحدہ سے ایک ''روکھا'' پھلکا ساتھ رکھتے اور اچار سے اسی رغبت سے نوش کرتے جس رغبت سے ان کے دوست پراٹھے تناول فرماتے تھے اور کہتے تھے اصل مزا تو دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں ہے !
گاڑیاں بھی اللہ نے کئی دے رکھی تھیں مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ان کے کام کم آتیں دوسروں کے استعمال میں زیادہ رہتیں۔ ہماری بستی میں ایک آدھ ایمبولینس موجود ہے جو تھوڑے لوگوں کے لئے تو کفایت کرتی تھی جب آبادی بڑھ گئی تو اس کی مانگ زیادہ ہو گئی۔ ایسے وقتوں میں جب شہر میں ایمبولینس موجود نہ ہوتی ضرورتمند بلا جھجک ان کا دروازہ جا کھٹکھٹاتے اور گاڑی مریض کی خدمت کے لئے مل جاتی۔ ہم نے کسی کو ایسے موقعہ پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں گاڑی میسر آ گئی تو ہم نے بھی اس بے ریش دلی کی سنت پر عمل کیا کہ مریض کی خدمت کے لئے گاڑی درکار ہے تو حاضر ہے۔
ہمارے پاس ڈرائیور تو کوئی تھا نہیں اس لئے اکثر و بیشتر یہ خدمت بھی ہم ہی انجام دیتے تھے اور خدا گواہ ہے کہ جو لطف اس خدمت میں آتا تھا وہ کسی اور خدمت میں میسر نہ آیا۔ خدمت کا یہ انداز ہم نے اسی بزرگ سے سیکھا۔
یہ بھی دفتر کی اعلیٰ ترین کرسی پر بیٹھے تھے ان کا انداز بھی منفرد تھا۔ جس کا جی چاہتا چق اٹھا کر اندر آ جاتا۔

خالی ہیں تو اپنے کام کی بات کرتا اور جواب باصواب سے متمتع ہوتا۔ خالی نہ ہوتے تو آرام سے بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتا۔ رعب داب اتنا تھا کہ کوئی ان سے کوئی سبک بات نہ کرسکتا تھا ، ذرا کسی نے طول کلامی سے کام لیا تو مسکرا کر فرماتے میاں اپنے مطلب کی بات کہو کیوں میرا وقت ضائع کرتے ہو۔ مگر اس سرزنش میں ملائمت ہوتی تحکم یا برہمی کا اظہار نہ ہوتا۔ خالی ہوتے تو دفتر سے باہر نکل کر ٹہلنا شروع کر دیتے۔ ان کا وہ انداز بہت بھلا لگتا تھا منہ میں پان ہے ، ساتھ میں کوئی دوست ہمنشیں ہے جو باتیں کرتا جاتا ہے اور یہ خاموشی سے سنتے اور ہوں ہاں کرتے جاتے ہیں۔ چہرے پر عجیب دلنواز مسکراہٹ ہے۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ مرشد کو حالات کے ماتحت ملک چھوڑنا پڑا امارت کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آن پڑا اب یہ محض دفتر کے افسرِ اعلیٰ نہیں ہیں سارے ملک کے متبعین کی دینی رہنمائی بھی ان کے ذمہ ہے۔ جس خوبی سے یہ فریضہ انہوں نے انجام دیا کیا کوئی دے گا؟ دیکھنے میں وہی درویش وجود لوگوں کو رشد اور ہدایت بھی دے رہا ہے ، حوصلہ بھی دے رہا ہے، استقامت کا نمونہ بھی انہیں دکھا رہا ہے غرض ان کا اسوہ سب کے لئے مشعلِ راہ بنا ہوا تھا۔ ہم نے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں کہ رہنمائی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جائیں اور اپنی طبیعت کی مسکینی بھی قائم رکھ سکیں۔ یہ داڑھی منڈا ولی ایسا کرسکتا تھا اور اس نے ایسا کر کے دکھایا تھا جبھی تو ان کی وفات پر مرشد نے ان کو خراجِ تحسین ادا کیا تھا اور اب ان کا وہی بیٹا جوان کی امارت کا جانشین ہوا تھا اللہ کے فضل سے خلافت کے مقام پر سرفراز ہے اور کروڑوں کا مرشد ہے۔

ہم نے اپنے معاشرہ میں اپنے اردگرد ایسے ولی بہت دیکھے تھے اور ایسے ولی بہت موجود ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک اور بے ریش ولی کا انتقال ہوا ہے۔ نحیف سے آدمی تھے۔ پھیپھڑوں کی بیماری نے ایک پھیپھڑا برباد کردیا تھا محض ایک کے سہارے جی رہے تھے ۔ جوانی میں اپنے گھر بار والوں خاندان والوں کے علی الرغم مسلک تبدیل کرلیا اور بی اے کرنے کے بعد خدمت کے لئے آگئے۔ ہمیں ان کے ساتھ دفتر میں کام کرنے کا موقع ملا۔ افسر کیا تھے خادم تھے لہجہ میں اتنی انکساری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ علمی ذوق کے آدمی تھے اسی لئے ہمارے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور عمروں کے تفاوت کو نظرانداز کر دیتے تھے۔ لائبریری کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں کا ذوق رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ لوگوں کو انگریزی کا سبق بھی دیتے رہے، خود اپنی اولاد میں بیٹیاں ہی تھیں ان کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ریٹائر ہونے

کے بعد مسجد کے پاس گھر بنالیا کہ دور نہ جانا پڑے۔ ان کے علمی ذوق کا عالم یہ تھا کہ کہیں سے کسی اچھی کتاب کی بھنک پڑتی تو فوراً لائبریری کا رخ کرتے نہ ملتی تو کالج میں ہمارے پاس تشریف لاتے کالج لائبریری میں بھی نہ ملتی تو لاہور میں تلاش کرواتے، غرض جب تک وہ کتاب دیکھ پڑھ نہ لیتے انہیں چین نصیب نہ ہوتا۔ ہم نے کئی کتابیں ان کی سفارش پر پڑھیں اور ان کے ذوقِ سلیم کی داد دی۔ ان کی زندگی کا محور گھر تھا یا لائبریری۔ ہمیں وطن چھوڑے بارہ برس ہونے کو آئے مگر ان کی یاد برابر آتی رہی۔ سویڈن میں ہم نے پرانی کتابوں کی دکانوں سے کئی ایسی نایاب کتابیں خریدیں جن کو ہم ان کی سفارش پر پڑھ چکے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ وہ کتابیں انہیں بھیج دیں مگر غریب الوطنی میں ساری خواہشیں پوری تو نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ اس درویشِ بے ریش کی مغفرت فرمائے۔

ہاں ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تو اپنی بزرگی اور تقویٰ شعاری کی وجہ سے اسی درویشی کے مرتبہ پر فائز تھے۔ صبح سکول کی اسمبلی میں درسِ حدیث دیتے تو آنکھیں نم ہو جاتیں۔ ہمیں اس وقت تو بچپن کی ناسمجھی میں ان کی رقت کی وجہ سمجھ میں نہ آتی اب سوچتے ہیں تو ان کا گداز سمجھ میں آتا ہے الٰہی کیسے کیسے لوگ تھے۔ یہ صوفی بھی بے ریش صوفی تھے۔ قلبِ مطمئنہ کی دولت سے مالا مال !اب ویسے لوگ کہاں؟ اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر!

خاموش کارکن

دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی نظام کا وجود موجود ہو وہیں اس نظام کو چلانے کے لئے کارکنوں کا وجود بھی ضروری ہوتا ہے۔ جماعت احمدیہ کا نظام اس لحاظ سے دنیا کا منفرد نظام ہے کہ اس نظام کو چلانے والے کارکن دنیاوی مفادات سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں۔ اس نظام میں قوت کا سرچشمہ خلیفۃ المسیح کی ذات ہے۔ تمام کارکن خلیفہء وقت کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ پھر کارکنوں میں مراتب کا فرق ہے کوئی واقف زندگی کارکن ہے کوئی جز وقتی وقف کے تحت کام کرتا ہے اور کچھ کارکن ایسے ہوتے ہیں جو عملاً واقفین زندگی ہی کی طرح کام کرتے ہیں مگر لفظاً شاید واقف زندگی نہیں ہوتے۔ جماعت کا سارا نظام اخلاص اور وقف پر چلتا ہے اور چل رہا ہے۔ اب تو اس قسم کے کارکنوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے کیونکہ لندن میں حضرت صاحب کے اردگرد کام کرنے والے اکثر کارکن لفظاً واقف زندگی نہیں مگر عملاً سارے ہی کارکن واقف زندگی ہیں اور بلا معاوضہ رضاکارانہ طور پر جماعت کا کام کر رہے ہیں۔ امسال جلسہ سالانہ کے بعد برمنگھم میں عزیزی نصیر شاہ کے گھر ایک شعری نشست میں پاکستان کے ایک بہت بڑے شاعر 'ضیا جالندھری' تشریف لائے ہوئے تھے جو پاکستان ٹی وی کے مینیجنگ ڈائریکٹر رہ چکے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اس نشست کی ریکارڈنگ کے لئے ایم ٹی اے کی جو ٹیم لندن سے آئی ہوئی ہے اس کے سارے ہی کارکن رضاکار ہیں ایک بھی ملازم یا تنخواہ دار کارکن نہیں تو ان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا کیونکہ وہ ٹی وی اور اس کے تقاضوں کو عملی طور سے جانتے تھے اور اس بات سے آگاہ تھے کہ یہ کام کتنی جانکاہی اور محنت اور دلسوزی چاہتا ہے۔ کہنے لگے جس جماعت کو اتنا وقت اور اتنی محنت دینے والے رضاکار کارکن میسر ہوں اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔

ربوہ میں جب ہم نے ہوش سنبھالا اور انجمن کے کارکن کی حیثیت سے خدمت شروع کی تو یہ احساس نمایاں تھا کہ اگر ہمیں جماعت کی خدمت کرنی ہے تو ہمیں عملاً بھی وقف زندگی کے نظام سے منسلک ہو جانا چاہئے چنانچہ بی اے کرنے کے بعد وقف زندگی کا فارم پر کر دیا۔ ارشاد ہوا' ایم اے کریں۔ ایم اے

حساب کتاب تو ان کا پیشہ تھا مگر ہندسے اتنے پیار سے لکھتے تھے گویا کوئی مقدس نوشتہ رقم کر رہے ہوں۔

اپنے دوست چوہدری ظہور احمد ناظر دیوان پر تو چاہتا ہے علیحدہ مضمون لکھوں۔ چوہدری صاحب سے تعلق ان کی ماتحتی سے شروع نہ ہوا کالج کے زمانہ سے شروع ہوا۔ چوہدری صاحب حضرت صاحب کے دوستوں میں سے تھے اور صد سالہ جوبلی فنڈ کے کرتا دھرتا تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ساتھ کشمیر کمیٹی میں کام کر چکے تھے اس لئے کشمیر کمیٹی کی تاریخ پر سند سمجھے جاتے تھے اس سلسلہ میں ان کی کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ ہمارے ابا سے بھی ان کی دوستی تھی۔ چوہدری ظہور احمد نے اپنا سفر دفتری کی حیثیت سے شروع کیا اور ناظر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ وضع دار آدمی تھے صاحب ذوق بھی تھے۔ لباس کے بارہ میں نفاست کا مظاہرہ کرتے تھے سر پر کلاہ والی سفید پگڑی باندھتے تھے باتوں میں موہنی تھی مخاطب کو گرویدہ کر لیتے تھے سلسلہ کے علما کا بہت احترام کرتے تھے کہتے تھے عالم نہیں ہوں عالم شناس ہوں اور واقعی علم کی پہچان رکھتے تھے رفتہ رفتہ ہمیں ان سے دوستی کا شرف حاصل ہوتا گیا حتی کہ آخری عمر میں بعض اوقات طلب فرماتے اور فرماتے میرے ساتھ باتیں کرو۔ ناظر دیوان کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے کارکنوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اپنا فرض جانتے تھے اللہ تعالی مغفرت فرمائے اپنے رنگ کے صوفی تھے نمود نمائش سے متنفر اور عاری ۔ جب ہم انجمن میں کلرک تھے چوہدری صاحب کارکن درجہ اول تھے پھر نائب آڈیٹر ہوئے' پھر آڈیٹر' پھر ناظر۔ انجمن کے بہت کم کارکنوں کا ترقی کا گراف ایسا ہے۔ حساب کتاب کی سوجھ بوجھ خود ان کی اپنی پیدا کردہ تھی کوئی ڈگری وغیرہ ان کے پاس نہیں تھی صد سالہ جوبلی کا فنڈ اور اس کا حساب کتاب بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا مگر چوہدری صاحب نے اسے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خدمت کرتے رہے مگر ایک روز اچانک اس سفر پر نکل گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ان کے بیٹوں میں سے منور ہمارا کلاس فیلو تھا چھوٹے ہمارے شاگرد ہوئے عزیز لئیق احمد نیشنل بینک آف پاکستان کا سینئر عہدیدار ہے اور پاکستان سائیکلنگ ایسوسی ایشن کا ''رشتہ دار'' ہے ہمارے دوست ڈاکٹر رشید احمد ان کے داماد تھے ان کی اولاد یہاں سویڈن میں آباد ہے۔ ہم پہلے پہل سویڈن میں آئے تو عزیزی ڈاکٹر انس رشید اور اس کی بیوی عزیزہ مسرت نے اتنی محبت سے ہمارا خیال رکھا کہ ہمیں ایک لحظہ کے لئے بھی اپنے بچوں سے یا وطن سے دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالی انہیں

ہمارا مکتبِ عشق

قادیان میں ہمارے گھر کے بالکل پاس ایک کھلے میدان کے شمالی کنارے پر ایک عظیم الشان عمارت کھڑی تھی۔ مسجدِ نور میں جانا ہوتا تو اسی طویل میدان کو قطع کر کے جانا ہوتا۔ عمارت کی زیبائی اور خوبصورتی اپنی طرف کھینچتی کہ جا اینجاست۔ مگر بچوں کو اس عمارت کے آس پاس پھٹکنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ہم لوگ چپکے سے گھنیرے بڑ کے چھتنار درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے مسجد تک جاتے اور واپسی پر اس عمارت کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گھر آجاتے۔ بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ تاج محل کسی زمانہ میں سکول کی عمارت تھی اب کالج کا مسکن ہے اور صرف وہ طلبا یہاں تعلیم پا سکتے ہیں جو میٹرک کے امتحان کا مرحلہ کامیابی سے طے کر چکے ہوں۔ بھلا پرائمری سکول کی تیسری چوتھی جماعت کے لڑکے کے ذہن میں کالج کی علو مرتبت کا کیا کیا تصور پیدا نہ ہوتا ہوگا۔ چلئے اس حیرت میں حسرت بھی شامل ہوگئی۔ جب ہمارے کالج تک پہنچنے کا زمانہ آیا تو ملک تقسیم ہو چکا تھا ہجرت وقوع میں آچکی تھی۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ تقسیم ملک کے کوئی گیارہ بارہ برس بعد قادیان جانا ہوا تو کالج کی عمارت اسی جگہ تھی مگر اس کی خوبصورتی گہنا چکی تھی۔ اس کو دیکھنے سے آنکھوں میں جو طراوت آتی تھی وہ مفقود تھی۔ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد۔ ہماری مسجد' مسجد نور' کے دروازے تیغہ کئے ہوئے تھے۔ بڑ کا درخت اپنی کہن سالی کی قیمت ادا کر چکا تھا۔ ساتھ کا سومنگ پول خشک اور بے آب تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کی دیدہ زیب عمارت بھی "صورت ببیں حالت مپرس" کی تصویر تھی۔ در و دیوار سے حسرت بڑی ٹپکتی تھی۔ ہمیں اپنے گھر کو دیکھ کر رونا نہ آیا تھا ان عمارتوں کی حالت نے رلا دیا حالانکہ ان عمارتوں سے ہمارا محض آنکھ دیکھے کا رشتہ تھا۔ کالج میں پڑھے تھے نہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ ربوہ میں یہ دونوں خوش نصیبیاں حصہ میں آئیں۔ مگر وائے غریب الوطنی کہ اب اس بستی سے آنے والے کہتے ہیں کہ کالج کے سامنے سے بھی گذریں تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ کہاں گئے وہ زمانے کہاں گئے

وہ لوگ؟

ہم نے میٹرک کا امتحان چنیوٹ کے اس سکول سے دیا جو لاہور روڈ پر واقع ہے اور اب ''نارمل'' سکول کہلاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں نارمل نہیں تھا ''ایب نارمل'' تھا کیوں کہ ایک ہی سال میں کسی سکول کے طلبا نے یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں ''یکمشت'' اتنی نمایاں حیثیتیں حاصل نہ کی تھیں۔ غضب خدا کا' اول اس سکول کا لڑکا منور احمد۔ تیسرا اس سکول کا لڑکا سعید احمد خاں۔ ساتواں اس سکول کا لڑکا برکات الٰہی جنجوعہ۔ دسواں اس سکول کا لڑکا عبدالغفور زاہد۔ ان کے پیچھے پیچھے بھی بہت سی نمایاں کامیابیوں کا سلسلہ تھا جو ہمیں اس وقت یاد نہیں تاریخ میں ضرور محفوظ ہوگا۔ ہیڈ ماسٹر کہ حافظ قرآن تھے زار قطار رو رو کر اپنے سکول کے اس کارنامہ پر سجدات شکر بجا لا رہے تھے۔ اخبار والے نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے والے لڑکوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اساتذہ اپنی جگہ خوش۔ طلبا اپنی جگہ نازاں غرض شہر کا شہر خوش تھا اور تو اور چنیوٹ میں بھی جشن کا سماں تھا کہ ان طلباء نے آخر امتحان تو ہمارے ہی شہر سے دیا تھا نا۔ یہ تو وہ ''ایب نارمل سکول'' تھا جس میں ہم نے تعلیم پائی۔ اور وہ ادارہ جس کو ہم ''اپنا کالج'' یا'' اپنا مکتب عشق'' کہہ رہے ہیں کوئی کم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ہم نے اس کالج کی عمارت کو اپنے سامنے تعمیر ہوتے اور اس کی تعلیمی اور تہذیبی روایتوں کو اپنے سامنے مستحکم ہوتے دیکھا تھا۔ اس کالج سے ہمارا محض آنکھوں دیکھے کا رشتہ نہیں دانت کاٹی روٹی کا رشتہ تھا۔ ہم نے اس کالج سے محض تعلیم ہی حاصل نہیں کی اس کا رزق بھی کھایا ہے اس لئے حق نمک سے ادا ہونے کی سعی کریں گے۔ ریلوے لائن ربوہ شہر کے عین بیچوں بیچ سے گذرتی ہے۔ کالے کالے پہاڑ ایک جانب رہ جاتے ہیں۔ شہر کے جنوب میں ریلوے لائن سے پرے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک بڑی لمبی چوڑی عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس عمارت نے سر اٹھانا شروع کیا اور دو تین برسوں میں ہی مکمل ہو کر ایک ادارہ کی شکل اختیار کر لی۔ ہم اس عمارت کو ایک عجیب بیم و رجا کے عالم میں بنتے دیکھتے رہے۔ میٹرک کا مرحلہ ہم طے کر چکے تھے۔ ہمارے ساتھی لاہور میں جا کر کالج کی تعلیم کے دو سال مکمل کر چکے تھے ہم پیچھے رہ جانے والے مسافر کی طرح اس بات کے منتظر تھے کہ کب کالج کی یہ عمارت بنے کب تعلیم کا سلسلہ جاری ہو اور کب ہم بھی اس کالج کے طالب علم کہلانے کے قابل ہو سکیں۔ کالج کے پرنسپل جو آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے کبھی کبھار اپنے ''عمو صاحب'' کو

ملنے کے لئے ہمارے اس دفتر میں بھی قدم رنجہ فرماتے تھے جس میں ہم کلرک کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی سعیء مسلسل میں مصروف تھے۔ ایک دو بار ہمیں دیکھا بھی چونکہ اخبار و رسائل میں ہمارے مضامین چھپنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اس لئے ایک دو بار حوصلہ افزائی کی نگاہ سے ہماری جانب نگاہ اٹھائی۔ ایک بار تو یہاں تک فرما دیا کہ آپ کی یہ جگہ نہیں کالج آ جائے تو فوراً کالج میں داخل ہوں۔ اس لئے ہم اس عمارت کے بننے اور کالج کے جاری ہونے کے کیا کیا آرزومند نہ تھے۔ بارے وہ وقت مسعود آیا کالج جاری ہؤا داخلہ کا اعلان ہؤا۔ ہم داخلہ کا فارم لے کر حاضر ہوئے۔ پرنسپل صاحب نے کچھ پوچھ کے اور کہہ کے نہیں دیا فارم پر کچھ نشان سے بنا دئے جو ہماری فہم سے بالاتر تھے۔ ہم وہ فارم لے کر کالج کے دفتر میں گئے۔ معلوم ہؤا پرنسپل صاحب نے از راہ ذرہ نوازی پوری فیس معاف کر دی ہے بلکہ کالج کی جانب سے مبلغ پانچ روپے مہینہ ہمارا وظیفہ بھی مقرر کر دیا ہے۔ ہم جو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے کہ خدا معلوم کالج میں داخلے کے لئے کتنے روپے درکار ہوں گے یکا یک ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے۔ نئے داخل ہونے والے لوگوں کو دیکھا کوئی سات سو نمبر لے کر آیا تھا کوئی ساڑھے سات سو۔ ایک سے ایک نابغہ کالج کے کوریڈور میں محوِ خرام نظر آیا۔ ہمیں ایک اور فکر نے گھیر لیا کہ ان اعلیٰ نمبر یافتہ لوگوں میں ہم کہاں ٹھہر پائیں گے؟ ایسا نہ ہو بیک بنی و دو گوش چلتے کر دئے جائیں۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ سکول میں بھی تو ہمارے ساتھ اسی قسم کے "از قسمے نابغہ ہائے روزگار" لوگ تھے وہاں ہم ان سے نہیں دبے تو یہاں ان سے کہاں دب کے رہیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ یونیورسٹی میں کوئی اعلیٰ پوزیشن نہیں آئے گی تو وہ پہلے کب آئی تھی؟

ہم ابھی اپنے پانچ روپے مہینہ کے وظیفہ کی لم کا ہی سوچ رہے تھے کہ قبلہ جنید ہاشمی مرحوم نے کہ کالج کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ تھے ہمیں ہاتھ کے اشارہ سے بلایا۔ ہمارا خیال تھا کچھ فرمائیں گے مگر منہ میں پان تھا فرماتے کیسے؟ ایک فائل ہمارے ہاتھ میں تھما دی اور پان کی پیک کو منہ میں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے ہمیں بتایا کہ یہ کالج کے مجلّہ المنار کی فائل ہے اور یہ کہ ہم پہلے دن سے ہی اس مجلّہ کی مجلس ادارت میں شامل کر دئے گئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کا ارشاد ہے کہ پرچہ معیاری ہونا چاہئے اس لئے محنت سے مرتب کریں۔ مجلس ادارت میں اور کون کون ہے؟ فرمایا معلوم ہو جائے گا پچھلا پرچہ دیکھ لیں۔ ہم لائبریری میں گئے کہ

المنار کا پچھلا پرچہ دیکھیں وہاں ہو کا عالم تھا۔ کتابیں البتہ الماریوں میں بند پڑی تھیں تالے لگے ہوئے تھے۔ یہ لمبے لمبے میز۔ ساتھ میں کچھ کرسیاں مگر سب خالی۔ اتنے میں ایک بارعب سے بزرگ ٹہلتے ٹہلتے اندر آئے ہم نے لپک کر کچھ استفسار کرنا چاہا تو وہ اسی تیزی سے باہر چلے گئے جس تیزی سے ہم ان کی جانب لپکے تھے مبادا ہم ان سے کوئی سوال کر ڈالیں۔

ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہمارا سکول کا ایک پرانا ہم جماعت ''ذہین فطین'' دوست نظر پڑا۔ اب وہ سینئر تھا اور ہم بہر حال فرسٹ ایر فول تھے اس نے تسلی دی کہ گھبرانے کی بجائے یہ موقع لوگوں کو فرسٹ ایر فول بنانے کا ہوتا ہے اس لئے، ہمیں وقت کو ادھر ادھر پھر کر ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم فرسٹ ایر فول ہونے کے باوصف دوسروں کو فول بنانے پر مستعد ہو گئے۔ یہ دھڑ کا بہر طور لگا ہوا تھا کہ کہیں ہم خود تو فول نہیں بن رہے؟ اور یہ جو المنار کا پلندہ ہم اٹھائے پھرتے ہیں کہیں یہ ہمارے فرسٹ ایر فول ہونے کا محکم ثبوت تو نہیں؟ ''نیست ایڈیٹر ولیکن در بغل دارد۔۔۔''

فول دول تو ہم نے لوگوں کو بہت بنایا مگر اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ جولڑ کا ملتا وہ ''وظیفہ خوار'' نکلتا۔ غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا۔ ہم جو اپنے وظیفہ خوار ہونے کو بڑا طرہ ءامتیاز سمجھے بیٹھے تھے بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کالج ہے یا وظیفہ خواروں کی انجمن؟ معلوم ہوا کہ اس کالج کا طرہ ءامتیاز یہ ہے کہ مستحق طلباء کو وظیفہ دیتا ہے اور اس میں کسی کے رنگ ونسل، عقیدہ و بدعقیدگی، نیکی، بدی، بدعت، غیر بدعت کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مستحق طلبا علم سے محروم نہ رہ جائیں۔ پہلے روز ہی جس انبوہِ غفیر سے بسلسلہ ''فول گری'' ملاقات ہوئی وہ اسی زمرہء ''وظفاء'' میں سے نکلے۔ اکثر لوگ تو عقیدۃً بھی محض ''عقیدہ تن'' نکلے یعنی یہ بڑے بڑے تن و توش والے کالج کی روئنگ ٹیم کے چیمپئن لوگ کھانے پینے میں لاثانی ''تن کی دنیا ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں'' کے قائل۔

ہوسٹل میں ایسے لوگوں کی اکثریت پائی جو ہمارے عقیدہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا تھا البتہ ایک ''تکلیف'' سب کو تھی کہ ''آ گیا عین پڑھائی میں اگر وقتِ نماز'' تو نماز التزام سے پڑھنا پڑتی تھی۔ ہمارے ایک دوست (جو پیپلز پارٹی کے زمانہ میں وزیر ہو گئے تھے) کہا کرتے تھے کہ اقبال خود تو نماز پڑھتا نہیں تھا (من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا) ہمارے لئے ایک

مصرع ایسا کہہ گیا ہے جو سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن کر رہ گیا ہے۔ پڑھیں تو مشکل نہ پڑھیں تو مشکل
۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ۔ پڑھیں تو تیمم کرنا پڑتا ہے نہ پڑھیں تو دکھاوے کے لئے وضو۔ اور وضو
کے مرحلہ سے گذر لئے تو دو ٹکریں مار لینے میں کیا حرج ہے؟ (ہمارے یہی دوست جب پیپلز پارٹی سے
نکل کر بہ امید وزارت اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہوئے تو نمازیں پڑھ پڑھ کر ماتھے پر یہ بڑا گٹا نماز کا
ڈال لیا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آنے کی بجائے '' مسجد '' میں آ گیا) وزارت بچارے کو پھر بھی نہ ملی کیونکہ
اسلامی جمہوری اتحاد والے نمازِ '' معبودِ زماں '' کی بجائے نمازِ '' ضیاعِ وزیاں '' کا شمار رکھتے تھے اور
اب '' انہیں آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد '' یاد آتا ہوگا۔

کالج میں پہلا دن تو خیریت سے گذرا۔ دوسرے روز قیامت آ گئی۔ کاریڈور میں فرسٹ ائر کے لڑکوں کو
گھیرے کھڑے تھے کہ ایک بزرگ استاد نے ہمیں گھیر لیا۔ سوال یہ تھا کہ ہم ننگے سر کیوں کھڑے ہیں؟
اب ہمیں اپنی برہنہ سری کا احساس تو تھا لیکن اپنے '' ننگِ سر '' ہونے کا گمان تک نہیں تھا۔ ہم نے از رہِ
تفنن بڑے ادب سے پوچھ لیا '' جناب آپ کس '' ننگے '' کا ذکر کر رہے ہیں ننگے کا یا '' ننگ '' کا؟ '' اب
بھلا وہ آئیں تو جائیں کہاں؟ قبلہ نے ہمیں '' زبان درازی '' کے جرم میں دھر لیا اور سیدھا پرنسپل صاحب
کے پاس لے چلے۔ ہماری سٹی گم ہو گئی کہ ابتدائے عشق میں ہی کالج سے نکال دیئے جائیں گے اور
سارے ارمان دھرے رہ جائیں گے۔ ہم نے گھگھیا گھگھیا کر اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی چاہی۔
غضب یہ کیا کہ معافی بھی غالب کے لفظوں میں چاہی کہ '' ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد۔ یا
رب یہ اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے؟ ''۔ قبلہ نے کردہ ناکردہ کی تکرار کو اور غالب کے شعر کو بھی ہمارے
نامہء اعمال میں درج کر لیا اور تیزی سے پرنسپل صاحب کے کمرہ کی جانب بڑھنے لگے۔ اتنے میں ہمارا
کل کا ساتھی آ گیا اس نے قبلہ کو جھک کر سلام کیا اور پوچھا خیریت تو ہے آپ نے اس فتنہ سے اپنے دامن
کو آلودہ کیوں کر رکھا ہے اس شخص نے تو عربی بہ طور لازمی مضمون کے اختیار کی ہے اور بی اے تک عربی
میں آنرز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ قبلہ نے یہ بات سنی تو ذرا رکے اور پوچھا کیا واقعی آپ نے عربی کا
مضمون رکھا ہے ہم نے برملا اس گناہ کا اعتراف کیا تو وہ موم ہو گئے فرمانے لگے '' عزیزم عربی پڑھنا بڑا
مشکل کام ہے اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں ''۔ ہم نے کہا '' جی درست فرمایا ایک سخت مقام

تو آج ہی آ گیا تھا''۔ ہمارے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے'' یہ تو بڑا ہا تونی طالب علم لگتا ہے''۔ ہم نے عرض کی کہ جناب شاعر نے غالباً عربی پڑھنے کے بارہ میں ہی کہہ رکھا ہے کہ'' یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا''۔'' فرمایا خوب ہے خوب ہے یہ والا شعر ذرا مجھے لکھوا دینا''۔ آپ نے قلم نکال کر اپنے ''خطِ بشارت'' میں پورے صفحہ پر پھیلا کر یہ شعر نوٹ کر لیا اور ہمیں اجازت دی اس کے بعد ہم چار سال تک ان کی کلاس میں حاضر رہے۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کا معاملہ رہا۔ نہ وہ اپنی نوک جھونک سے رکے نہ ہم نے اپنی سنت جاریہ سے انحراف کیا۔ تا آنکہ چار سال کے بعد یہ ''ننگِ کلاس'' کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارے قصور معاف تو نہیں ہوئے البتہ ان کی سزا میں خاصی تخفیف کر دی گئی یعنی جب کالج کے سٹاف پر آ جانے کے بعد ملاقات ہوتی از راہ کرم مسکرا کر ملتے اور ایک آدھ فقرہ بھی چست کرتے۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تم سا کہیں جسے؟ وہ اپنے اس عقیدہ میں بڑے پختہ تھے کہ جنت کی زبان عربی ہو گی اس لئے ہمیں خشوع و خضوع کے ساتھ یہ زبان سیکھنی چاہئے ورنہ مرنے کے بعد دقت پیش آئے گی مگر ہمارے اس استفسار کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا کہ جنت میں عربی بولی جائے گی اور آپ عربی پڑھاتے تو ہیں مگر بولتے ہیں نہ بولنا سکھاتے ہیں آپ کی پڑھائی ہوئی عربی کس کام آئے گی؟ زچ ہو کر فرماتے تھے یونیورسٹی والوں نے عربی بولنے کو کورس میں شامل ہی نہیں کیا تو اساتذہ عربی بولنا کیوں سکھائیں؟ اور ہم اپنی کج بحثی کی رو میں ان سے کہتے تھے کہ اللہ میاں کو جنت کے نصاب میں عربی بولنے کو لازمی قرار دینے سے پیشتر یونیورسٹی والوں سے مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔ اس پر اور زیادہ زچ ہوتے اور عربی کے مشکل مشکل الفاظ سے ہمیں ڈراتے تھے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اپنی ''انذاری'' گفتگو میں ''مقاماتِ حریری'' کے فقرے کے فقرے بول جاتے تھے اور سننے والوں کو خاطر خواہ عبرت حاصل ہوتی تھی۔

یہ بزرگ کالج کے سینئر اساتذہ میں سے تھے۔ اپنے مضمون میں تیرے ہوئے۔ مدتوں بعد ان کے ایک ہم جماعت دوست نے جو پچاس کی دہائی میں لاہور میں ہندوستان کے قنصل جنرل تھے' ہمیں بتایا کہ آپ نے جوانی میں آئی سی ایس کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر' دین کو دنیا پر مقدم کرتے ہوئے خدمت کے لئے اس کالج میں آ گئے تھے۔ عربی کے سوا کوئی اور'' گناہِ کبیرہ'' ان سے

منسوب نہیں تھا۔نہایت مخلص، بے ریا،محبت پرور اور متقی آدمی تھے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کی عملی تفسیر۔

کالج کی پڑھائی شروع ہوگئی۔ہم پکے اور کھرے بلکہ (پیش کے ساتھ) کھُرے ''مستشرق'' تھے اردو عربی فارسی کے ساتھ منہ کا ذائقہ خراب کرنے کے لئے پہلے اکنامکس رکھی پھر انٹر کے امتحان سے چند مہینے پہلے تاریخ رکھ لی اور فیل ہوجانے کے امتحان سے بچ گئے ورنہ اکنامکس تو ہمیں لے ڈوبتی۔ان مضامین کا ایک'ایک کیا سب سے بڑا' فائدہ یہ تھا کہ ''شوقِ آوارگی'' کی تسکین کے لئے وافر مواقع میسر تھے۔جی چاہا تو کلاس میں چلے گئے نہ چاہا تو نہ گئے البتہ عربی کی کلاس سے غیر حاضری کے لئے ''شرعی'' بہانے تراشنا پڑتے تھے اور یہ بہانے تراشنے کے لئے ہم نے ''باب الحیل'' کا بالاستیعاب مطالعہ کر رکھا تھا۔کالج کے دوسرے سینئر استاد فلسفہ کے استاد تھے جن کے باب میں لوگوں نے ہمیں بہت ڈرا رکھا تھا کہ طبیعت کے بہت سخت ہیں۔''ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔رزمِ'' ادب وشعر میں'' فولاد ہے مومن''۔ اردو کے بڑے نغز گو شاعر ہیں۔ہم نے سوچا شاعر ہیں تو اپنے کلام کے چھپنے پر بہت زیادہ خوش ہوں گے۔ان کی ایک غزل ان سے ایک محفلِ خاص میں سنی اور اپنے ذہن میں محفوظ کر لی۔گھر آ کر وہ غزل کاغذ پر اتاری اور المنار کے اگلے شمارہ میں بڑے طمطراق سے شائع کر دی۔پرچہ کا چھپ کر آنا تھا کہ گویا بھونچال آ گیا۔سنا کہ قبلہ اپنے تمام تیر و تفنگ سمیت ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کدھر ہے وہ نابنجار ایڈیٹر جس نے میرا کلام بلاغت نظام میری اجازت کے بغیر چھاپ دیا ہے؟ مٹا کے خاک نہ کر دوں تو ''داغ'' نام نہیں۔پرنسپل صاحب سے اس دوران آمنا سامنا ہو گیا مسکرا کر فرمایا کیوں میاں سنا ہے آج کل روپوش ہو؟ ہم نے کہا'' جی سنا ہے بزرگ میری تلاش میں ہیں'' فرمایا تلاش سی تلاش؟ خیر مناؤ۔ ابھی ہم اسی مکالمہ میں ''مبتلا'' تھے کہ وہ بزرگ استاد آ گئے۔ہمیں پرنسپل صاحب سے محوِ گفتگو دیکھا تو ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ پرنسپل صاحب سے ان کا افسر ماتحت کا نہیں عشق ومحبت کا رشتہ تھا۔پرنسپل صاحب نے ہمیں ان کے سپرد کیا کہ لیجئے آپ کا مجرم حاضر ہے۔اب ان کی کیا مجال کہ ہمیں کچھ کہیں۔ان کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگ گئی۔ہم حیران پریشان اور سراسیمہ۔کالج کا کاریڈور طلبا سے اٹا اٹ بھرا ہوا۔ہم خاموش کھڑے ہیں اور وہ بزرگ دھاروں رو رہے ہیں۔بارے ان کی طبیعت میں ذرا سا

ٹھہراؤ پیدا ہوا تو فرمایا آپ نے بہت ظلم کیا بہت ظلم کیا اب خدا کے لئے آئندہ ایسا ظلم نہ کیجئے گا اور یہ کہہ کر پھر رونے لگے۔ وہ واپس ہوئے تو ہم ان کے پیچھے پیچھے ان کے حجرہ تک ساتھ آئے۔ فرمایا جائیے میری جان چھوڑ دیجئے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ شاعر بے بدل اپنا کلام سنانے یا چھپوانے کا قائل نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں ''اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں'' درست ہوگا مگر ان دو چار ملاقاتوں نے کم از کم دو سال کا وقت لیا۔ دو سال کے بعد کالج کے ایک مشاعرہ میں ہماری ایک غزل سن کر پسیجے اور ہمیں از راہ کرم اپنے احباب کے زمرہ ء خاصان میں شمار فرمایا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ کلام چھپوانے کی بجائے ہمیں سنا کر نچنت ہو جاتے تھے کہ چلو یہ چیز تو محفوظ ہوگئی۔ سنا ہے ابھی پچھلے دنوں (اور یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں) کسی مشاعرہ میں فرمایا ہمیں شعر یاد نہیں رہتے اس فقیر کا نام لے کر فرمایا کہ وہ ہوتا تو یاد کرواتا کہ اس غزل کا فلاں شعر کیا ہے۔ اب تو ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ شعر تو دور کی بات ہے مصرعے تک یاد نہیں رہتے۔ بہ قول شخصے ہمارا حافظہ اب دروغ گو والا ہو کر رہ گیا ہے۔ ''دروغ گو را حافظہ نہ باشد''۔

سائنس ہم نے پڑھی نہیں مگر گاڑھی چھنی تو سائنس کے اساتذہ کے ساتھ۔ نصیر خان صاحب۔ علی گڑھ کے بانکے سجیلے گریجوایٹ' باسکٹ بال کے کھلاڑی اور کوچ۔ یونین کے انچارج تھے اس لئے ہمیں ان کے سایہ ء عاطفت میں آنا پڑا۔ یونین کے مباحثوں میں حصہ لینے کا شوق چرایا۔ کچھ ٹوں ٹاں سکول کے زمانہ سے کر لیتے تھے کچھ زمانہ ء بیکاری میں اپنے نوجوانوں کی تنظیم میں تقریریں کر چکے تھے اس لئے خیال ہوا کہ یونین میں تقریر کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ مباحثہ کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی نام لکھوا دیا۔ مددگار کارکن نے آ کر کہا نصیر خان صاحب یاد کر رہے ہیں؟ ڈرتے ڈرتے یونین کے دفتر میں گئے۔ ایک نہایت سرخ و سفید' وجیہہ صاحب تشریف فرما تھے چھوٹتے ہی کہنے لگے'' آپ کے بارہ میں بڑی بری بری باتیں سنی ہیں کیا وہ سب ٹھیک ہیں؟''۔ ہم نے کہا'' جی اگر بری بری باتیں سنی ہیں تو یقیناً ٹھیک ہوں گی کیونکہ کوئی اچھی بات تو ہمارے ساتھ منسوب نہیں ہو سکتی''۔ (زیر اور پیش) دونوں کے ساتھ کھل گئے فرمایا '' آپ کے غزل چھاپ دینے کا معرکہ مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ اب کہئے مباحثوں میں آپ کیا کیجئے گا؟''۔ ہم نے کہا'' بحث کریں گے اور کیا کریں گے؟''۔ کہنے لگے'' اپنی تقریر لکھ کر مجھے دکھا دیجئے'' اب

تقریر تو کرنے کی چیز ہوتی ہے لکھ کر پڑھی تو کیا پڑھی مگر اس سے مفر نہ تھا تقریر لکھی ۔ پھر اس کو ''رٹا'' لگایا پھر سٹیج پر آئے ۔ اور شومئی قسمت کہ عین منجدھار میں بھول گئے ۔ بڑی تھڑی تھڑی ہوئی ۔ مخالفین نے خوب لتے لئے ۔ مگر نصیر صاحب خوش ہو گئے کہنے لگے جو مقرر بھولتا ہے اس میں اچھا مقرر ہونے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں ۔ ہمیں رٹا لگانے پر اعتراض تھا مگر بعد کو یہ پڑھا کہ چرچل بھی ہر تقریر پہلے لکھتا تھا پھر اسے رٹا لگاتا تھا ۔ اس کی جتنی معرکتہ الآراء تقریریں ہیں اور اس نے بہ ظاہر فی البدیہہ کی ہیں ساری کی ساری لکھی ہوئی اور باقاعدہ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر مشق کی ہوئی تقریریں ہیں ۔ پہلے ہی مباحثہ میں ایک ایسے صاحب ہمارے حزبِ مخالف میں تھے جو تقریر کم کرتے اور ہاتھ زیادہ چلاتے تھے ۔ ہم نے ان کی تقریر کے رد میں ان کی تقریر کو معرکتہ الآراء تقریر کی بجائے معرکتہ الاعضاء تقریر کہا تو نصیر صاحب نے بہ آواز بلند داد دی اور یونین کا انچارج داد دے تو دوسروں کی کیا مجال ہے کہ داد نہ دیں چنانچہ وہ مباحثہ ہم نے ''لوٹ'' لیا ۔ پھر ہمیں باہر کے کالجوں میں مباحثوں میں جانے کی اجازت ملنے لگی اور اس طرح ہمارا باہر کی دنیا کے دانش وروں سے تعارف ہوا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بخدا ہم ایک بے بہا دولت سے محروم رہ جاتے ۔

سائنس کے آدمی تھے مگر سائنس والوں کی خشکی اور یبوست ان میں نہیں تھی ایسی یبوست کے لئے اور بہت تھے ۔ سائنس والوں میں سے پروفیسر حبیب اللہ خان' علیگڑھ یونیورسٹی کے گریجوایٹ تھے عثمانیہ یونیورسٹی میں کچھ عرصہ اردو میں کیمسٹری پڑھا بھی چکے تھے یہاں کا لیکچر یہاں بھی اردو میں ہونا چاہئے تھا مگر پنجاب یونیورسٹی کا دستور نرالا تھا ذریعہ تعلیم اردو کی بجائے انگریزی تھا مگر حبیب اللہ خان صاحب ذرا جو اس باب میں ہٹیے ثابت ہوئے ہوں کلاس میں کیمسٹری انگریزی میں پڑھاتے اور سائنسی مضامین پر کتابیں اردو میں لکھتے اور حکومت سے انعامات حاصل کرتے تھے غالباً کالج کے پہلے استاد تھے جنہیں ''خلا کی تسخیر'' اور ''سمندر کے عجائبات'' نامی کتاب لکھنے پر انعام ملا ۔ ہمارے کالج میں ایک سے ایک نابغہ استاد بھرا ہوا تھا مگر کالج ربوہ میں منتقل ہوا تو بایالوجی میں سرے سے کوئی استاد تھا ہی نہیں ۔ ایسا بھی ہوا کہ طلبا میں سے ذہین فطین طالب علم خود تیاری کرتے اور اپنے ساتھیوں کو بایالوجی پڑھاتے تھے ۔ عزیزم ڈاکٹر حمید احمد خان اللہ بخشے اتنا تیز طرار بچہ تھا کہ اپنی کلاس کو پڑھاتا بھی تھا اور اپنی پوزیشن بھی برقرار رکھتا

تھا۔ پھر ان کے بعد بعض بی ایس سی پاس اساتذہ بایالوجی پڑھانے لگے۔ کیمسٹری کے استاد برادرم رفیق احمد ثاقب نے خاص طور سے بیالوجی پڑھ پڑھ کر لڑکوں کو بیالوجی پڑھائی تا آں کہ اپنے وقت کے نستعلیق اور وضعدار استاد ڈاکٹر چوہدری نصیر احمد بشیر پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے اور ربوہ کالج میں پڑھانے کے لئے آگئے اس طرح بایالوجی ڈیپارٹمنٹ کی کمی پوری ہوئی۔ پروفیسر نصیر احمد بشیر کی وضعداری کی بات آئی تو یہ بتادوں کہ وہ ربوہ کے آخری شمال مغربی کونے پر بنی ہوئی ایک ڈھنڈار کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے۔ صبح صبح اپنا اکیڈیمک گاؤن زیب تن فرماتے' ننھے منے روسی ٹیریئر کتے کی زنجیر پکڑتے اور خراماں خراماں کالج کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔ گاؤن سے نئے نویلے سوٹ کی حفاظت ہو جاتی اور اس کتے کی خاطر خواہ مشی کا انتظام بھی ہو جاتا۔ کالج پہنچتے تو بعض اوقات کتا بھی ہز ماسٹرز وائس کے کتے کی طرح کلاس میں یا لیبارٹری میں ان کے لیکچر کے لئے گوش بر آواز رہتا۔ نصیر احمد بشیر صاحب جلد ہی پی ایچ ڈی کے لئے امریکہ چلے گئے ان کے بعد سید حبیب الرحمٰن آئے پھر زوآلوجی میں ایک اور نابغہء روزگار استاد محمد شریف خان صاحب آگئے اور یہ حیاتیات کے شعبہ کی ''کمیء خون'' کا تدارک ہوا۔ کالج میں انگریزی کے مضمون کی تدریس کے لئے اساتذہ کی ایسی کمی تھی کہ ایک استاد جو بہ ظاہر سیاسیات کے پرائیویٹ ایم اے تھے سٹاف پر لائے گئے وہ ایف اے کے طلبا کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ خود کسی کالج میں نہیں پڑھے تھے اس لئے ان کا تلفظ مشہورِ خلائق تھا۔ 'Charlotte Bronte' کا نام'' چارلوٹے بردنٹے'' کر کے لیتے تھے۔ ہم مزے لینے کے لئے جان بوجھ کر ان سے یہ نام بار بار پوچھا کرتے تھے۔ پھر ایک سے ایک نابغہ انگریزی کے شعبہ میں آ گیا۔ مرزا خورشید احمد تو انگریزی کے آدمی تھے کنور ادریس صاحب پولیٹیکل سائنس میں ایم اے ہونے کے باوجود ان سے بھی زیادہ انگریزی کے آدمی ثابت ہوئے۔ ایسی نستعلیق زبان بولتے اور ایسی خوبی اور خوبصورتی سے بولتے کہ ہم لوگ کتاب دیکھنے کی بجائے ان کا روئے مبارک دیکھتے رہتے۔ گویا'' ہم ہیں اہلِ کتاب چہروں کے''۔ کہنے کو تو ہم نے ان سے انگریزی پڑھی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ہی ہم نے ان سے نہیں پڑھی۔ بس مکتبِ غمِ دل میں سبق لینے کا مضمون رہا۔ وہ جلدی ہی سی ایس پی کو پیارے ہو گئے۔ ان دنوں اپنی منگیتر ڈاکٹر کے عشق میں'' کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا ہے'' کی تصویر تھے اور سوز و گداز ان کی باتوں کا جوہر تھا۔ جو بات کہتے سیدھی دل میں ترازو ہو جاتی

تھی ۔ دیکھنے میں جو خطا لگتا تھا۔ ہم کو وہ تیر بھی آ لگتا تھا۔ ان کے کالج سے چلے جانے کے بعد ہم دو چار دوست کافی عرصہ تک کلاس میں نہیں جا سکے یہی سوچتے رہے ''تھی وہ اک شخص کے تصور سے ۔ اب وہ رعنائی ءخیال کہاں؟''

ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد اپنی کیمسٹری کی تدریسی کتابوں کی وجہ سے مشہور خلائق تھے ان کا لیکچر تو ہم نے نہیں سنا البتہ ان سے یونین کے سلسلہ میں تعلق رہا کیا مرنجاں مرنج استاد ہیں اللہ ان کی عمر میں برکت دے لندن یونیوسٹی سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تو ہم نے کہا ایک روایت یہ رہی ہے کہ جو لوگ باہر پی ایچ ڈی کرنے جاتے ہیں وہ یا ولایتی میم ساتھ لاتے ہیں یا گاڑی۔ آپ خالی ہاتھ کاغذ کا ایک پرزہ لے کر چلے آئے ہیں۔ فرمانے لگے یہ کاغذ کا پرزہ بھی تو اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔ ان کے اس کہے کی صداقت اس وقت آشکارا ہوئی جب خود اس مرحلہ سے گذرے یا بعد میں ڈاکٹر شریف خان صاحب گذرے۔ پروفیسر شریف خان صاحب جوانی ہی میں بین الاقوامی سائنس ریسرچ جرنلز میں چھپنے لگے تھے۔ نہایت محنتی آدمی ہیں اور ہر وقت اپنے سانپوں کھوؤں مینڈکوں میں گھرے اور چھپکلیوں سے انکھیلیاں کرتے رہتے ہیں ۔ امریکہ کے'' رینگنے والے جانوروں کے حلقہء احباب'' میں بہت نامور ہیں ۔ان کے سینکڑوں ریسرچ پیپرز ان ریسرچ جرنلز میں چھپ چکے ہیں ۔ جب ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ یونیورسٹی میں پیش ہوا تو ان کے ممتحن وہ لوگ تھے جو ان کے ریسرچ پیپرز کا حوالہ دیتے نہ تھکتے تھے مگر جب انہیں ڈگری دینے کا وقت آیا تو انہیں چپ لگ گئی اور کھوے کی طرح دم سادھ لیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ چھ سات برس ان کی ڈگری جاری نہ کی گئی ۔ ان کا بیٹا عزیزی محمد ظفر اللہ ان سے پہلے پی ایچ ڈی ہو گیا باپ کی ڈگری بیٹے کے ڈاکٹر بن جانے کے بعد جاری ہوئی ۔ الحمدللہ کہ یونیورسٹی والوں کو خیال آ گیا ورنہ ان کے پوتے کے پی ایچ ڈی ہو جانے پر جاری کرتے تو ان کا کیا بگاڑ جا سکتا تھا۔ عزیزی ظفر اللہ سے ہم نے اس کا امریکہ کا پتہ پوچھا تو کہنے لگا پتہ یہ ہے میرا نام ''زی'' سے ظفر اللہ لکھئے گا۔ ہم نے کہا بیٹے ہم وضعدار لوگ ہیں ۔ تمہارا نام ظ سے لکھتے آئے ہیں اسی سے لکھیں گے زی سے تو ہم لکھنے سے رہے زیادہ سے زیادہ اتنی رعایت کر دیں گے کہ زیڈ سے لکھ دیں اس سے زیادہ کی ہم سے توقع نہ رکھو۔

ہمارے دوست نصیر احمد خان نے روایت زمانہ برقرار رکھی ڈرہم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری اور

اٹلی سے ایک نئی فوکس ویگن ساتھ لائے ورنہ ہمارے مرزا ''گیسو دراز'' صاحب کی طرح انہیں بھی سسرالی گاڑی پر اکتفا کرنا پڑتا۔ اب کالج کے سٹاف پر کم از کم تین پی ایچ ڈی اساتذہ ہو گئے اور یہ ''مفقصلات'' کے یعنی آس پاس کے چھوٹے شہروں کے کسی کالج کے لئے بڑا اعزاز تھا۔

کالج کے بزرگ اساتذہ کا بڑا علمی دبدبہ تھا۔ پروفیسر اخوند عبد القادر انگریزی کے نامی اساتذہ میں سے تھے۔ پروفیسر میاں عطاء الرحمٰن کی علمی وجاہت کے آگے بڑے بڑے طبعیات دانوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ پروفیسر بشارت الرحمٰن کی عربی دانی اور پروفیسر چوہدری محمد علی کی فلسفہ رانی کے آگے کوئی دم نہیں مارتا تھا۔ کالج کے دو اساتذہ حسن ظہیر اور کنور ادریس اور طلبا میں سے رضا علی، سی ایس پی میں چنے گئے اور بڑی نیک نامی پائی۔ طلبا میں سے اکثر سپیریئر سروس میں آئے فنانس، اکاؤنٹس، ٹیکسیشن، ریلوے، پولیس سروس اور فارن سروس میں تو ہمارے شاگرد بھی پہنچے اور سفیر کے مرتبہ تک ترقی پائی۔ کالج کے طلبا میں سے کئی عدلیہ میں سیشن جج کے مرتبہ تک پہنچے اور ہمارا ایک کلاس فیلو یار محمد اسلام بھٹی تو ہائی کورٹ کا جج ہو کر ریٹائر ہؤا۔ ہمارے ملک میں امتیاز و تفریق کا دور دورہ نہ ہوتا تو کئی ایسے تھے جو ہائی کورٹ کیا سپریم کورٹ تک پہنچتے۔ ابھی پچھلے دنوں کالج کے زمانے کے ایک پرانے دوست بیرسٹر مبشر لطیف یہاں کینیڈا آئے ہوئے تھے اس وقت لاہور ہائی کورٹ میں ان کے شاگردوں کی معتد بہ تعداد ججی کے مناصب پر سرفراز ہے۔ غرض اس کالج کا دائرہ فیضان قومی اور بین الاقوامی حلقوں تک ممتد ہے۔ پولیس میں تو ہمارا ایک شاگرد طاہر عارف ماشاء اللہ آئی جی کے مرتبہ تک پہنچا ہؤا ہے۔ الحمد للہ۔ اور فوج میں ہمارے شاگرد بریگیڈیر کے رینک میں ہیں۔ اللھم زد فزد۔

کالج کا وہ مرتبہ تھا کہ بڑے بڑے عالم اساتذہ، افسر، جج، ادیب اور شاعر اس کالج کی دعوت پر کھچے چلے آتے تھے اور یہاں آنا اپنے لئے باعثِ افتخار گردانتے تھے۔ اس کالج کی یہ روایت رہی کہ کانووکیشن کے لئے ہمیشہ علمی اور ادبی شخصیتوں کو مدعو کرتا تھا۔ پہلی کانووکیشن جو ربوہ میں ہوئی اس میں میاں افضل حسین وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں انگریزی میں لکھا ہؤا خطبہ تھا جب پرنسپل صاحب نے کالج کی روایت کے مطابق اردو میں خطبہ استقبالیہ پڑھا تو میاں صاحب نے انگریزی میں چھپا ہوا خطبہ سامنے رکھ لیا مگر خطاب اردو میں فرمایا۔ سننے والوں کو ذرا احساس نہیں ہؤا کہ وائس چانسلر کا

خطبہ انگریزی میں تھا۔ جب بعد کو وہ خطبہ لوگوں میں انگریزی میں تقسیم ہوا تو لوگ حیرت سے کہنے لگے کہ اتنی جلدی اس خطبہ کا انگریزی میں ترجمہ کیسے ہو گیا ہے یہ میاں افضل حسین کی وضعداری تھی۔ آخر میاں افضل حسین پنجاب کے ایک نامور علمی سیاسی اور شریف خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ میاں افضل حسین ایک بار پھر فزکس کی پوسٹ گریجوایٹ لیباریٹریز کے افتتاح کے لئے بھی تشریف لائے اور کالج کی قدم بہ قدم ترقی کو اپنی آنکھوں ملاحظہ فرمایا اور خوشنودی کا اظہار کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے دو چیف جسٹس کالج میں آئے، جسٹس کیانی اور جسٹس منظور قادر۔ ججوں میں سے جسٹس شیخ بشیر احمد، جسٹس سجاد احمد جان اور جسٹس انوار الحق تشریف لائے۔ وائس چانسلر تو اکثر و بیشتر آتے رہے۔ میاں افضل حسین کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی۔ حکام میں سے وزرا سفرا تو آتے ہی رہے ضلعی اور ڈویژن کی سطح کے حکام جو آج کل ربوہ سے کنی کتراتے ہیں ایک ادنیٰ سے اشارے پر کالج میں آنے کو تیار رہتے تھے اور اس بات کو اپنے لئے فخر گردانتے تھے کہ ہم نے تعلیم الاسلام کالج میں طلباء کے ساتھ کچھ وقت گذارا ہے۔ یہ اسی کی دہائی کی بات ہے کہ ایک اسسٹنٹ کمشنر سے ہم نے کہا کہ ہمارے ہاں آؤ۔ کہنے لگا آؤں تو سر کے بل مگر لوگ الٹا لٹکا دیں گے۔ (ہم نے دل میں سوچا سر کے بل آنے والے کو لوگ الٹا لٹکائیں گے تو "سیدھا" ہو جائے گا)۔ میں نے کہا تمہارا جو کمشنر ہے وہ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما چکا ہے اس کا سر تو سلامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ذرا سے حکام ربوہ آنے سے جھجکنے لگے تھے تو اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ اب ربوہ اور باہر کی دنیا کے درمیان جو پل کالج کی صورت میں بنا تھا وہ منہدم ہو گیا تھا اور کالج کو قومیانے کا یہی لازمی نتیجہ ہونا تھا۔ باہر کی دنیا میں کالج اور سکول قومیائے گئے تو علم اور طلبائے علم کے مابین مفاہمت کا جو پل تھا وہ ٹوٹ گیا۔ ایک شخص کی انا پرستی نے ساری قوم کو کس طرح افراتفری کی دلدل میں دھکیل دیا بعض اوقات ایک عاقبت نا اندیش حاکم کا ایک فیصلہ کس طرح قوموں کو صدیوں پیچھے لے جاتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں بھی ہمارے ادارہ کا امتیاز قائم رہا۔ جس سال کالج ربوہ آیا ہے اسی سال منور سعید نے ایف اے کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی تھی دو سال بعد حمید احمد خان نے پھر یہ کام کر دکھایا حالانکہ اسے تو بیالوجی پڑھانے کو کوئی استاد بھی میسر نہیں تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج میں

ہمارے طلباء کی تعداد ہمیشہ ہی معتد بہ رہی۔ ہم نے کالج کی تمام علمی اور عملی روایات کو اجاگر ہوتے دیکھا ہے۔ آخر اس کالج کا ماٹو بھی تو "علم و عمل" ہی تھا۔ اب پتہ نہیں کیا ہوگا؟ علم و عمل تو رہا نہیں۔ ہم کالج کے تو میاں ئے جانے کے بعد ۱۹۷۵ میں اسی کالج سے جاپان کی اوساکا یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر گئے تھے واپس تو ان لوگوں نے آنے نہیں دیا اور ہمارے "وزیر شاگرد" کی "سرتوڑ" کوششوں کے باوجود نہیں آنے دیا۔ (سرتوڑیوں کہ جس وزیر شاگرد نے ہمارے بارہ میں حکم جاری فرمایا تھا کہ انہیں ربوہ کالج میں تعینات کر دیا جائے اسے اوپر سے جھاڑ پڑی۔ مجھ سے کہنے لگے "سر اب آپ اپنی بات پر اصرار نہ کیجئے گا مجھے تو ایسی جھاڑ پڑی ہے کہ "سرٹوٹ" گیا ہے) مگر بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ پروفیسر نصیر خان صاحب کہنے لگے کہ ہمیں اس زمانے کے کالج کے پرنسپل صاحب سے از رہِ خلق ملاقات ضرور کرنی چاہیے۔ ہم گئے۔ دیکھا کہ پرنسپل کی کرسی پر (یعنی اس کرسی پر جس پر حضرت مرزا ناصر احمد، قاضی محمد اسلم، چوہدری محمد علی) جیسے پرنسپل بیٹھ چکے تھے ایک صاحب تشریف فرما ہیں یوں کہ ٹانگیں میز پر رکھی ہیں اور اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر فرمایا اچھا تو آپ ہیں پرواز ی صاحب؟ ہم نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تو فرمانے لگے مگر آپ کی تو اس کالج میں کوئی جگہ نہیں۔ ہم نے کہا ہم اسی کالج سے گئے تھے اس لئے اصولاً اسی کالج کے پرنسپل سے سلام روستائی کے لئے آئے ہیں۔ کہنے لگے "وہ کیا ہوتا ہے؟" ہم نے کہا" بس ہوتا ہے"۔ قبلہ پرنسپل صاحب نے یہ تک نہیں فرمایا کہ بیٹھ جایئے۔ ہم اس کرسی کی اتنی رسوائی نہ دیکھ پائے اور سلام کر کے باہر آ گئے باقی جو کچھ آپ نے کہا سنا وہ بے معنیٰ باتیں تھیں اس لئے ہم نے لکھنا بھی مناسب نہیں سمجھیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہم سرگودھا بورڈ کے سکرٹری سے ملنے کے لئے گئے۔ چٹ اندر بھجوائی تو سکرٹری صاحب لپک کر خود دروازہ تک ہمارے استقبال کو آئے بڑی محبت سے اپنے بچھڑے ہوئے دوست کو اندر لے کر گئے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہی پرنسپل صاحب بیٹھے تھے بہت حیران ہوئے کہ میں نے تو اس شخص کو بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا یہ سکرٹری صاحب اس شخص سے اتنی ملاطفت سے کیوں پیش آ رہے ہیں؟ سکرٹری صاحب نے جب اپنے مددگار کارکن کو ہمارے لئے اہتمام اور سلیقہ سے چائے لانے کو کہا تو نہ رہ سکے سکرٹری صاحب سے کہہ ہی بیٹھے کہ جناب میں کب سے یہاں بیٹھا ہوں آپ نے مجھے تو پانی تک نہ پوچھا ان کے لئے چائے اور بڑی مفصل چائے لانے کا آرڈر آپ نے دیا ہے اس کی

کیا وجہ ہے؟ سکرٹری صاحب ہمارے پرانے دوست تھے انہیں تو آگ لگ گئی کہنے لگے پرنسپل صاحب آپ بورڈ کی میٹنگ کے لئے بورڈ والوں کے مہمان ہیں ڈاکٹر صاحب میرے پرانے اور ذاتی دوست ہیں ہم لوگ ربوہ بھی جائیں تو کبھی کالج والوں کو تکلیف نہیں دیتے ان کے گھر چلے جاتے ہیں جہاں ہمیں وقت بے وقت کھانا بھی میسر آ جاتا ہے اور چائے بھی مل جاتی ہے۔ اب وہ چار سال کے بعد میرے پاس مجھے ملنے کو آئے ہیں تو میں ان کی اتنی بھی خاطر داری نہ کروں؟

پرنسپل صاحب نے نہایت چھچھوری بات کی تھی سکرٹری صاحب نے منغض ہونے کے باوجود ان کی بات ٹال دی مگر پرنسپل صاحب کا اندرونی بغض کہاں چھپتا۔ ذرا سی دیر کے بعد ہم سے مخاطب ہوئے اور کہا ''ڈاکٹر صاحب مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ربوہ میں میرے خلاف باتیں کرتے پھرتے ہیں''۔ ہم نے کہا ''جناب والا میرا کیا مرتبہ ہے کہ میں آپ کے خلاف باتیں کروں؟ میں آپ کا ماتحت نہیں، آپ کا رفیق کار نہیں، حتیٰ کہ آپ کو جانتا تک نہیں۔ ایک بار کالج کے دفتر میں آپ سے ملنے کو گیا تھا تو آپ نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا اس لئے میں آپ کے خلاف کیا باتیں کروں گا؟''۔ فرمایا ''مجھے معتبر لوگوں نے بتایا کہ آپ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ میں نے کالج کا ستیاناس کر دیا ہے''۔ ہم نے پولے سے منہ سے جواب دیا ''مگر حضور والا یہ بات آپ کے خلاف کیسے ہوئی؟''۔ کمرہ میں جتنے لوگ موجود تھے وہ سب ہنسنے لگے اور پرنسپل صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ تو جناب اگر اداروں کو ایسے ہی نااہل لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو یہی ہوتا ہے۔ محکمہ تعلیم نے چن چن کر ایسے پرنسپل اس کالج میں بھیجے کہ اس کالج کی روایات کو ملیا میٹ کر دیں کہ الامان والحفیظ۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے ہمارا مظفر گڑھ کے زمانہ کا رفیق کار اور دوست ایم اے مسعود چوہدری ایم اے کالج کا پرنسپل بن کر آیا تو کالج والوں کو کچھ امان ملی۔ تھوڑے عرصہ کے لئے ڈاکٹر مظفر عباس بھی آئے۔ اب سنا ہے ہمارے شاگردوں کی نسل کا ایک طالب علم عزیزم مقبول احمد پرنسپل کی کرسی پر سرفراز ہے چنیوٹ کا شریف بچہ ہے اور تعلیم الاسلام کالج کے زینہ سے اوپر گیا ہے مگر اس کے لئے جائے ماندن نہ پائے رفتن کا معاملہ ہے، کس کو خوش رکھے۔ مولویوں کو؟ مگر یہ قوم تو خوش ہونے سے رہی۔ ایک بار ہم کسی کام سے چنیوٹ کے اسسٹنٹ کمشنر سے ملنے کو گئے۔ غالباً جاوید محمود ان کا نام تھا۔ ہم گئے تو اس وقت وہ عدالت کی کرسی پر متمکن تھے ان کی عدالت میں کم و بیش دس بارہ وکلا پیش

تھے ہم داخل ہوئے تو سب کے سب ہماری جانب بڑی محبت سے متوجہ ہو گئے' اسسٹنٹ کمشنر صاحب عدالت برخواست کر کے اپنے چیمبر میں چلے گئے اور ہمیں باریابی کا شرف بخشا۔ کہنے لگے'' یہ چنیوٹ تو آپ کا مخالف شہر ہے مگر یہاں کے وکلا آپ کے بڑے مداح لگتے ہیں؟ ہم نے انہیں بتایا کہ جتنے وکلا تھے وہ اتفاق سے سب کے سب ہمارے شاگرد تھے اس لئے انہوں نے استاد کی جانب محبت آمیز التفات دکھایا تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ کہنے لگے'' آپ کے شاگرد ہیں یعنی ربوہ کالج میں پڑھے ہوئے ہیں؟'' ہم نے انہیں بتایا کہ چنیوٹ شہر کے شرفا اپنے بچوں کو ربوہ کالج میں پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے اب بھی بھیجتے ہیں اگر چہ اب وہ'' مولوی مدن کی سی بات نہیں''۔ چنیوٹ میں جو بھی پڑھا لکھا آدمی نظر آئے گا وہ ربوہ کالج کا پڑھا ہؤا ہوگا ہمارا کالج شرفا کا کالج تھا اور چنیوٹ شہر میں صرف مولوی ہی نہیں رہتے شریف لوگ بھی رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم کی علی الاعلان پالیسی یہ رہی کہ اس کالج میں کسی احمدی کو نہیں لگایا جائے گا۔ جو ریٹائر ہو جائیں گے ان کی جگہ غیروں سے پر کی جائے گی جو باہر جائے گا خواہ وہ پی ایچ ڈی کے لئے گیا ہو یا پڑھانے کے لئے' واپسی پر اسے اس کالج میں تعینات نہیں کیا جائے گا۔ مرزا انس احمد جب ایم فل کر کے آکسفورڈ سے واپس آئے تو اس کالج میں نہیں آئے۔ انہیں حضرت صاحب نے جامعہ میں لگا دیا۔ جب ایسا تعصب پالیسی کا حصہ بن جائے تو اداروں کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے؟ پھر ایسے متعصب اساتذہ خاص طور سے دور دور سے تبادلہ کر کے اس کالج میں لائے جائیں جو اس کالج کی روایات کو مٹانے کے درپے ہوں۔ طلبا کی دل آزاری کریں' روایتوں کا مضحکہ اڑائیں۔ آفرین ہے اپنے بچوں پر بھی کہ یہ سب کچھ انگیز کر لیا مگر کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ تعلیم الاسلام کالج میں ہڑتال ہوئی ہے۔ یہ اس کالج کی روایت تھی کہ سارے کالج ہڑتالیوں نے بند کروادیئے ہوتے تھے مگر تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ ایک بار میاں عطاء الرحمٰن صاحب کی قائمقامی کے زمانہ کی بات ہے' افواہ اڑی کہ چنیوٹ کالج میں ہڑتال ہوگئی ہے اور وہ لوگ ربوہ کی جانب بسوں میں بڑھ رہے ہیں کہ اس کالج کو بھی بند کروادیں۔ ہمارا پیریڈ ہمیشہ سے پہلا پیریڈ ہوتا تھا اور کلاس کیا ہوتی تھی ایک انبوہِ غفیر ہوتا تھا کیونکہ لازمی اردو پڑھانے والا ہمارے علاوہ اور کوئی استاد تھا ہی نہیں۔ میاں عطاء الرحمٰن صاحب نے اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ ایسا نہ ہو چنیوٹ

والے فسادی آ پہنچیں اور کوئی ناگوار صورت پیدا ہو جائے آپ اپنا لیکچر ذرا لمبا کر دیں۔ ہم نے اپنا پہلا پیریڈ ذرا لمبا کر دیا اتنے میں سیکنڈ ائر والے اپنی کلاسوں سے فارغ ہو کر اپنے پیریڈ کے لئے آ پہنچے ہم نے انہیں بھی اندر بلا لیا اور ہال کھچا کھچ بھر گیا ہم نے شاعری کے کسی ''لذیذ'' موضوع پر لیکچر دینا شروع کر دیا اس روز کچھ زیادہ ہی زورِ بیان اللہ میاں نے دے دیا بچوں کو پتہ تک نہیں چلا کہ ایک دو نہیں تین پیریڈ گذر گئے ہیں اور ابھی ہمارا موضوعِ سخن تشنہ ہے اور بچے یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس موضوع پر بولتے چلے جائیں جب شادی نے آ کر ہمیں جھڑکا کہ ''بس کرو جی باقی استاد سٹاف روم میں بیٹھے آپ کو کوس رہے ہیں'' تو ہم نے کلاس چھوڑی۔ بات رفت گزشت ہوئی نہ بچوں کو پتہ چلا کہ ہماری اس ''طول کلامی'' کی لم کیا تھی نہ ہڑتالیوں کو کالج میں آ کر ہمارے بچوں کو گمراہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ ہمارے کالج کی روایتیں تھیں۔ ایک استاد میں اتنا حوصلہ ہوتا تھا کہ وہ پانچ سولڑکوں کو اپنے لیکچر میں روکے رکھے وہ روکتا تھا بچے رکتے تھے اور اب کسی ایک طالب علم کو روک کر تو دیکھئے؟

بات ہم نے کالج میں پہلے دن سے شروع کی تھی مگر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کالج میں کچھ دن تو فولنگ کی ہماہمی رہی اس کے بعد زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی یعنی کلاسیں، مباحثے، مشاعرے، تقریبات۔ پہلی کانووکیشن کا ذکر تو ہو چکا، یونین کے پہلے مباحثوں کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے انعقاد کے لئے کالج میں ہال تو تھا کوئی نہیں اس لئے لجنہ سے ہال مستعار لیا گیا تھا۔ انٹر کالجیئیٹ مباحثوں کا نام تو بہت سنا تھا دیکھے یا سنے نہ تھے ربوہ والوں کے لئے ویسے بھی یہ نام عجوبہ تھا خیر مباحثے ہوئے ہال کھچا کھچ بھرا رہا مگر اصل رونق تو شام کے ڈنر کی تھی۔ پروفیسر نصیر خان صاحب نے کالج کی چھت پر ایسا الف لیلوی انتظام کر رکھا تھا کہ باید و شاید۔ روشنی کے لئے یوں تو ان کا رخِ زیبا ہی کافی ہوتا مگر فرش پر دسترخوان بچھائے گئے اور قطار در قطار چراغ رکھے گئے۔ یوں بھی منڈیروں پر چراغاں کا سماں تھا۔ ہمیں یاد ہے باہر کے کالجوں کے جو مقرر اس میں شریک ہوئے وہ مدتوں اس الف لیلوی ڈنر کو یاد کرتے رہے۔ پھر پرنسپل صاحب یہ مہربانی فرماتے تھے کہ صبح کا ناشتہ مہمان مقررین کے ساتھ کرتے تھے اور ناشتہ بھی مالیر کوٹلہ کا نوابی ناشتہ ہوتا تھا۔ مالیر کوٹلہ کے نوابی ناشتہ سے یاد آیا کہ ۱۹۶۶ میں پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی جوہر آباد سے واپسی پر ربوہ رکے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے ملاقات کا شرف حاصل کیا

حضرت صاحب نے از راہ بندہ پروری مجھے اور چوہدری محمد علی صاحب کو بھی ان کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر مدعو کرلیا۔ وہاں مالیر کوٹلہ والوں کے خاص شاہی ٹکڑے میٹھے کے طور پر موجود تھے۔ ہم لوگ ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔ حمید احمد خان صاحب حضرت صاحب کے بے تکلف دوست تھے کہنے لگے "مرزا صاحب سنا تھا مغلوں کے دسترخوان پر جنت کی نعمتیں موجود ہوتی تھیں آج دیکھ بھی لیا"۔ حضرت صاحب نے فرمایا لیکن یہ شاہی ٹکڑے میری بیوی نے مالیر کوٹلہ کے نسخہ سے تیار کروائے ہیں۔ ہاں یہ گاجر کا جومربہ آپ نے کھایا ہے یہ مغلئی نسخہ ہے اس میں میٹھا خالص شہد کی مٹھاس کا ہے۔ حضرت آپا منصورہ بیگم کے ہاں کے شاہی ٹکڑے تو ہم نے پہلے بھی کھائے تھے لیکن اس روز کا مزا ہی کچھ اور تھا شاید اس لئے کہ پہلے وہ پرنسپل کی بیگم کے طور پر تیار کرواتی تھیں اب ان میں خلافت کے مرتبہ کا تبرک بھی شامل تھا۔ یہ لکھتے لکھتے خیال آرہا ہے کہ ہمارا کالج بھی کیسا بابرکت ادارہ تھا کہ اس کا ایک پرنسپل منصب خلافت پر فائز ہوا اب ایک طالب علم منصب خلافت پر سرفراز ہے۔ ایک ادارہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا فخر و تفاخر و مباہات کی بات ہوسکتی ہے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤتِیْہِ مَن یَّشَآءُ۔

ہمارے کالج کا تشخص ایک خالص علمی ادارہ کا تھا۔ اس میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ طلباء کو محض امتحانوں کے لئے تیار نہ کیا جائے بلکہ ان کے ذہنوں میں وسعت پیدا کرنے کے لئے زائد از نصاب سرگرمیاں جاری رکھی جائیں چنانچہ اس مقصد کے لئے یونین اور مجلس ارشاد کے علاوہ جو کالج گیر مجالس تھیں ہر مضمون کے طلباء کی علیحدہ بزمیں موجود تھیں۔ بزم اردو اگرچہ اردو پڑھنے والوں کی بزم تھی مگر اس کا دائرہ بھی سارے کالج تک ممتد ہو گیا تھا اور اس کے عہدیداروں میں ایسے طلبا بھی شامل ہوتے تھے جو اردو کے طالب علم نہیں تھے۔ اردو قومی زبان ہونے کے علاوہ احمدیوں کے لئے مذہبی اہمیت بھی رکھتی تھی اسلئے ۱۹۶۴ کی پہلی اردو کانفرنس کے موقع پر پرنسپل صاحب نے اس کانفرنس کو یہ نعرہ دیا تھا کہ "اردو ہماری قومی زبان ہی نہیں مذہبی زبان بھی ہے" اور یہ سلوگن اردو کانفرنس کے پیڈ پر اور ہر چھپے ہوئے پروگرام پر موجود تھا۔ ۱۹۶۷ کی دوسری کانفرنس کے وقت تو اس کانفرنس نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی اور اس میں سارے پاکستان سے کوئی دو سو سے زائد مندوبین شامل ہوئے۔ پاکستان ریلوے نے مندوبین کے لئے کرایہ میں خاص رعایت کا اعلان کیا۔ کراچی سے ہی جو قافلہ آیا اس میں کراچی یونیورسٹی

کے وائس چانسلر، شعبہ اردو کے سربراہ، اردو کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے عہدیدار شامل تھے۔ صدر ایوب سے پیغام بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی وہاں سے پوچھا گیا اور کس کس کے پیغامات پڑھے جائیں گے؟ ہم نے بتایا سرفہرست تو حضرت امام جماعت احمدیہ کا پیغام ہے تو انہیں چپ لگ گئی۔ کئی سال بعد میری قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ہوئی جو صدر کے سکرٹری تھے۔ اسلام آباد کی ایک ادبی تنظیم ''دائرہ'' کے اجلاس میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ میرا تعارف ہوا تو چونکے کہنے لگے آپ اردو کی بہت خدمت کررہے ہیں۔ میں نے کہانہیں میں نہیں میراادارہ اس نیک کام پر مستعد ہے مگر صدر مملکت تو پیغام بھیجنا گوارانہیں کرتے۔ کہنے لگے اگر آپ ذرا سی عقل سے کام لیتے تو پیغام آجاتا۔

ہم نے کہاوہ کون سی عقل کی بات ہے۔ کہنے لگے آپ سے کس نے کہا تھا کہ امام جماعت احمدیہ کے پیغام کا ضرور ذکر کریں بس اسی بات نے کام خراب کردیا۔ ہم نے کہا جناب والا اگر یہی بات ہے تو ایں گناہیست کہ درشہرِ شمانیز کنم۔ اور حافظ کا شعر بھی پڑھ دیا: ''عقل گرداند کہ دل دربندِ زلفش چوں خوش است۔ عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما''۔ ہمارے لئے یہی بے عقلی بس ہے۔ بعد کو جب شہاب صاحب کی شہاب نامہ پڑھی تو معلوم ہوگیا کہ پیغام کی اس نارسائی میں شہاب صاحب کی اپنی متعصب ذہنیت کارفرما تھی۔ ہمیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

نصیر صاحب یونین کے انچارج تھے تو وہ اس بات کا اہتمام کرتے رہتے تھے کہ مباحثوں میں جج صاحبان ایسے ہوں جو علمی اور ادبی لحاظ سے نمایاں ہوں مثلاً اس وقت میرے سامنے احسان دانش کی خودنوشت جہانِ دانش کا دوسرا حصہ پڑا ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ربوہ کالج کے مباحثہ میں وہ اور پروفیسر وقار عظیم جج کے طور پر لاہور سے تشریف لائے تھے وہاں ان کی ملاقات تیسرے جج ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عابد احمد علی گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل تھے اور ہمارے پرنسپل صاحب کے آکسفورڈ کے زمانہ کے ہم عصر تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے گورنمنٹ کالج سرگودھا اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ایک خاص رشتۂ مؤدت قائم ہوگیا تھا۔ ہمیں یاد ہے ایک باراس کالج کی ہاکی ٹیم ربوہ میچ کھیلنے کے لئے آئی۔ دفتر امور عامہ کے پاس جو گراؤنڈ ہے اس میں میچ ہوا۔ ہمارے پرنسپل صاحب نے خاص طور سے یہ اہتمام رکھا کہ اس کالج کی ٹیم کے ساتھ نہایت مربیانہ سلوک روا رکھا جائے۔ اس میچ میں ڈاکٹر

عابد احمد علی بھی تشریف لائے تھے ہمارے پرنسپل صاحب بھی ہاکی کا یہ میچ دیکھنے کے لئے آئے حالانکہ انہیں صرف باسکٹ بال کے میچوں میں دلچسپی تھی۔ پھر خان عبدالعلی خان گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل بن کر آئے تو وہ بھی آکسفورڈ کے ناتے سے ہاکی کی ٹیم کے ساتھ آئے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے تو ہمارا دانت کاٹی روٹی کا تعلق تھا فرسٹ ایر میں ہم مباحثہ کے لئے گئے تو جیلانی صاحب نے کہ وہاں کی یونین کے انچارج تھے ہمیں اپنے سایہء عاطفت میں رکھا یہانتک پوچھ لیا کہ بچو تقریریں ٹھیک طور سے رٹی ہوئی ہیں کہ نہیں؟ جیلانی صاحب پرنسپل ہو گئے تو ہمیں اپنے کالج کے مباحثہ میں جج کے طور پر بلایا اور ہمارے تعارف میں خاص طور سے کہا کہ میں اس شخص کو فرسٹ ایر کے طالب علم کی حیثیت سے جانتا ہوں جب اس نے انٹر کالجیٹ مباحثوں میں پہلی تقریر اسی کالج کے سٹیج پر کی تھی

اب میں نے اسے اسی کالج کے مباحثہ میں جج کے طور بلایا ہے۔ کیسے مہربان لوگ تھے۔ جیلانی صاحب کا ہمارے کالج کے ساتھ ہی نہیں کالج کے طلبا اور اساتذہ اور پرنسپل صاحب سے والہانہ تعلق تھا اب ایسی بر کھا محبت کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ میں اب بھی سرگودھا میاں عبدالسمیع نون صاحب کو' جو کالج کے اولڈ بوائے ہیں' خط لکھتا ہوں تو جیلانی صاحب کو ضرور سلام بھیجتا ہوں اور وہ بھی بزرگانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب میں پیار بھیجتے رہتے ہیں۔ (نون صاحب تین چار برس پہلے کینیڈا آئے ہوئے تھے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے ساتھی سے ان کا تعارف کروایا کہ ہمارے کالج کے اولڈ بوائے ہیں۔ کہنے لگے تمہارے منہ میں گھی شکر ذرا یہ بوائے والی بات پھر کہنا)۔

پہلے یا دوسرے مباحثہ کے موقع پر مولانا عبدالمجید سالک' شیر محمد اختر (مدیر قندیل) اور مشہور شاعر نازش رضوی جج کے طور پر آئے تھے۔ سالک صاحب کے والد اور دوسرے بھائی احمدی تھے مگر سالک صاحب حضرت صاحب کی بیعت میں نہ تھے مگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ اور ان میں ہم عمری کی وجہ سے خاصہ دوستانہ تھا اور دونوں میں بے تکلفی بھی بہت تھی۔ مباحثوں کے بعد حضرت صاحب نے ان حضرات کو کھانے پر بلایا۔ نصیر صاحب نے بعد کو بتایا کہ کھانے کے بعد حضرت صاحب نے سالک صاحب سے فرمائش کی کہ اپنا کلام سنائیں۔ سالک صاحب نے اپنی مشہور غزل ''چراغِ زندگی ہوگا فروزاں' ہم نہیں ہوں گے۔ چمن میں آئے گی بادِ بہاراں' ہم نہیں ہوں گے'' اپنے مخصوص ترنم میں سنائی۔ نازش صاحب

نے بھی کلام سنایا۔ شیر محمد اختر شاعر نہیں تھے محض تخلص رکھنے کے گنہگار تھے اس لئے وہ بچ گئے۔ اس کے بعد سالک صاحب حضرت صاحب سے کہنے لگے ’’حضور اب آپ بھی کچھ سنائیں‘‘۔ حضرت صاحب نے کہا بھئی میں کوئی شاعر واعر تو ہوں نہیں ہاں تبلیغ کے لئے کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ سالک صاحب نے بیچ ہی میں بات پکڑ لی ’’بس۔ بس۔ حضور ہم تین غیر احمدی آپ کے پاس حاضر ہیں ہمیں تبلیغ کریں‘‘ چنانچہ حضرت صاحب نے اپنا کلام عطا فرمایا۔

اگلے روز ہم نے بزمِ اردو میں سالک صاحب سے اردو کے فکاہی ادب پر تقریر کروائی۔ تقریر کے بعد میں نے سوال کر دیا کہ آپ کے فکاہیوں کی بڑی شہرت ہے کوئی فکاہیہ سنائیں۔ فرمانے لگے فکاہیہ کوئی شعر تو ہوتا نہیں کہ یوں سنایا جائے اور ہر فکاہیہ کا ایک پس منظر ہوتا ہے وہ سامنے نہ ہو تو فکاہیہ میں معنویت پیدا نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر آپ نے کہا کہ ۱۹۴۰ میں لاہور ریزولیوشن جسے قرارداد پاکستان کہتے ہیں مسلم لیگ کے اجلاس میں منظور کیا گیا۔ اس موقع پر کانگریس والوں نے راوی کے کنارے ایک اجلاس کر کے اکھنڈ بھارت کی قرارداد منظور کی۔ کہنے لگے اس اکھنڈ بھارت کی قرارداد کی منظوری کے بعد میں نے فکاہیہ لکھا کہ کانگریس والوں نے راوی کے کنارے اکھنڈ بھارت کی جو قرارداد منظور کی ہے وہ ’’دروغ برگردنِ راوی‘‘ ہے۔ سب لوگ اس بے ساختگی پر عش عش کر اٹھے اور کیمسٹری تھیٹر داد و تحسین کے نعروں سے گونجنے لگا۔

شیر محمد اختر کی ایک بات مجھے نہیں بھولتی۔ کسی مباحثہ میں جج کے طور پر آئے ہوئے تھے مجھے کہنے لگے ’’یار مجھے کسی دن میاں طاری سے ملواؤ‘‘۔ میں نے کہا آپ انہیں جانتے ہیں؟ کہنے لگے ہاں ہمارے باپ دادا ان کے دادا سے بیعت تھے اور میری امی میاں طاری کی تو بچپن سے عاشق تھیں کہا کرتی تھیں کہ اس لڑکے نے ایک دن خلیفہ بن جانا ہے۔ میں زندہ رہی تو اس کی بیعت کرلوں گی۔ اب وہ تو اس دنیا میں رہیں نہیں جی چاہتا ہے میں ماں کی طرف سے انہیں دیکھ لوں۔ چنانچہ میں انہیں میاں صاحب کے پاس لے گیا اور بتایا کہ اپنی امی کی طرف سے آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ اگلی بات کہنے کا محل تھا نہ موقع مگر اس مرحومہ کی بات کیسی صحیح نکلی۔ شیر محمد اختر کے باپ دادا تو احمدی تھے مگر انہیں کچھ عرصہ تک جماعت لاہور سے تعلق رہا پھر وہ بھی نہ رہا۔ جماعت کے بارہ میں تعصب بھی ان کے اندر نہیں تھا اور نہ جو لوگ

جماعت سے دور بھاگتے ہیں وہ '' بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کے وفادار بننے کی نیت سے '' جماعت کی مخالفت بھی بہت کرتے ہیں ۔ شرفا ایسی باتوں سے دور بھاگتے ہیں ۔ مثلاً یہی شیر محمد اختر تھے' پروفیسر جیلانی کامران تھے ۔ عارف عبدالمتین تھے ۔ یہ لوگ اپنے آبا و اجداد کی احمدیت کا برملا اعتراف کرتے تھے مگر احمدیت یا بانیء سلسلہ کے خلاف ان کی زبان شوخی نہیں دکھاتی تھی ۔ مگر جو شوخ طبع لوگ احمدیت سے بھاگیں ان کا انجام وہی ہوتا ہے جس کا ذکر میں کرنے لگا ہوں ۔ زیڈ اے سلہری' جانے پہچانے صحافی تھے مگر ابھی کل ہی ایک دوست نے ان کی خودنوشت "Boys will be Boys" پر ان کی بیٹی کا تبصرہ ای میل سے بھیجا ہے کہ میرا باپ شراب پیتا تھا ۔ سؤر کھاتا تھا مگر اس '' جنونی جرنیل ضیاء الحق'' یعنی ضیاء الحق کا بڑا مداح اور اسلام کا '' شیدائی '' تھا ۔ یہ گواہی کسی باہر کے فرد کی نہیں اس کی اپنی بیٹی کی ہے جو ایک عیسائی سے بیاہی ہوئی ہے ۔ اس شخص نے احمدیت کی مخالفت میں غیروں سے بڑھ کر زورِ قلم دکھایا اور ہمیشہ منہ کی کھائی ۔ ذلت و رسوائی نے مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا ۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار ۔

یادنویسی کی ایک مصیبت یہ ہوتی ہے کہ لکھتے لکھتے' باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں اور ذہن کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے ۔ واپس لوٹ کر اپنی طالب علمی کی طرف آرہے ہیں ۔ ایف اے ایف ایس سی کے امتحان میں ہمارے ساتھ سائنس کے بڑے بڑے نابغے تھے وہ تو اپنی ایف ایس سی میں اچھے نمبر لے کر انجینئرنگ یا میڈیکل میں چلے گئے ہمارے حریف نابغے جو آرٹس کے امتحان میں شریک تھے پیچھے رہ گئے اور ہم ایف اے کے امتحان میں اپنے کالج میں اول رہے اور وظیفہ پایا ۔ اب ہاسٹل میں رہنے کا موقع ملا ۔ کیوبیکل نمبر ایک ہمارا کمرہ تھا اس زمانہ میں ہاسٹل کی کھڑکیوں کی جالیوں پر سبز رنگ کیا گیا تھا کہ دھوپ کی تمازت کم رہے ۔ ایک روز ہم لوگ نیاز مرحوم کے کمرہ میں بیٹھے حسب معمول سٹڈی کے وقت میں گپ لگا رہے تھے (یا شاید تاش کھیل کر پتے سمیٹ کر بیٹھے تھے) کہ یوں محسوس ہوا کوئی صاحب باہر سے جالی پر آنکھیں ٹکائے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ہم تو دیکھ نہیں سکتے تھے کون صاحب ہیں اور کس مقصد سے جھانکا تاکی کر رہے ہیں ۔ نیاز نے اپنی جاٹوں کی زبان میں کہا '' ارے بھئی کون ہو؟ نقلیں کیوں مار رہے ہو؟ '' ۔ باہر سے آواز آئی '' مرزا ناصر احمد '' ۔ اب ہمارا تو وہ حال ہوا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ۔ مگر

ہمارے پرنسپل بڑے حوصلہ مند پرنسپل تھے۔ مزید کچھ کہے سنے بغیر واپس چلے گئے۔ اور کالج میں اس کا کچھ چرچا نہ ہوا کہ پرنسپل صاحب نے کس کمرہ میں کتنے چور پکڑے تھے؟۔

خدا خدا کر کے ہم تھرڈ ایر میں پہنچے تو یونین کا الیکشن لڑنے کا خیال آیا۔ کیونکہ سکرٹری تھرڈ ایر میں سے اور نائب صدر فورتھ ایر میں سے چنا جاتا تھا۔ صدر پرنسپل صاحب خود ہوتے تھے۔ خدا کا کرنا یہ ہؤا کہ یونین کے کسی اجلاس میں انچارج یونین نے کہ ہمارے پروفیسر نصیر احمد خان ہوتے تھے، کسی بات پر ناراض ہو کر یونین کے کسی عہدیدار کو برطرف کر دیا۔ ہم اس زمانہ میں نوائے وقت اخبار کے نمائندہ ہؤا کرتے تھے ہم نے یہ خبر اخبار کو بھیج دی جو چھپ گئی۔ اب ہماری شامت آ گئی کہ کالج کی خبر باہر کیوں چھپوائی ہے؟ ہم نے بہتیرا کہا کہ یہ کون سی ایسی خفیہ خبر تھی کہ اس کا چھپنا گناہ ہوتا؟ مگر نصیر صاحب آخر نصیر صاحب تھے کسی صورت میں ہمیں معاف کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

پرنسپل صاحب بڑے مزے سے صاحبِ یونین اور ''مقرر یونین'' کا تماشہ دیکھتے رہے تا آنکہ اسی مقرر نے تھرڈ ائر میں پہنچ کر سکرٹری کے طور پر الیکشن لڑنے کا ارادہ کر لیا۔ خوب زوروں کی کنویسنگ ہوئی۔ خیال تھا کہ شاید ہم جیت ہی جائیں گے مگر عین الیکشن سے دو روز قبل ایک نوٹس نوٹس بورڈ پر آویزاں پایا گیا کہ ہم نے کالج کی ایک خبر نوائے وقت میں چھپوائی تھی اور یہ ناقابلِ معافی جرم ہے اس لئے ہمیں الیکشن لڑنے کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے۔ کالج میں سنسنی پھیل گئی۔ پرنسپل صاحب باہر تھے ان کے واپس آنے میں کئی روز کا وقفہ تھا الیکشن دو روز بعد ہونا تھا ہؤا اور ہمارے دوست اور پرانے ساتھی مرزا انس احمد بلا مقابلہ سکرٹری بن گئے۔ وہ جو خیال تھا کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پرنسپل صاحب واپس تشریف لائے تو اس سارے حادثہ کا انہیں علم ہؤا آپ نے یونین کے انچارج صاحب کو اور ہمیں بلا کر ہماری صلح صفائی کروا دی۔ بڑا مزا اس پیار میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ وہ صلح صفائی ایسی دوستی میں بدل گئی جسے پھر کوئی گزند نہیں پہنچا۔ فورتھ ائر میں ہمارا مقابلہ پھر انس کے ساتھ ہؤا اس بار میدان میں ایک تیسرا امیدوار مبشر احمد اختر بھی تھا میاں غلام محمد اختر کا صاحبزادہ۔ اس کے بارہ میں تو کسی کو گمان تک نہ تھا کہ دریں گرد سوارے باشد۔ وہ اچانک امیدوار بن گیا اور اس وقت تک ڈٹا رہا جب تک الیکشن کے تقریری مقابلہ میں ناکام ہو کر الیکشن کے لئے نااہل قرار نہیں دیا گیا۔ اس وقت اس

کے حواریوں نے جن میں ہمارے تقسیم شدہ ووٹر بھی شامل تھے ہمارے حق میں بہت زور لگایا۔ مگر وقت گذر چکا تھا۔ الیکشن ہوا اور بڑے زوروں کا ہوا ہم اپنی روایت کے مطابق ہار گئے۔ ایک یا دو ووٹوں کا فرق تھا۔ دو تین بار گنتی ہوئی کہ گننے میں کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو مگر نہیں تھی آخر انس کی کامیابی کا اعلان ہو گیا اور ہم انہیں مبارکباد دینے گئے۔ ہم نے انس سے کہا اب یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ ہم آپ کے مخالف ہیں ہم آپ کے سب سے بڑے حمایتی ہیں اور یونین کا سب سے زیادہ کام کریں گے چنانچہ ہم نے اس شکست کا بدلہ یوں لیا کہ اس سال یونین کی سرگرمیوں میں سب سے آگے آگے رہے اور بے شمار مقابلے یونین کے لئے جیتے۔ اس الیکشن سے ایک سال پہلے مقابلہ عطاء الکریم اور افتخار احمد شہاب کے مابین ہوا تھا۔ افتخار شہاب چنیوٹ کا بڑا ذہین لڑکا تھا المنار کے انگریزی حصہ کا غالباً ایڈیٹر بھی تھا۔ مقابلہ بڑا معرکہ کا تھا کیونکہ چنیوٹ اور ربوہ کے امیدواروں میں ٹھن گئی تھی۔ (احمدی یا غیر احمدی کا سوال نہ اٹھانہ اٹھائے جانے کا سوال تھا)۔ پرنسپل صاحب بہ نفس نفیس خلاف معمول اس مقابلہ کے وقت ہال میں موجود تھے۔ جب معلوم ہوا کہ افتخار کامیاب نہیں ہوا تو پرنسپل صاحب نے اسی وقت ایک نیا عہدہ قائم کیا اور افتخار احمد شہاب کو یونین میں ''پرنسپل کا نمائندہ'' مقرر کیا۔ پروٹوکول کے لحاظ سے وہ نمائندوں میں سب سے سینئر قرار دئے گئے۔ اب اسی سنت کی پیروی میں پرنسپل صاحب نے ہمیں یونین میں اپنا نمائندہ مقرر کیا اور ہم ہارنے کے باوجود یونین کی عاملہ کے رکن رہے۔ ان تمام ہزیمتوں کا بدلہ ہم نے اپنے پرانے یار اور حریف سے یوں لیا کہ بی اے کے امتحان میں کالج میں اول رہے اور ان کے تمام حواری ان کے سمیت امتحان کے میدانِ کارزار میں کھیت رہے۔

کالج میں ہمارا طالب علمی کا دور اس لحاظ سے بڑا شاندار رہا کہ ہم تمام علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑی تندہی سے حصہ لیتے رہے۔ کھیلنے کو باسکٹ بال بھی کھیلا۔ فٹ بال پر بھی مشقِ ستم کرتے رہے۔ بزم اردو کے عہدیدار رہے۔ یونین کے مباحثوں میں بھی شریک ہوتے رہے اور اپنے پراکٹروں سے بھی چھیڑ چھاڑ جاری رکھی المنار کی ایڈیٹری بھی چار سال تک نبھائی مگر بہ قول شخصے اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ نیک نامی تو کمائی یا نہیں بدنامی نہیں کمائی، حتیٰ کہ فیل تک نہیں ہوئے بلکہ وظیفے پاتے رہے پہلے کالج سے پھر یونیورسٹی سے۔ لیکچروں میں باقاعدگی سے نہ جانے کے باوجود کبھی ہمارے لیکچر کم نہیں ہوئے۔ کیوں

نہیں ہوئے ؟ ہمیں پتہ نہیں ۔ ہم نے کبھی اپنی حاضری نہیں لگوائی ہماری موجودگی کا اساتذہ کو ویسے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ فتنہ کلاس میں موجود ہے اس لئے وہ تعرض نہیں کرتے تھے ۔ اللہ بخشے مولانا غلام احمد بدوملہی والے بڑے دبنگ استاد تھے ان کی نگاہ بڑی دوربین تھی کان اس سے بھی زیادہ حساس ۔ ایک بار دینیات کی لازمی حاضری والی کلاس میں ہم نے ایک ساتھی کی جگہ یس سر کہہ دیا ۔ بغیر نظر اوپر اٹھائے ٹوک دیا کہ رول نمبر ۲۳ تم رول نمبر ۵۵ کی جگہ کیوں بول رہے ہو؟ انہیں طالب علموں کا نام کیا ان کا شجرہ ء نسب تک یاد رہتا تھا ۔ شجرہ ءنسب سے یاد آیا حضرت مولانا ارجمند خان' دینیات کے استاد تھے کلاس میں ہم نے کوئی شوخی دکھائی تو فرمانے لگے میاں میں تمہارے باپ کا بھی استاد ہوں اب اگر تم نے ایسی حرکت کی تو اس کے بھی کان کھینچوں گا تمہارے بھی ۔ ہم نے مزید شوخی کی کہ ہمارے ابا کے کان کھینچنے کے لئے آپ کو بہت اونچی کرسی پر کھڑا ہونا پڑے گا ۔ بڑے مزے سے ہنسے اور فرمایا'' اوئے بدتمیز ا کیا میں کرسی پر کھڑا نہیں ہو سکتا؟'' ۔ اتنا کہہ کر کرسی کی طرف دیکھا اور اس کی ناتوانی اور اپنے تن و توش کا خیال کر کے خود ہی بڑے زور سے ہنسے اور فرمایا لاحول ولا قوۃ ۔ کیا سادہ دل استاد تھے ۔ مہربان ۔ شفیق اور دلنواز ۔

اردو کے استاد پروفیسر محبوب عالم خالد تھے ۔ اب ماشاء اللہ اپنے مرشد کے تتبع میں انجمن کے صدر ہیں اس زمانہ میں صدر کے سکرٹری ہوئے تو اپنی کلاسیں ہمیں دے گئے کہ لو میاں خود ہی پڑھو اور خود ہی پڑھاؤ ۔ اس مشقِ ستم نے ہمیں پڑھانے کا تجربہ مفت میں مہیا کر دیا ۔ کلاسیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں وہ اردو کے لازمی مضمون بن جانے کے بعد کی کلاسیں نہیں تھیں کہ کلاس نہ لی جلسہ ءعام سے خطاب کر لیا ۔ ہال نہیں تھا تو کیمسٹری تھیٹر تھا اٹا اٹ بھرا ہوا ۔ آواز کی رسائی کے لئے لاؤڈ سپیکر جسے انجمن ترقی ءاردو والے آلہ ءمکبر الصوت اور ہمارے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ آلہ ءکریہہ الصوت کہا کرتے تھے ۔ وہ بچارا فزکس کا لیبارٹری اسسٹنٹ محمد علی سردیوں میں ٹھٹھرتا کانپتا احمد نگر سے صبح صبح لاؤڈ سپیکر لگانے آیا کرتا تھا اور شاید دس روپے زاید الاؤنس پاتا تھا ۔ ہال میں تو عالم ہی اور ہو گیا تھا لاؤڈ سپیکر کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ۔ ہمیں ویسے بھی پکار کر بولنے کی عادت پڑ گئی ۔ مگر سب سے بڑا کام تو ہال میں اتنے جمِ غفیر کو قابو میں رکھنے کا تھا اس کے لئے ہم نے ایک خاموش طریقہ ءسرزنش ایجاد کیا تھا جہاں سے شور کا شبہ ہوتا ادھر انگلی اٹھاتے اور شور کرنے والے کو اشارہ کرتے اور ہال سے باہر نکال دیتے ۔ ایک سولی بھی ہال میں موجود تھی یعنی سٹیج

پر یونین کے صدر کی اونچی کرسی پڑی رہتی تھی جس کو زیادہ زچ کرنا یا شرمندہ کرنا مقصود ہوتا اسے بلا کر اس کرسی پر بٹھا دیتے اور وہ سارا وقت لوگوں کے تیر نگاہ کا مرکز بنا رہتا۔ لڑکوں کی اس سے جان جاتی تھی۔ یہاں کینیڈا میں ایک پرانے ''ٹوٹی'' شاگرد نے پوچھ ہی لیا کہ یہ بتائیں آپ تین سو ساڑھے تین سو لڑکوں میں سے مجرم کو کیسے پہچان لیتے تھے کیونکہ آپ کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ صحیح مجرم (یعنی میں) ہی پکڑا جاتا تھا۔ ہم نے کہا میاں اب تم سے کیا پردہ؟ ہم تو اندازہ سے اس جانب انگلی اٹھا کر ذرا رعب سے کہتے تھے آپ۔ اور وہ ''آپ'' آپ ہی آپ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی کھڑا نہ ہوتا تو دوبارہ ذرا زیادہ زور سے کہتے اور وہ چپکے سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ کون۔ وہی جو اصل مجرم ہوتا کیونکہ مجرم کے دل میں چور ہوتا ہے۔ اور انگلی کا اشارہ جو سٹیج سے کیا جا رہا ہو سیدھا مجرم کے سینے پر لگتا تھا۔ وہ حضرت کہنے لگے ہم خوامخواہ آج تک پریشان ہوتے رہے کہ ان کے پاس کون سا جادو ٹونا ہے کہ سیدھے سبھاؤ ہمیں کو پہچانتے ہیں۔ آج حقیقت کا پتہ چلا ہے تو اپنی بیوقوفی پر حیران ہو رہے ہیں کہ کئی لذیذ لیکچر محض اس اشارہ عمومی کی بدولت ضائع کر دئے۔

کالج میں جو مہمان تشریف لاتے رہے ان میں دو ہمیں یاد ہیں ایک تو کوئی روسی سائنس دان تھے جو پاکستان سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے کراچی آئے ہوئے تھے نصیر خان صاحب انہیں اپنے ساتھ لو لائے۔ کیمسٹری تھیٹر میں ہی ان کا لیکچر ہوا ان کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا مگر آپ نے روسی زبان ہی میں خطاب فرمایا۔ ترجمان ترجمہ کرتا تو سائنس دان صاحب کے چہرے سے صاف لگتا کہ اپنے ترجمان سے بہتر انگریزی سمجھتے ہیں مگر اپنی حکومت کی جانب سے انہیں روسی کے سوا کوئی اور زبان بولنے کی اجازت نہیں۔ دوسرے ایک امریکن تھے یہ حضرت مسٹر فلنٹ کے نام سے موسوم تھے اور لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے رکن تھے۔ ان کا موضوع تھا جمہوریت۔ جیسے آج کل امریکہ کے پیٹ میں جمہوریت کا مروڑ اٹھا ہوا ہے اس وقت بھی تھا مگر اس کی شدت اتنی نہیں تھی۔ اس لیکچر کے میزبان پولیٹیکل سائنس سوسائٹی والے تھے۔

مسٹر فلنٹ نے اپنی تقریر ہی ابراہام لنکن کے اس مقولہ سے شروع کی کہ:

"Democrary is a form of Government, of the people, for the

"people , by the people". جب سوال و جواب کا موقعہ آیا تو صاحب صدر نے صرف اتنا فرمایا

any questions?

اور ہم کھڑے ہو گئے ہم نے سوال کیا کہ جناب والا کیا صدر لنکن نے اس مقولہ کے ہجے بھی بیان فرمائے تھے ؟ فلنٹ صاحب چکرائے کہنے لگے میں آپ کا سوال سمجھا نہیں ۔ ہم نے وضاحت کی جناب ہمارا خیال ہے ان کی مراد یہ ہوگی کہ :

democrary is a farm of governmnet, off the people buy the people far the people. ہم نے وضاحت کے لئے ایک ایک ہجہ علیحدہ علیحدہ کر کے بتایا ۔ آف علیحدہ ' ڈبل ایف کے ساتھ ۔ فار علیحدہ او کی بجائے الف کے ساتھ اور بائی علیحدہ یو کیساتھ ۔ سارا تھیئیٹر ہنسی سے گونجنے لگا ۔ فلنٹ صاحب اسم با مسمیٰ ثابت ہونے یعنی چنگاریاں چھوڑنے لگے اور صاحب صدر ہمیں سرزنش فرمانے کی کوشش میں انگریزی کے تمام لفظ بھول گئے اردو میں فرمانے لگے بیٹھ جائیں ۔ اور ہم بیٹھ گئے ۔

کانووکیشن بھی ہمارے کالج کے یادگار ہوتے تھے ۔ کالج والے افسروں کو بلانے کی بجائے علما و فضلا کو بلاتے تھے ۔ مولانا صلاح الدین احمد' جسٹس کیانی' ڈاکٹر سید صفدر حسین' پروفیسر حمید احمد خان' ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی' کون سا ایسا ماہر تعلیم تھا جو نہ آیا ہو ۔ مولانا صلاح الدین احمد تو بزم اردو کی تقریبات میں تشریف لاتے ہی تھے' بزم اردو کی تقریبات میں ان تمام بزرگوں کے علاوہ ماسوا جسٹس کیانی کے' سب ہی تشریف لاتے رہے' پھر سرکاری عہدیداروں کا آنا جانا بھی زیادہ تر بزم اردو کے زیر اہتمام ہوتا تھا ۔ ہمارے ڈویژن کا ہر کمشنر بزم اردو کے زیر اہتمام ربوہ آیا یا بعد کو باسکٹ بال کے ناتے سے ۔ ایک کمشنر تھے شیخ محمد حسین ان کا نام تھا قاضی صاحب یعنی پرنسپل قاضی محمد اسلم صاحب کے گورنمنٹ کالج کے زمانہ کے شاگرد تھے جب کالج کیمپس میں داخل ہوئے تو موٹر سے اتر گئے کہنے لگے میں اپنے استاد کے سامنے گاڑی میں بیٹھ کر نہیں جا سکتا ۔ شیخ صاحب انگریزی کے آدمی تھے اردو پڑھ تو لیتے تھے مگر زیادہ سمجھ بوجھ انہیں ادب کی نہیں تھی ۔ اپنے استاد کی زیارت کے شوق میں ہماری دعوت قبول کر لی تھی ۔ ہم نے اپنا خطبہ استقبالیہ پہلے سے بھیج دیا تھا کہ جواب لکھوا کر لا سکیں ۔ ہم اس زمانہ میں پروفیسر نہیں تھے محض لیکچرار

تھے اس لئے اپنے عہدہ کے اظہار کے لئے اپنے نام کے ساتھ ''استادِ ادبیاتِ اردو'' لکھتے تھے۔ شیخ صاحب اپنا خطبہ ءصدارت پڑھنے کھڑے ہوئے تو فرمایا کہ ''ابھی ابھی استادِ ادبیاتِ اردو نے جو کچھ کہا ہے۔۔۔'' سامعین کے کان کھڑے ہوئے مگر لوگ سمجھے ''کتابت'' (خطابت؟) کی غلطی ہو گئی ہو گی جب کمشنر صاحب نے دو تین بار ادبیات اردو کی بجائے ادیبات اردو فرمایا تو لوگ محظوظ ہونے لگے قبلہ قاضی صاحب نے بڑے پیار سے انہیں سمجھا دیا کہ یہ لفظ ادیبات نہیں ادبیات ہے شیخ صاحب خود بھی مسکرائے کہنے لگے اردو کی یہی تو مصیبت ہے کہ ایک لفظ کے ادھر ادھر ہو جانے سے He کا she بن جاتا ہے۔

کمشنروں میں سے سید قاسم رضوی نہایت ادب نواز اور ادیب نواز کمشنر تھے ایسی شستہ و رفتہ اردو لکھتے اور بولتے تھے کہ کیا کوئی اردو کا پروفیسر بھی لکھے یا بولے گا۔ سرگودھا میں یومِ غالب کے موقع پر اپنا خطبہء صدارت غالب کے اسلوب میں خط کی صورت میں لکھا اور پڑھا اور اہلِ ذوق مدتوں اس کو یاد کرتے رہے ڈاکٹر انور سدید، محمد خالد اختر اور مشفق خواجہ کے غالب کے جدید خطوط اس کے بعد کے ہیں۔ یہی قاسم رضوی بزم اردو میں بھی آئے اور دسویں قومی باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں ڈویژن کا کمشنر ہونے کے ناطے سے میزبان کی حیثیت سے بھی آئے۔ میں ان دنوں باسکٹ بال کلب کا صدر تھا کیونکہ چوہدری محمد علی صاحب پرنسپل کی کرسی پر سرفراز ہو گئے تھے۔ کمشنر صاحب انتظامات کا معائنہ کرتے پھرتے تھے۔ ہم نے جلسہ سالانہ کی طرز پر ہوسٹل کے باہر کچھ عارضی بیوت الخلاء بھی بنوا رکھی تھیں وہاں پہنچے تو کہنے لگے یہ کیا بنا رکھا ہے؟ میں نے کہا ''بیوت الخلاء ہیں 'دستِ' مبارک سے افتتاح فرمائیں''۔ کمشنر صاحب کی ساری کمشنرانہ تمکنت دھری رہ گئی قہقہہ مار کر ہنسے اور ہنستے چلے گئے۔ مدتوں بعد جب وہ ملتان میں کمشنر تھے میں انہیں کسی کام سے ملنے گیا اس وقت بھی وہ افتتاح والا لطیفہ انہیں یاد تھا۔ افسوس کہ بھٹو صاحب کی کینہ توزی کا شکار ہو کر ملازمت سے برطرف کئے گئے اور جلد ہی فوت بھی ہو گئے اور پاکستان ایک نہایت زیرک، نختی اور ذہین افسر سے محروم ہو گیا۔ وفات سے ذرا عرصہ قبل لاہور میں سول سروس اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے کہ ایک روز اچانک ان کی برطرفی کے احکامات جاری ہوئے۔ دو روز بعد ان کی والدہ کی وفات ہو گئی میں اتفاق سے لاہور میں تھا میں تعزیت کے لئے پہنچا دیکھا کہ ڈائریکٹر کے وسیع و عریض بنگلہ میں تن تنہا

غمگین بیٹھے ہیں۔ میں گیا تو میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کہنے لگے صبح سے اکیلا بیٹھا ہوں تم پہلے شخص ہو جس نے اس گھر میں جھانک کے دیا ہے۔ خدا جانے امی کے جنازہ میں بھی کوئی آئے گا یا نہیں آئے گا۔ میں نے بہت تسلی دی اور سارا دن ان کے ساتھ رہا اور دلداری کرتا رہا شام کو جنازہ اٹھا تو گنتی کے چند لوگ اور سول سروس اکیڈمی کے عہدیدار جنازہ کے ساتھ تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی سناؤنی سنی۔ میں اس وقت کہیں باہر تھا خدا معلوم ان کے جنازہ کے ساتھ کون تھا اور کون نہیں تھا۔ دنیا دار لوگ لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتے افسری کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مشاعرے بھی ہمارے کالج کے یادگار ہوتے تھے۔ کچھ اس وجہ سے کہ معیار بہت بلند ہوتا تھا کچھ اس وجہ سے کہ پرنسپل صاحب کے علاوہ ان کی بیگم صاحبہ شعروں کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں (آخر کس ماں کی بیٹی تھیں؟)۔ ایک مشاعرہ کالج میں ہوتا ایک پرنسپل صاحب کے گھر میں ہوتا۔ ثاقب زیروی پرنسپل صاحب کے ذوق کو خوب پہچانتے تھے۔ کالج والے انہیں کہہ دیتے کالج کی گاڑی شعرا کو لینے چلی جاتی اور شعراء سر کے بل آتے۔ اردو کانفرنس کے مشاعرہ میں صوفی تبسم بھی آئے۔ اس وقت پرنسپل صاحب حضرت صاحب بن چکے تھے جب صوفی صاحب کی تشریف آوری کا علم ہوا تو مجھے خاص طور سے یاد فرمایا اور تاکید کی کہ صوفی صاحب میرے استاد ہیں ان کا بہت خیال رکھنا۔ صوفی صاحب نے اردو غزل کے علاوہ پنجابی کلام بھی سنایا۔ 'سہاڈے حسن دے چمکدے لیکھاں اوتے ڈاھڈے غم دیاں سیاہیاں ڈھل گئیاں
جیہڑیاں حسن ترے چمکائیاں سن اوہ چانݨیاں راتاں رُل گئیاں'۔

دوسری اردو کانفرنس جو ۱۹۶۷ میں ہوئی بڑی عظیم الشان کانفرنس تھی، سارے پاکستان میں دور و نزدیک اس کا چرچا تھا۔ کانفرنس کے وقت ہال کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ فیصل آباد اور سرگودھا سے تو بے شمار لوگ آتے کانفرنس سنتے اور واپس چلے جاتے۔ کھانے کا البتہ لنگر جیسا انتظام تھا مگر مینیو لنگر کا نہیں تھا۔ بڑے پر تکلف کھانے پیش کئے جاتے تھے۔ دوسرے روز شام کی دعوت تو حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الثالث کی جانب سے تھی اور انجمن کے مغربی لان میں جہاں اب گیسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے' تھی۔ اس دعوت میں حضرت صاحب مہمانوں سے ذرا پہلے تشریف لائے تھے اور خود مہمانوں کا استقبال کیا تھا۔ مہمانوں میں ان کے پرانے رفقاء کار ماہرین تعلیم اور دوست شامل تھے مجھے یاد ہے ڈاکٹر سید نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ

کالج لاہور تو لپک کر حضرت صاحب کے گلے لگ گئے اور بڑی دیر تک ان سے جدا نہ ہوئے۔صوفی تبسم صاحب نے بھی معانقہ کیا۔عابد علی عابد البتہ لئے دئے رہے۔یہ دعوت بڑی بے تکلفی کے ماحول میں ہوئی مگر کھانا حضرت صاحب کی توقعات کے مطابق تیار نہ کیا گیا تھا اس لئے حضرت صاحب نے گھر سے بھی بہت سی ڈشیں منگوائیں۔دیر تک مہمانوں سے گفتگو فرماتے رہے۔چلتے وقت ڈاکٹر سید نذیر احمد نے پھر اسی جوش و جذبہ سے معانقہ کیا۔ڈاکٹر صاحب خوب آدمی تھے دیکھنے میں بالکل سادہ مگر علم میں پختہ اور طلباء میں نہایت مقبول۔

کالج کے مشاعروں میں رونق بھی اپنے رنگ کی رونق تھی کیونکہ ہمارے مشاعروں میں وہ روایتی ہڑ بونگ نہیں مچتی تھی۔لوگ داد ضرور دیتے تھے مگر بے داد سے مجتنب رہتے تھے اس لئے شعرا یہاں آنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور سارا سال منتظر رہتے تھے کہ کب کالج کے مشاعرہ کی دعوت آئے۔ایک بار علامہ لطیف انور تشریف لائے۔ان کی رباعی نے مشاعرہ لوٹ لیا:

دل سے تو بے شک اتارے گا مجھے
دور تک لیکن پکارے گا، مجھے
مجھ کو ہے اپنے گناہ کا اعتراف
پہلا پتھر کون مارے گا مجھے؟

اتفاق یوں ہوا کہ اگلے سال کے مشاعرے سے پہلے وہ دنیا چھوڑ گئے۔گلزار ہاشمی آئے اور دو غزلیں اپنے بے پناہ ترنم میں سنائیں۔ایک کی ردیف یاد ہے۔"وقت ناساز ہے"۔کچھ غزلیں درد انگیز تھیں کچھ ان کا ترنم درد انگیز تھا سارا ہال اداس ہو گیا۔لوگ مشاعرہ کے بعد بھی ان کی غزلیں انہی کے ترنم میں گنگناتے رہے۔اگلے سال کے مشاعرہ سے پہلے وہ بھی راہی عدم ہو گئے۔شعرا میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ جو شاعر زیادہ پسند کیا جاتا ہے وہ مر جاتا ہے۔کلیم عثمانی کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی میں نے کہا کلیم بھائی آپ نے مشاعرہ لوٹ لیا۔آپ نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا" ہش ایسی منحوس بات منہ سے نہ نکالو۔ابھی میں مرنا نہیں چاہتا"۔

کالج میں علمی مذاکرے اور کانفرنسیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں مگر ہمارا کالج کھیلوں میں بھی کسی سے بیٹا نہیں تھا' لاہور میں تھا تو روئنگ یعنی کشتی رانی کا چیمپئن تھا ربوہ آیا تو یہ اعزاز ساتھ لایا۔ دریا کا کنارا وہاں بھی تھا' یہاں بھی تھا۔ پرنسپل صاحب کو آکسفورڈ کے زمانہ سے اس کھیل سے دلچسپی تھی۔ لاہور میں کالج کا مقابلہ عام طور سے اسلامیہ کالج سے ہوتا تھا۔ ربوہ آئے تو بھی مقابلہ اسلامیہ کالج ہی سے رہا۔ بڑا جان توڑ مقابلہ ہوتا تھا اور پرنسپل صاحب کو اور کشتی رانی کے پروفیسر انچارج چوہدری محمد علی صاحب کو اس کھیل کھلاڑیوں سے اتنی دلچسپی اور محبت تھی کہ کھلاڑیوں کی نگرانی بھی بہت ہوتی تھی کہ پریکٹس سے غافل نہ ہوں اور خاطر تواضع بھی بہت ہوتی تھی سیروں کے حساب سے دودھ پلایا جاتا تھا' سویابین کا حلوہ اور پتہ نہیں کیا کیا انہیں کھلایا بلکہ بہ قول شخصے ''ٹھسایا'' جاتا تھا اور یہ تھا بھی ضروری کیونکہ کشتی کھینا بچوں کا کھیل نہیں اور وہ بھی پانی کے بہاؤ کے خلاف۔ مسلسل پریکٹس۔ اچھی صحت اور مضبوط تن و توش' اس کے لئے ضروری تھا۔ صبح و شام ان کھلاڑیوں کو ورزش بھی خوب خوب کروائی جاتی تھی دیکھنے میں دیدار و جوان لگتے تھے'' سینے گوشت سے لپے ہوئے' ڈنٹر قبضے بنے ہوئے' رانوں کے مچھلے الٹے ہوئے' پنڈلیاں کچالوسی بنی ہوئی' اپنے پرائے دیکھ کر خوش ہوتے تھے''۔ یہ جو میں نے حوالہ درج کر دیا یہ شاہد احمد دہلوی صاحب نے دلی کے پہلوانوں کے بارہ میں لکھا ہے مجھے یوں محسوس ہوا ہمارے روئنگ والوں کا ذکر ہے اس لئے میں نے ان کی کتاب ''اجڑے دیار'' میں سے اچک کر یہاں درج کر دیا۔ اس ساری ٹیم میں ایک نہ ایک نازک اندام کھلاڑی بھی ہوتا تھا جسے کشتی کی پھننگ پر بیٹھ کر کشتی کا رخ سیدھا رکھنا ہوتا تھا اسے سٹئیر کہتے تھے۔ اس نازک اندام کی نازک اندامی کی حفاظت بھی بڑا جی لگا کر کی جاتی تھی کہ کہیں اس کا تن و توش نہ بڑھ جائے کیونکہ اس کا کام اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ہلکا پھلکا مگر بازوؤں میں جان والا ہوتا کہ کشتی کو بد راہ ہونے سے بچائے رکھے۔ زور آوروں کا سارا زور کشتی کھینے پر مرتکز رہتا تھا اور یہ نازک سا کھلاڑی کشتی کا رخ سیدھا رکھنے پر مستعد رہتا تھا کہ ذرا رخ میں کجی آئی سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اسی کھیل کا ایک کھلاڑی تھا جسے پرنسپل صاحب نے پریکٹس کے وقت کبڈی کا میچ دیکھتے ہوئے دیکھ لیا اور سب کے سامنے اسے بیدوں پر دھر لیا۔ ذرا جو اس نے چوں چرا کی ہو۔ فوراً بھیگی بلی بن کر دریا کی طرف بھاگا۔ لوگ دیکھتے ہی رہ گئے کہ اس پرنسپل کا کتنا رعب داب ہے کہ کالج کے تن آور کھلاڑیوں کو سر عام بید

لگا سکتا ہے۔ دراصل یہ سب ہمارے کالج کا فیض تھا دوسرے کالجوں میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ کھلاڑی بعد کو پرنسپل صاحب کا چہیتا کھلاڑی بن گیا اور پرنسپل صاحب اس کی دلداری بھی دوسروں سے بڑھ کر کرتے تھے۔ نازک اندام سٹیئر لڑکوں میں سے ایک ہمارا چہیتا شاگرد تھا نعیم شاہ۔ جرمنی میں تھا۔ ہم سویڈن میں تھے تو ہمارے لئے کتابیں فراہم کرنے کا بیڑا اس نے اٹھا رکھا تھا بس ہم کسی کتاب کے بارہ میں کہہ دیتے وہ خبر نہیں کیا کیا جتن کر کے وہ کتاب مہیا کر لیتا۔ فاصلہ' قیمت' نایابی کوئی شے اس کا رستہ نہ روک سکتی۔ پھر بچارے پر برا وقت آن پڑا مگر اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ ایسا بجوگ پڑا کہ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا مگر اس کی جبیں پر شکن نہ آئی۔ اب رفتہ رفتہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو رہا ہے۔ پاکستان سے باقاعدگی کے ساتھ فون کر کے ہماری خیریت دریافت کرتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں ہماری علالت کی خبر سنی تو فون پر ڈھاریں مار مار کر رو دیا۔ ایسے شاگرد کسے نصیب ہوتے ہیں؟ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔ کشتی رانی کی چیمپئن شپ ہمارے کالج کے ہاتھوں میں رہی۔ اب پتہ نہیں کیا حال ہوگا؟ زوال تو ہمارے یار اسلم صابر کے زمانہ ہی میں شروع ہو گیا تھا جب عربی پڑھانے والے لوگ اس خیال سے کہ ماضی میں عرب جہاز ران سمندروں پر حکمرانی کرتے تھے' تو ہم کیوں نہ بمپنگ بوٹنگ کے انچارج بن جائیں؟ کشتی رانی کروانے لگیں تو یہ تو ہونا ہی تھا اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ ہاکی رشید غنی کھلاتے تھے۔ اللہ غنی حساب پڑھائیں گا ماتھیٹا سکھائیں یا ہاکی کی چالبازیاں سکھائیں؟۔ فٹ بال البتہ ماسٹر فضل داد صاحب نے ایک عرصہ تک خوب خوب کھلایا مگر بوڑھے آدمی تھے جب ان کی ٹانگیں کمان بن گئیں تو اس علت سے جان چھڑا کر باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کو پریڈ کروانے لگے۔ باسکٹ بال نے کالج کے نام کو چار چاند لگا دئے۔ پنجاب کی ٹیم کے نوے فیصد کھلاڑی ہمارے کالج کے ہوتے تھے' آرمی پولیس حبیب بینک یہ سب ٹیمیں ہمارے کھلاڑیوں کے بل بوتے پر چلتی تھیں۔ ربوہ پاکستان میں باسکٹ بال کا سب سے اہم مرکز بن گیا تھا۔ نصیر خان صاحب چوہدری محمد علی صاحب کے علاوہ کچھ ہم جیسے ''آوٹ سٹینڈنگ'' یعنی باہر کھڑے ہونے والے' کھلاڑیوں کو باسکٹ بال کھیلنا اور کھلانا پڑا تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیْنَ النَّاس۔

کالج قومیا لیا گیا تو بس یوں سمجھ لیجئے صرف ہمارے کالج کا ہی نہیں پاکستان میں تعلیم اور نظام تعلیم کا

جنازہ اٹھ گیا۔ ہماری قومی زندگی کا سقوطِ تعلیم کا یہ سانحہ سقوطِ مشرقی پاکستان سے بڑا المیہ ہے۔
کالج قومیایا گیا تو اس وقت حضرت صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جو واقفِ زندگی جہاں کام کر رہا ہے وہیں کام کرتا رہے۔ جس جس کی ضرورت ہوگی اسے جماعت طلب کر لے گی مگر ایک سانحہ ایسا اچانک ہوا کہ واقفین زندگی میں بہت سے لوگوں کو انجمن کو طلب کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ ۲۹ مئی کے واقعہ ربوہ کے بعد حکومت پنجاب کی رگِ انتظامیہ پھڑکی اور اس نے کالج کے سارے سٹاف کو اِدھر اُدھر تبدیل کر دیا اور اس باب میں مہاراجہ پٹیالہ جیسی حرکتیں بھی کیں۔ مثلاً ایسی جگہوں پر ایسے سینئر سٹاف کو تبدیل کر دیا جہاں اس مضمون کی کلاسیں ہی نہیں تھیں۔ مثلاً پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب جیسے سینئر ترین پروفیسر کو چک نمبر ۴۱ ج ب کے انٹرمیڈیٹ کالج میں بھیج دیا جہاں عربی پڑھنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ اسی طرح کسی کو کہیں کسی کو کہیں بغیر سوچے سمجھے تبدیل کر دیا۔ ہم خدا معلوم کس وجہ سے بچ گئے یعنی سارے سٹاف کا تبادلہ ہو گیا اور ہم ٹی آئی کالج سے منسلک رہے۔ چنیوٹ کالج میں ہمارے ایک جونئر سے دوست تھے جن کا بیٹا ہمارے کالج میں پڑھتا تھا اور ہمارا شاگرد تھا۔ وہ ٹی آئی کالج کے پرنسپل بنا کر بھیج دیے گئے۔ اب سٹاف کیا کرتا؟ یا تو چارج چھوڑ دیتا اور نئی جگہوں پر جا کر اپنا چارج لے لیتا یا کالج سے چھٹی لے لیتا چنانچہ سوائے ہمارے سب کالج سے چھٹی لے کر غائب ہو گئے اور ہماری ذمہ داری یہ ٹھہری کہ ہم نئے پرنسپل صاحب کو جو پرنسپلی کا چارج لینے کے لئے بیتاب ہیں باتوں میں لگا کر بہلائے رکھیں اور چارج نہ لینے دیں۔ چنانچہ ہم نے یہی کیا صبح صبح کالج پہنچ جاتے۔ پرنسپل صاحب چنیوٹ سے تشریف لے آتے ہم انہیں سٹاف روم میں بٹھا کر اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہتے۔ کچھ کاغذوں پر ان کے دستخط بھی ہوتے رہتے مگر چارج ہم نے انہیں نہ لینے دیا۔ وہ باب الحیل جو ہم نے طالب علمی کے دوران کلاسوں سے غائب ہونے کے لئے پڑھا تھا اب بہت کام آیا تا آں کہ حکومت کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور سارے تبادلے منسوخ ہوئے تب ہماری جان میں جان آئی۔ اس کی سزا ہم نے جاپان سے واپس آنے کے بعد پائی۔
(ہمارے کالج کے سپرنٹنڈنٹ محمود اسلم صاحب ہماری مساعی کے گواہ ہوں گے کہ ہم نے ایک حاضر پرنسپل کو کس طرح غیر حاضر بنائے رکھا تھا)۔
کالج قومیایا گیا تو سٹاف کی سینیارٹی لسٹ یہ تھی؛ اتفاق سے وہ لسٹ ہمارے پرانے کاغذوں میں دستیاب

ہے اس لئے درج کرتے ہیں کہ کالج نے کتنا اچھا زمانہ دیکھا تھا۔ میاں عطاء الرحمٰن صاحب اور پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔

پروفیسر چوہدری محمد علی پرنسپل

پروفیسر بشارت الرحمٰن پروفیسر عربی

ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد ایم ایس سی پی ایچ ڈی لندن۔ پروفیسر کیمسٹری

ڈاکٹر نصیر احمد خان، ایم ایس سی علیگ پی ایچ ڈی ڈرہم۔ پروفیسر فزکس

ڈاکٹر ناصر احمد خان پرواز ی۔ بی اے آنرز ایم اے پی ایچ ڈی (پنجاب)۔ پروفیسر اردو

مسعود احمد عاطف۔ لیکچرار فزکس

مبارک احمد انصاری۔ لیکچرار کیمسٹری

مرزا مجید احمد۔ لیکچرار تاریخ

چوہدری عطاء اللہ۔ لیکچرار فارسی

چوہدری حمید اللہ۔ لیکچرار حساب

مرزا خورشید احمد، لیکچرار انگریزی

سعید اللہ خان۔ لیکچرار شماریات

عبدالرشید غنی لیکچرار حساب

چوہدری سلطان اکبر لیکچرار عربی

منور شمیم خالد لیکچرار سوکس

سید حبیب الرحمٰن، لیکچرار بیالوجی

محمد اسلم صابر لیکچرار عربی

محمد شریف خان لیکچرار بیالوجی

عبدالجلیل صادق لیکچرار انگریزی

محمد عثمان صدیقی لیکچرار اسلامیات

محمد اسلم شاد (منگلا) لیکچرار عربی

مرزا انس احمد لیکچرار فلسفہ (اعلیٰ تعلیم کے لئے چھٹی پر)

چوہدری صادق علی لیکچرار بیالوجی

سعود احمد خان لیکچرار تاریخ

محمد ظفر اللہ لیکچرار حساب

مبشر احمد خان لیکچرار فزکس

آصف علی پرویز لیکچرار فزکس

محمد علی تائونی۔ لیکچرار فزکس

منور احمد لیکچرار فزکس

مرزا محمد لقمان لیکچرار فزکس

محمد احمد انور لیکچرار اسلامیات ڈی پی ای

رفیق احمد ثاقب۔ لیکچرار کیمسٹری۔ (چھٹی پر)

اختر حسین انصاری لیکچرار کیمسٹری

خادم حسین لیکچرار فزکس

سلطان احمد چوہدری لیکچرار اکنامکس

اظہر وحید لیکچرار کیمسٹری

مبارک احمد طاہر لیکچرار فلسفہ

مبارک احمد عابد لیکچرار اردو

پروفیسر ملک مبارک احمد جز وقتی لیکچرار عربی

اب پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ان لوگوں میں سے کوئی ایک آدھ ہی کالج کے سٹاف پر ہوگا' نصیر احمد خان پروفیسر بشارت الرحمٰن' مسعود احمد عاطف' چوہدری عطاء اللہ اور جز وقتی استاد پروفیسر ملک مبارک احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرزا مجید احمد صاحب کالج چھوڑ گئے۔ چوہدری حمید اللہ' مرزا خورشید احمد' محمد اسلم شاد منگلا

صاحبان کو جماعت نے خدمت کے لئے طلب کرلیا۔فزکس کے نوجوان اساتذہ اکثر پی ایچ ڈی کر کے باہر کے ملکوں میں بس گئے کہ واپس جا کر کیا کرتے؟۔باقی لوگ ایک ایک کر کے ریٹائر ہوتے گئے۔اب تو سنا ہے سٹاف کے سب سے آخری سٹاف ممبر عزیزی مبارک احمد عابد بھی ریٹائر ہو گئے ہیں۔کالج کے در دیوار رہ گئے ہیں وہ بھی سنا ہے کھنڈر ہو چکے ہیں۔روح جاتی رہے تو یہی ہوتا ہے۔اڑ گیا روح کا طائر تو یہ صورت نکلی۔استخواں رہ گیا انساں کی طرح رکھا ہوا۔

ہمارے دکاندار!

کچھ سال پہلے لندن کے "جنگ" اخبار میں ایک مذاکرہ شائع ہوا جس میں بعض علمائے کرام نے بر سرِ منبر یہ الزام لگایا تھا کہ ربوہ اور قادیان میں ہر دکان پر لکھا ہوتا تھا کہ یہاں کسی غیر احمدی کو سودا فروخت نہیں کیا جاتا۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں قادیان میں پیدا ہوا، پلا اور بڑھا پھر ربوہ میں تعلیم پائی اور یہیں کے کالج میں پندرہ برس سے زیادہ پڑھانے کا موقع ملا مجھے تو ربوہ میں کبھی کوئی ایسا بورڈ نظر نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ربوہ اور قادیان کے دکانداروں کے ذکر میں کچھ لکھنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ وہ طبقہ ہے جو عام طور پر مضمون لکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ ان کی شکایتیں تو لوگ کرتے ہیں ان کی خوبیوں کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔

ابھی کچھ دن ہوئے گول بازار کے دکاندار خلیل احمد صاحب کے انتقال کی خبر تھی۔ ان کے صاحبزادوں میں سے نصیر اور حمید سے ہمارا تعلق رہا۔ ان سے دودھ دہی اور بعض اوقات لسی خریدنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ نہایت ایماندار آدمی تھے۔ دودھ والوں کے بارہ میں عام تاثر یہ ہے کہ کوئی ہی ایسا رہا ہوگا جو دودھ میں پانی کی ملاوٹ نہ کرے۔ بلکہ ہم نے لوگوں کو دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرتے دیکھا ہے۔ خلیل صاحب کے ہاں نہایت خالص دودھ ملتا تھا۔ ان کے ہاں کی دہی کی لسی اسی لئے دوسروں سے ممتاز ہوتی تھی۔ کہ اس میں جو دہی استعمال ہوتا تھا وہ خالص دودھ سے تیار کیا جاتا تھا۔ ان کا ذکر آیا تو اپنے کچے بازار کے دکاندار اور دوست فیض کرمانی صاحب کا ذکر بھی نوکِ قلم پر آ گیا۔ فیاض خان صاحب کم گو دکاندار تھے۔ دراصل ربوہ کے ابتدائی دنوں میں اردگرد کے دیہات سے جو خواتین دودھ لے کر ربوہ میں بیچنے آتی تھیں انہیں ملاوٹ کے طور طریقوں کا پتہ نہیں تھا۔ اس لئے نسبتاً آسانی سے خالص دودھ مل جاتا تھا۔ پھر وقت نے انہیں خرانٹ بنا دیا پھر تو وہ وقت بھی آیا کہ ربوہ میں ہمارے یورپ کی اصلاح کے مطابق ہلکا اور فالتو توانائی سے مبرا دودھ ملنے لگا۔ مگر ہمارے دکانداروں نے اپنی روایتوں کو نہیں چھوڑا۔ حتی الوسع خالص

دودھ خریدتے اور بیچتے تھے۔

قادیان کے دکانداروں میں سے ہمیں بازار کے بہت سے دکاندار یاد آرہے ہیں۔ مگر ہم اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے بارہ میں کوئی رائے قائم کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ مگر افضل برادرز کی دکان یاد ہے۔ بھائی احمد علی، محمد علی کی سائیکلوں کی دکان یاد ہے۔ پنساریوں میں سے ایک ہندو پنساری تھے ان کی دکان سے ہمہ وقت قسما قسم کی دواؤں کی خوشبو آتی رہتی تھی۔ پیارے دی ہٹی غالباً کسی ہندو زرگر کی دکان تھی۔ یہ سب لوگ بازار میں نہایت آرام سے دکانداری کرتے تھے۔ وہ جو آجکل کے دکانداروں کے ہاں کاروباری رقابت اور دشمنی ہوتی ہے وہ عنقاء تھی۔ چچا رفیق حیات بلاتکلف ہمسائے کے ہندو پنساری سے دوا منگوا لیتے تھے۔ قادیان کے ماحول کا سب پر ایک جیسا اثر تھا۔ محلّہ کے دکانداروں میں ہم نے کئی جگہ اپنے شاگرد ہدایت اللہ ہادی کے والد سید ولایت حسین شاہ صاحب کا ذکر کیا ہے کہ ان کے گلاب جامنوں کا ذائقہ اب تک زبان پر متحضر ہے۔ شوگر کا مریض ہونے کے بعد تو اب صرف ذائقہ یاد کر لینے پر گزارہ ہے۔ (رہا ہمارا کولیسٹرول؟ وہ تو چکنی چپڑی باتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔)

قادیان کے زمانہ میں ابھی یہ کولا وولا کی بدعت شروع نہیں ہوئی تھی۔ سوڈے کی بوتلیں ہر بازار میں بنتی اور بکتی تھیں۔ قادیان میں دیانت سوڈا واٹر فیکٹری کے نام سے ہمارے ہمسائے چچا عبدالرحیم اور چچا عبداللہ کی فیکٹری تھی۔ دیانت سوڈا واٹر فیکٹری میں رنگا رنگ کی بوتلیں بھری جاتی تھیں۔ سبز رنگ کی بوتلیں کیلے کی بوتلیں کہلاتی تھیں۔ سبز رنگ کی بوتل میں شاید انار کا ایسنس ڈالتے تھے۔ پیلے رنگ کی بوتل میں سنگترے کا ایک ذائقہ ومٹو کہلاتا تھا۔ خدا جانے کس چیز کا ذائقہ تھا۔ کھاری بوتل بھی دستیاب تھی۔ یعنی صرف خالص پانی اور گیس۔ ایسی بوتل بدہضمی کے علاج میں استعمال ہوتی تھی۔ یوسفی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سوڈے کی بوتلیں بدہضمی یا ہندو مسلم فساد میں استعمال ہوتی تھیں۔ ان کے ہاں ایسا ہوتا ہوگا۔ قادیان میں ہندو مسلم فساد کبھی نہیں ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ان بوتلوں کا چلن رہا مگر آہستہ آہستہ نئی روشنی کی بوتلیں ”کولا کولا“ کر کے آگئیں۔ لاہور میں ہم نے ایک پاکولا کی بوتل بھی دیکھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ شرفاء شکر کے شربت کو بھی شکر کولا کہنے لگے۔ سب اسی زلف کے اسیر ہوئے۔ رفتہ رفتہ دیسی بوتلوں کا چلن ختم ہو گیا۔ اور کولا کی بوتلیں چھا گئیں۔ ان بوتلوں کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ ہمارے

ہاں خالص چینی استعمال ہوتی تھی۔ پھر سیکرین آئی پھر اور قسم قسم کے مٹھاس کے ذریعے نکل پڑے جن کی وجہ سے بوتلوں والے کولا کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ویسے بھی ملٹی ملین ڈالر انڈسٹری کا مقابلہ کوئی ایک گھریلو سوڈا واٹر فیکٹری کیسے کر سکتی ہے؟ ہمارے چچا عبدالرحیم اور چچا عبداللہ کی بوتلیں خالص چینی سے تیار کی جاتی تھیں۔ اگر ان میں چینی کی جگہ کوئی اور چیز ہوتی تو ہم نے جتنی مقدار میں ان کا سوڈا واٹر ڈکارا ہے کب کے جاں بحق تسلیم کر چکے ہوتے۔

قادیان کے دکانداروں میں سے چھابڑی والے بابے ''ماٹے'' کے چنے یاد ہیں۔ صاف ستھرے ابلے ہوئے چنے، مرچ مصالحے بھی صاف ستھرے اور خالص اور ان پر کھٹائی کا چھینٹا، ہم لوگ سکول کی آدھی چھٹی کے وقت کھاتے تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان چنوں سے پیٹ میں درد ہوا ہو یا بدہضمی کی شکایت ہوئی ہو۔ ورنہ چینوٹ میں آکر صرف ایک بار کسی چنے والے سے چنے کھائے تھے اس نے ناکوں چنے چبوا دیئے۔

چچا عبداللہ نے فیکٹری ایریا ربوہ میں اپنی سوڈا واٹر کی بساط پھر بچھائی مگر وقت بدل گیا تھا۔ اس لئے انہیں یہ بساط لپیٹنا پڑی۔ ہم نے ایک دو بار چچا سے کہا کہ کوئی اور کاروبار آپ کیوں نہیں کر لیتے؟ کہتے ''بیٹا کسی اور چیز کا تجربہ نہیں اور اب ہماری عمر نئے تجربے کرنے کی نہیں'' ہمیں کسی پرانے شاعر کی رباعی یاد آئی۔

چرخ اب ہمیں جو دے ہے نہیں لیتے ہم
کونین بھی گو دے ہے نہیں لیتے ہم!
ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے نہیں دیتا وہ
جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے نہیں لیتے ہم

یہ پرانے بزرگوں کی وضع داریاں تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کا چلن بھی ختم ہوا۔

قادیان کے افضل برادرز والے قریشی محمد اکمل صاحب اور قریشی محمد افضل صاحب ربوہ میں آ کر بیٹھے۔ یونہی سا خیال آ رہا ہے کہ قادیان میں ان کی دکان کا نام غالباً افضل جنرل سٹور تھا؟ ایک جنرل سٹور ذہن میں ہے جسے ہم اپنی دانست میں جرنل سٹور پڑھا کرتے تھے۔ پاکستان میں آکر تو ''جنرل'' کا لفظ اتنا عام اور بدنام ہو گیا کہ اس لفظ کے معانی ہی بدل گئے۔ حالانکہ ربوہ میں کئی جنرل سٹور کھلے اور اب تک کھلے

ہیں۔

دودھ دہی والوں کے بعد ہوٹلوں کی باری آتی ہے ہم کسی مضمون میں کچے بازار کے ہوٹلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ مگر یہ فیاض کرمانی صاحب دراصل دودھ دہی نہیں بیچتے تھے۔ ان کی چائے سیلونی کے مقابلہ میں کم چلتی تھی مگر جو لوگ سیلونی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ وہ ان کی خاموش گفتگو سننے کے لئے ان کے ہاں آتے تھے، پھر گول بازار میں خواجہ ریستوران کھلا۔ خواجہ صاحب، خواجہ عبداللہ سیٹھ صدیق صاحب کے داماد تھے اور صاف ستھری چیزیں بیچتے تھے۔ پھر ہمارے خان میر صاحب افغان کے بیٹے بھائی حبیب نے جمال بیکری کے اوپر ایک فردوس ریستوران کھولا۔ یہ خواجہ حنیف صاحب والا ریستوران ''النعمت'' بہت بعد کی بات ہے۔ ربوہ کے سارے ریستورانوں کی خصوصیت یہ رہی کہ یہاں دوسرے شہروں کی طرح ٹپ کا کوئی رواج نہیں تھا کیونکہ خدمت کرنے والے ٹپ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہمارے ایک دوست یورپ سے گئے ہوئے تھے۔ ایک ریستوران میں ہم لوگوں نے چائے پی۔ اٹھنے لگے تو بیرے کی ٹپ کے لئے دو روپے میز پر چھوڑ دیئے۔ وہ بیرا ہمارے پیچھے بھاگتا بھاگتا آیا کہ صاحب آپ میز پر دو روپے بھول گئے ہیں۔ انہوں نے کہا بھولے نہیں تمہارا انعام ہے۔ کہنے لگا کس چیز کا انعام؟ میں تنخواہ دار کارکن ہوں۔ اور مجھے اسی چیز کی تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے برعکس ہم لاہور میں پڑھنے کے لئے گئے تو ہمارا اٹھنا بیٹھنا پاک ٹی ہاؤس میں تھا کیونکہ یہی ایک ادیبوں شاعروں کا ٹھکانا تھا۔ چائے پیتے تو ٹپ بہرحال دینا پڑتی۔ ایک بار ہم نے ایک بیرے سے کہا کہ یار آج ہمارے پاس ٹپ کے پیسے نہیں ہیں کہنے لگا کوئی بات نہیں اگلی بار دے دیجئے گا۔ ادھار سہی۔ پاک ٹی ہاؤس میں مالک سے ہی نہیں بیروں سے بھی ٹپ کا ادھار چلتا تھا۔ ٹی ہاؤس کا ذکر آ گیا تو بتاتے چلیں کہ لاہور کے اچھے شعراء سے ہمارا تعارف یہیں ہوا۔ اور یہ جو ہم ربوہ میں اتنے بڑے بڑے شاعروں کو بلا معاوضہ مشاعروں میں بلاتے اور پڑھواتے رہے یہ اسی دوستی کا فیضان تھا۔ اسی ٹی ہاؤس میں آخری کلام جو ہم نے سنا وہ اقبال ساجد کا تھا۔ اب تو وہ ظالم گزر گیا مگر کیا غزل اس نے سنائی تھی کہ ہم ہی نہیں ہمارے قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

''پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں۔ اب کے برس بھی اس کے سوا کچھ بھی نہیں کیا

غربت بھی اپنے پاس ہے اور بھوک ننگ بھی۔ کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا''

یہ مضمون ہم آزاد تلازمہ ءخیال کی تکنیک میں لکھ رہے ہیں۔ اور ایسے مضامین میں یہی ہوتا ہے۔ کہ ذہن اچانک کسی دوسری بات کی طرف مڑ جاتا ہے اور اہلِ ادب کہتے ہیں کہ ایسی باتوں کا کوئی نہ کوئی باطنی رابطہ ضرور ہوتا ہے اس لئے ذہن کو جھٹکنا نہیں چاہیئے۔ جو بات آجائے اسے لکھ دینا چاہیئے۔ چنانچہ ہم بھی اسی طرح کر رہے ہیں تا کہ مضمون کی دلچسپی برقرار رہے۔

ریستورانوں سے چلے تو ربوہ کے کریانے والوں تک بات پہنچی۔ کچے بازار میں شیخ برادران تھے۔ دو بھائی تھے ایک کا نام شاید قدرت اللہ تھا دوسرے کا عصمت اللہ۔ بڑے بھائی کے بیٹے سمیع ہمارے ساتھ سکول میں تھے۔ اب خدا معلوم وہ لوگ کہاں ہیں مگر ان کی دکان واحد دکان تھی۔ جہاں سے کریانہ کا سامان دستیاب تھا۔ اس زمانہ میں تو ملاوٹ کا لفظ صرف کتابوں میں ملتا تھا پھر کتابوں سے نکل کر لوگوں کی زبان پر آ گیا اور ہر شے میں ملاوٹ ہونے لگی۔ مگر ربوہ میں چیزیں خالص ملتی تھیں۔ بزرگوارم سردار مصباح الدین صاحب اور کئی دوسرے بزرگ جو چینوٹ میں رہتے تھے ربوہ سے کریانہ کا سامان خریدتے تھے۔ کہ بلا سے ذرا سا مہنگا ہے تو ہو خالص تو ہے۔ سبزی والے خواجہ محمد شریف صاحب کچے بازار میں اکیلے ہی تھے مگر سبزی صاف ستھری اور تازہ بیچتے تھے۔ گاہکوں سے مروت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ ان کی دوکان عین مسجد کے سامنے تھی نماز کا وقت ہوتا تو سب سے پہلے مسجد میں پہنچتے۔ اگر ایسے وقت میں کسی کو کچھ خریدنا ہوتا تو اسے انتظار کرنا پڑتا۔ ان کے بیٹوں میں سے سلیم ہمارا کلاس فیلو اور دوست تھا باقی تو بڑے تھے۔ اب ان کے بیٹوں میں سے جمیل، بسوں کے اڈہ پر چائے کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ خواجہ حنیف ہیرو کہلاتے تھے۔ اور کبڈی کے کھلاڑی تھے۔ وہ اور ان سے چھوٹے خواجہ مجید اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خواجہ شریف صاحب نے جوان بیٹے خواجہ حنیف کی وفات کا صدمہ دیکھا۔ مگر ہم نے انہیں صابر شاکر اور راضی برضا پایا۔ پھر گول بازار اور غلہ منڈی کی بنیاد پڑی۔ کریانہ والوں میں لاہور ہاؤس بہت مشہور ہوا۔ مگر پھر وہ کریانہ کی بجائے لوہا بیچنے لگے۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا! خواجہ عبدالحئی ہمارے خواجہ عبدالمومن صاحب اور خواجہ باسط اور جلیل کے والد بھی کریانہ کا کام کرتے رہے۔ خواجہ عبدالمومن صاحب تو کپڑے کے کاروبار میں رہ کر نارووے آبیٹھے۔ خواجہ عبدالباسط ڈنمارک

والوں کا ننگ ڈھانپنے کی تگ ودو میں ہیں۔

خیاطوں میں بھائی عبدالسلام بھی ربوہ میں جانے پہچانے تھے۔حضرت صاحب کی شیروانیاں آپ ہی سیتے رہے۔ایک بار لندن کے جلسہ سالانہ پر ملاقات ہوگئی۔ بہت خوش تھے کہ حضرت صاحب کی خیاطی کے ناطے جلسہ سالانہ پر آنے کا موقع مل گیا۔اسی جلسہ پر بھائی عبدالرزاق کریانہ والے بھی ملے۔ان کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ لندن کا سفر اختیار کر سکتے مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا جذبہ دیا تھا کہ جلسہ پر آگئے۔ ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے زندگی کا کیا پتہ سوچا حضرت صاحب کے دیدار سے آنکھوں کو روشن کرلوں۔ اتنا کہہ کر آواز رندھ گئی۔ کچے بازار میں کریانہ کی معمولی سی دکان تھی مگر خلوص واخلاص کی دولت سے مالا مال تھے۔

مٹھائی والوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیونکہ ہم میٹھے سے اتنے ڈرے ہوئے ہیں کہ میٹھی میٹھی باتوں سے پرہیز روا رکھتے ہیں۔ بھائی عبدالکریم صاحب کی برفی اللہ اللہ اس کا ذائقہ، دور دور تک جاتی تھی۔مگر ان کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ یعنی برفی چھوڑ کر لوہے پر آگئے۔ ان کے بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے۔ عبدالکریم صاحب نہایت دعاگو مسکین طبیعت آدمی ہیں۔ہم نے کبھی انہیں مطلب سے زیادہ بات کرتے نہیں دیکھا۔ان کی برفی کا چراغ گل ہوا تو البشریٰ کے چوک میں محمود صاحب کی برفی مشہور ہوئی۔مٹھائی کی اور دکانیں بھی ربوہ میں رہیں۔منڈی میں بھائی اللہ بخش صاحب بہت مشہور تھے۔انکے بیٹے ہمارے شاگرد تھے۔ پان اور تمباکو کی دکانیں ربوہ میں تھی ہی کتنی؟ گنی چنی تھیں۔ جب تک ہم سگریٹ نوشی کی علت میں مبتلا تھے ایک دودکانداروں کی دکان ہی ہمارے دمِ قدم سے چلتی تھی۔منڈی میں بھائی غلام احمد کے بچوں کی دکان اور گول بازار میں خواجہ صاحب کی دکان۔ پان منڈی کے بھائی غلام احمد کا ہی زیادہ چلا ،کہ اس محلہ میں پان خوروں کی اکثریت تھی۔حکماء بھی ربوہ کی پہچان رہے۔حکیم خورشید احمد صاحب تو بہت بعد میں حکمت کے میدان میں آئے مگر آگے نکل گئے کیونکہ کاروباری سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ہمارے دوست اسلم فاروقی کی حکمت تو صرف حکمت چھانٹنے تک محدود رہی اب سنا ہے خوب چل رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد احمد سرسادی کا بیٹا احمد سنا ہے حکمت میں بڑا رواں ہے۔ ربوہ میں سب سے پہلے دواخانہ خدمت خلق کھلا۔قبلہ سید بشیر احمد شاہ صاحب اور بھائی عبدالعزیز دو ہی دواخانہ خدمت خلق کے کارکن تھے۔ دونوں

کی اولاد ہماری شاگرد رہی۔ ناصر دواخانہ والے حکیم محمد رفیع ناصر صاحب گول بازار میں آکر بیٹھے۔

ربوہ کے ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ملٹری کراس والے خاصے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا بھی بہت تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنا نسخہ خود تیار کرتے تھے۔ وہ پیٹنٹ دوائیوں پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ یہی حال ڈاکٹر محمد احمد سرساوی صاحب کا تھا۔ اب تو ربوہ میں ڈاکٹروں کا وہ عالم ہے کہ دور دور سے لوگ علاج کروانے ربوہ آتے ہیں۔ کسی زمانہ میں صرف ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحب اور میاں منور احمد صاحب ہوتے تھے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر لطیف احمد قریشی پہلے سپیشلسٹ تھے جو ایم آر سی پی کر کے ہسپتال میں آئے اور بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے (اب وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایف آر سی پی ہیں)۔ پھر ڈاکٹر مرزا مبشر احمد ایف آر سی ایس کر کے آئے پہلی ایم بی بی ایس لیڈی ڈاکٹر ہماری ڈاکٹر فہمیدہ عظمت آئیں ان کے بعد ڈاکٹر نصرت جہاں ایف آر سی ایس کر کے آگئیں۔ غرض اب تو ہسپتال سپیشلسٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیباریٹریاں بھی کھل گئی ہیں۔ پھر آبادی بڑھی تو ضروریات بڑھیں اور اب تو گلیاں بازاروں میں تبدیل ہوگئی ہیں اور ہر کارنر پلاٹ دوکان یا مارکیٹ میں تبدیل ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر راجہ جو کہ ہمارے دوست بھی ہیں نے سب سے پہلے اپنے شفاخانہ کا شعبہ حیوانات کھولا۔ اکسیر اپھارہ ان کی دوا بہت مشہور ہوئی اور ان کا یہ مصرعہ اس سے بھی زیادہ کہ " راجہ سے کہو بھیج دے اکسیر اپھارہ "۔ پھر تو ان کے ہاں کیوریٹو کی وہ ریل پیل ہوئی کہ اب مریضوں کو محض دوا سونگھا کر ہی شفایاب کر لیتے ہیں۔ لندن میں ان سے ملاقات ہوئی تو ہم نے انہیں کہا کہ آپ کا اشتہار پڑھ کر ہماری تو دل کی تکلیف رفو چکر ہوگئی ہے۔ آپ کون سی سیاہی استعمال کرتے ہیں؟ حسبِ عادت ہنس دیئے۔ جواب نہیں دیا سوچتے ہوں گے اس کا منہ بند کرنے کے لئے کوئی کیور ایجاد کروں تو یہ چپ ہو۔ بہر حال ہمارے عزیز دوست ہیں اور ہم دوستوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں تو کس سے کریں؟ اب تو مرحوم ہوئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اپنی وضع کے آدمی تھے۔

جنرل سٹور بھی ربوہ میں بہت کھلے۔ افضل برادرز تو قادیان سے چلے ربوہ میں آکر رکے۔ مگر قریشی افضل صاحب اللہ تعالیٰ انہیں صحت سلامتی سے رکھے تو کہیں باہر تھے ان کے بھائی قریشی اکمل صاحب نے کام شروع کیا۔ انکے بیٹے قریشی انور کی تصویر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ اس شخص نے تو دھوپ میں سفید کر لئے

اللہ اس کی مساعی میں برکت ڈالے سنا ہے نہایت کامیاب مربی ہیں۔ اللہ کا احسان ہے۔ پھر ایک داؤد جنرل سٹور والے داؤد اور بشارت دو بھائی تھے۔ پنڈی چلے گئے تھے اب سنا ہے کینیڈا میں جا بسے ہیں مگر ہم سے تو ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ (بات پرانی ہوئی اب تو داؤد صاحب سے اکثر ملاقات رہتی ہے سلسلہ کے کاموں میں مستعد ہیں)۔ ان کی دکان کی جگہ اب نوید جنرل سٹور ہے۔ نوید صاحب کے بیٹے پچھلے برس جرمنی میں ملے اور ہماری خوب خدمت کی اللہ انہیں خوش رکھے۔ اعزاز جنرل سٹور تو اعزاز کے باسکٹ بال کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا۔ اب اعزاز بھی جرمنی ہے ہمیں دعوت پر اس نے بلایا جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا چار منزلیں سیڑھیوں کی چڑھنی پڑیں گی ہم معذرت کر کے واپس آگئے، کہ سیڑھیاں چڑھنا منع ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چڑھتے چڑھتے ویسے ہی چوتھے آسمان پر پہنچ جائیں۔ منڈی میں ہمارے شاگرد آفتاب نے فینسی جنرل سٹور کھولا۔ آفتاب بڑا نفیس اور خاموش طبع لڑکا ہے۔ اس کی دوکان بھی خوب چلی پھر خدا معلوم کیا ہوا وہ دوکان بیچ کھوچ کر کہاں گیا؟۔ دارالخیر جنرل سٹور والے امین صاحب تو منڈی سے اٹھ کر عین ہمارے پڑوس میں اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئے۔ ہاں ہمارے پیر مبارک اللہ بخشے ان کا مون لائٹ جنرل سٹور بچوں میں بہت مقبول تھا۔

ہم نے دو آرن سٹوروں کا ذکر تو کیا مگر مجید آرن سٹور کو بھول گئے۔ حالانکہ مجید صاحب کے بچے ہمارے بچوں کے ہم عمر ہی نہیں لنگوٹیے بھی ہیں۔ بلکہ ان کے پوتے تو ہمیں دادا جان کہا کرتے تھے۔ بجلی کی دکان والوں نے اپنی روایت قائم رکھی۔ یعنی جس طرح بجلی بے اعتباری ہے یہ لوگ بھی بے اعتبار ہی رہے۔ ہمارے شاگرد مجید جب احمد الیکٹرک سٹور کے نام سے اپنی دوکان کھول کر بیٹھے تو ہم نے کہا بیٹے اس پیشہ میں مثال قائم کرو مگر اسے موت نے فرصت نہ دی۔ جوانی ہی میں گزر گیا۔ نصیر بندہ بھی باسکٹ بال کھیلتے کھیلتے اب البرق میں بیٹھا ہے بجلی کے ذکر میں ہم نے بے اعتباری کا ذکر کیا ہے تو اپنے ضمیر جعفری صاحب یاد آگئے۔ انکا شعر واپڈا پر ہر حرف آخر ہے" یا الہ العالمین کوئی خوشی خالص بھی دے برق پیدا کی ہے تو پھر واپڈا پیدا نہ کر"۔

ربوہ کے دوکانداروں کی جس خصوصیت کا ذکر ہم نے کیا وہ پھر دہرا رہے ہیں کہ ان لوگوں میں دوسرے شہروں کے دکانداروں میں نمایاں فرق یہ تھا۔ کہ ان کے بارہ میں گاہک کو یقین رہتا تھا کہ وہ اسے دھوکا

نہیں دے رہے۔ کالج کے غیر از جماعت طلباء سے بڑھ کر ان دکانداروں کے بارہ میں کون گواہی دے سکتا ہے۔ ہمیں سینکڑوں ایسے غیر از جماعت شاگرد ملتے رہے جو ربوہ کے دکانداروں کی تعریف ہی کرتے رہے۔ ایسے لوگ بہت شاذ ملے جنہیں ان لوگوں سے شکایت رہی ہو۔ ہمارے شاگردوں میں سے اکثر طلباء جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ کالج میں ہم لوگ احمدی اور غیر احمدی طلباء میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ ہم دو بار کینیڈا گئے دونوں بار غیر احمدی طلباء کی ایک معتد بہ تعداد ہمیں دور دور سے ملنے کو آئی۔ احمدی طلباء تو جماعت کے جلسہ پر آئے ہوئے تھے۔ غیر احمدی طلباء نے محض ہماری ملاقات کے لئے سفر کی زحمت اٹھائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے۔ اب کے چوہدری محمد علی صاحب بھی تشریف لے گئے تو امریکہ سے غیر احمدی طلباء انہیں ملنے کے لئے آئے۔ تعلیم الاسلام کالج محض کالج نہیں تھا ایک مکمل انسٹی ٹیوشن تھا۔ ان میں سے ایک بچے نے کہا کیا ربوہ میں اب بھی نماز کے وقت دکانیں بند ہو جاتی ہیں؟ ہم نے کہا ہوتی تو ہیں مگر دھڑکا ہی لگا رہتا ہے، کہ کہیں کسی کے جذبات نہ مجروح ہوتے ہوں۔ وہ بچے اب بھی ربوہ کے ماحول کو یاد کرتے اور دکانداروں کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ بات کیا کم ہے؟ ربوہ کے دو ا یسے دکاندار تھے، جن کی اجارہ داری تھی۔ جمال بیکری والے میاں خدا بخش اور خوشی محمد اور کبابوں والے عبدالمنان! مگر ان کی اجارہ داری ان کی کوالٹی پر کبھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ ہم نے امریکہ کے دو باشندوں کو جمال بیکری کی روٹی اور منان کے کبابوں کو یاد کرتے دیکھا اور خوش ہوئے۔ یہ لوگ اپنے رنگ میں ربوہ کا نام روشن رکھے ہوئے ہیں۔ ربوہ کے خیاط رہے جاتے ہیں حالانکہ یہی لوگ ہیں کہ ہمارے کپڑے سیتے اور ہمارا ننگ ڈھانپتے رہے۔ ابتداء میں ایک چچا مہر دین ہوتے تھے ان کا بیٹا ہمارا دوست تھا۔ آج کل انجمن کے کسی دفتر میں خدمت پر مستعد ہے۔ جامعہ میں قبلہ حضرت مولانا جلیل صاحب کے ساتھ رہائش اختیار کی تو پڑوس میں عبدالرزاق صاحب جامعہ کے پی ٹی رہتے تھے۔ ان کے بھائی عبدالستار اور ابا، بابا جی نام ذہن سے اتر رہا ہے کیونکہ سب انہیں ہمیشہ ہی بابا جی کہتے تھے۔ بابا جی نہایت مشاق خیاط تھے۔ اس باب میں بڑی بے فکری رہتی تھی کہ کپڑا وقت پر اور عمدہ سلا ہوا گھر بیٹھے بٹھائے مل جاتا تھا۔ عبدالرزاق صاحب نے تو پی ٹی کروانے کے ساتھ اپنے بیٹے عزیزی عبدالرؤف کے نام سے بچوں کی لکھنے کی کاپیاں بنانے کا کام شروع کر رکھا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی برکت دے رکھی تھی۔ اب تو

رؤف بک ڈپو اچھا خاصہ ادارہ ہے۔ بھائی عبدالستار کے صاحبزادے عزیزی عبدالماجد طاہر لندن میں خدمت سلسلہ پر مستعد ہیں اور داماد عزیزی عبدالکریم خالد صاحب لاہور میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ایک بار ان کی ایک نہایت خوب صورت نظم الفضل میں چھپی تو ہم نے انہیں داد کا خط لکھا بڑی محبت کا جواب آیا۔اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔

جفت سازوں میں سے بھائی بشیر کا ذکر کسی جگہ ہو چکا ہے۔ بابے ماجھے کا ذکر تو حضرت صاحب نے کسی خطبہ میں فرمایا ہے۔اپنی وضع کے آدمی ہیں یا تھے۔ پاؤں سے معذور تھے۔ لائبریری کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھتے تھے۔سردی گرمی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ ربوہ میں سب سے پہلے محمد احمد نظام صاحب نے فوٹوگرافی شروع کی۔ نظام صاحب کے صاحبزادے اطہر نے یہ کام جاری رکھنے کی کوشش کی مگر زمانہ بدل گیا۔اب تنویر سٹوڈیو والے احمد زمان تنویر ہمارے حافظ محمد رمضان صاحب کے صاحبزادے ربوہ والوں کی تصویریں کھینچتے ہیں ورنہ وہ وقت بھی تھا۔ کہ کالج کی تقریبات کی تصویریں کھنچوانے کے لئے لاہور سے فوٹوگرافر منگوائے جاتے تھے۔ جوتوں کی دکانیں تھیں ہی کتنی؟ البتہ رشید بوٹ ہاؤس والے بھائی رشید ہمارے استاد مولانا غلام احمد صاحب بدوملہوی کے بیٹے تھے۔ان کی اولاد نے ان کا کام غالباً نہیں سنبھالا اور نوکریاں کرنے لگے۔ ربوہ کی پہلی پہلی کپڑے کی دوکان حبیب کلاتھ ہاؤس یاد آئی۔ حبیب اللہ خوب وضع دار آدمی تھے۔ان کے صاحبزادے مولوی بشیر احمد صاحب سیالکوٹی حضرت میاں بشیر احمد صاحب کے دفتر کے ہیڈ کلرک اور ہمارے ''افسر'' تھے۔اپنے ابا کی وفات پر ابا کا کاروبار سنبھال کر بیٹھ گئے۔ انہیں باباجی حبیب اللہ کی ایک صاحبزادی انگریزی کی پروفیسر ہوتی تھیں سعیدہ حبیب۔ ہمارے دوکاندار طبقہ کے لوگ بھی بچوں کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ ربوہ کالج کی متعدد برکتوں میں سے یہ ایک برکت ہے کہ اہل ربوہ کی ہر نئی نسل پڑھی لکھی نسل ہوتی ہے۔ ربوہ کو اب بھی پاکستان میں سو فیصد تعلیم کا جزیرہ کہا جا سکتا ہے۔لڑکیاں ہوں یا لڑکے سب ہی زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک مدت تک تو ربوہ میں ایم اے پاس لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ رہی۔

بھائی محمد اسحاق صاحب احمدیہ ماڈرن سٹور والے ابتدائی جنرل سٹور والے تھے۔ پھر گھڑی سازی پر آ گئے۔ ویڈیو اور ٹی وی بھی بیچتے رہے۔ان کے داماد ڈاکٹر ظفر اللہ اپنے زمانے میں حساب کے اور پان

کے رسیا تھے۔اب امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔حساب سے اتنے شغف کے باوجود ہمارے چہیتے شاگرد تھے۔ بہت غربت میں پرورش پائی مگر اللہ نے اب خوب کشائش دے رکھی ہے۔ان کے بھائی اشرف بھی اسحٰق صاحب ہی کے داماد ہیں۔ربوہ کے دکانداروں کا ذکر آیا تو حکایت دراز تر ہوگئی۔یہ لوگ بھی معاشرہ کا اہم جزو ہوتے ہیں اور توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔اللہ ان لوگوں کو اہل ربوہ کی خدمت کی جزا دے۔خدمت اور دیانت اور شرافت کے اعلیٰ اخلاقی معیار پر قائم رکھے۔آمین۔

جلسہ سالانہ اور آب خورے

ہم نے جس بستی میں آنکھ کھولی وہ عجیب بستی تھی۔ آبادی تھوڑی تھی مگر مہمانوں کا آنا جانا بہت تھا۔ جاپان کے اوساکا شہر کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دن میں ایک کروڑ اور رات میں پانچ لاکھ ہوتی ہے یعنی اس شہر کی دن کی آبادی میں کمیوٹرز یعنی عارضی طور پر سفر کر کے آنے والوں میں اور مستقل قیام کرنے والوں میں ایک اور بیس کا تناسب ہوتا ہے لوگ تیز رفتار گاڑیوں سے آتے اور اپنا اپنا کام کر کے اپنے اپنے مستقر پر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم جس بستی کا ذکر کر رہے ہیں اس میں لوگوں کا آنا جانا بھی اسی حساب سے ہوتا تھا۔ مہمانوں میں اور مقیموں میں ایک اور بیس کا تناسب تھا۔ وہاں یہ تناسب سال بھر قائم رہتا تھا سال کے آخری مہینے میں تو مہمانوں کا وہ اژدحام ہوتا کہ سکونت کی سہولتیں ہر سال کم پڑ جاتیں اور مکینوں کو وَسِّعِ مَکَانَکَ کا اہتمام کرنا پڑتا۔ وجہ یہ تھی اس بستی میں سال کے سال ایک سالانہ جلسہ ہوتا تھا جس میں لوگ دور دور سے شرکت کے لئے آتے تھے۔ دسمبر کا مہینہ پنجاب میں خاصی سردیوں کا مہینہ ہوتا ہے اس لئے مہمان آتے تو اپنا اپنا بستر ہمراہ لے کر آتے جلسہ کے منتظمین ان کے سونے لیٹنے کے لئے' پرالی کا فرش بچھا دیتے اور وہ لوگ اسی پر سکڑ سمٹ کر آرام پاتے دن کو جلسہ میں شرکت کرتے رات کو چین کی نیند سوتے۔ چھوٹے بڑے فرش زمین پر مگن ہو کر سوتے۔ کھانے کے لئے بھی برتن کہاں سے آتے منتظمین مٹی کے عارضی برتن بنوا رکھتے پیالے' جن میں سالن ڈالا جاتا اور آبخورے جن میں پانی پیا جاتا۔ مدتوں بعد یورپ میں ایک یورپی بزرگ سے ملاقات ہوئی انہوں نے ایک چیز سینت سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ کہنے لگے ایک نادر چیز دکھاؤں؟ تبرک ہے۔ دیکھا تو مٹی کا ایک آب خورہ تھا۔ کہنے لگے جب میں پہلی بار جلسہ پر ۱۹۴۴ میں گیا تھا تو نشانی اور تبرک کے لئے لے آیا تھا۔ ہم نے بھی اس آبخورہ کو اٹھایا اس میں وطن کی مٹی کی خوشبو آئی۔ اگر چہ وقت گذرنے کے ساتھ اس میں پانی پیتے ہوئے وہ ٹھنڈک اور تازگی محسوس نہ ہوئی جو وہاں جلسہ کے آب خوروں سے مخصوص تھی مگر یہی کیا کم تھا کہ وطن کی مٹی تھی اور جانے اس ارضِ مقدس کے کس ''حسن کوزہ گر'' نے اس کو بنایا تھا' بعض

چیزیں کس طرح نایاب ہو جاتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت وقت گذرنے کے بعد متعین ہوتی ہے۔ آب خورے تو عارضی ضرورت کے تحت بنائے جاتے تھے لیکن اس یورپین دوست کی عقیدت نے اس عارضی چیز کو ایک دوام دے دیا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی چھوٹی نہیں رہتیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ ہمیں یاد ہے جلسہ ختم ہو جاتا تو ہم بچے ان آبخوروں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹختے اور ان سے کھیلتے پھرتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ ان کا مصرف ختم ہو چکا اب اگلے برس نئے آب خورے بنیں گے۔

ہمیں بچپن ہی سے جلسہ سالانہ کے موقع پر مہمانوں کی خدمت کی توفیق ملتی رہی۔ چھوٹے تھے تو صرف پانی پلانے کی خدمت ملتی اس لئے جلسہ سالانہ کے ساتھ ہمارا تعلق آب خوروں کی وجہ سے قائم تھا۔ ذرا بڑے ہوئے تو کھانا پیش کرنے کی خدمت ملنے لگی۔ پیش کرنا کیا؟ ہوتا یہ تھا کہ بالٹی میں سالن اٹھا کر زمین پر بیٹھے ہوئے مہمانوں کی قطار تک پہنچتے اور باری باری ہر ایک کے مٹی کے پیالے میں سالن یا دال جو کچھ بھی ہوتا وہ حصہ رسدی ڈالتے جاتے۔ ختم ہو جاتا اور مزید کی ضرورت ہوتی تو مہمان پیار سے آواز دیتے کہ بیٹا سالن چاہئے۔ اس خدمت میں اتنا لطف آتا کہ اب تک اس خدمت کو ترستے ہیں۔ روٹیاں تنوروں میں پکتیں اور مہمانوں تک گرما گرم پہنچائی جاتیں۔ لنگر خانہ سے مہمانوں کی فرودگاہوں تک انہیں کیسے لایا جاتا تھا ہمیں اس کے بارہ میں اتنا ہی پتہ ہے کہ ٹوکروں کے ٹوکرے خدام سروں پر اٹھا کر لاتے اور فرودگاہوں کے پاس لا کر رکھ دیتے وہاں سے ہم لوگ جو خوردسال تھے روٹیاں اٹھا اٹھا کر اندر تہ در تہ لگا دیتے اور کھانے کے وقت مہمانوں میں تقسیم کرتے۔ کچھ بچے روٹی تقسیم کرتے کچھ سالن۔ جو بہت چھوٹے ہوتے انہیں پانی پلانے کی ڈیوٹی سونپی جاتی۔

جلسہ سالانہ سے بہت پہلے محلوں میں انتظامات شروع ہو جاتے کہ کون کتنے مہمان اپنے گھر میں ٹھہرا سکتا ہے؟ لوگ بالگ بڑے اخلاص کے ساتھ مہمانوں کے لئے اپنے گھروں کو پیش کرتے اور مرکزی تنظیم والوں کو مطلع کر دیتے کہ ہمارے ہاں اتنے کمرے ہیں اور ہم ان کمروں میں سے اتنے کمرے مہمانوں کی خدمت کے لئے پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے گھر کا عالم یہ تھا کہ ایک بڑا کمرہ تھا اور ایک چھوٹا سا کوٹھڑی نما کمرہ۔ ساتھ میں ایک چھپر سا تھا جسے باورچی خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا بعد میں سڑک کے رخ ایک کمرہ اور بن گیا جسے ہم لوگ بیٹھک کہا کرتے تھے۔ اس ڈھائی کمرہ والے مکان میں اللہ کے

فضل سے ہم' ہمارے امی ابا' ہمارے پھوپھا پھوپھی جی' بھائی جان محمد احمد ہمارے دادا اور دادی سب کی سمائی رہتی تھی ۔ جلسہ کے لئے سب لوگ ایک بڑے کمرہ میں سمٹ جاتے بیٹھک ان مہمانوں کے لئے وقف کر دی جاتی جو جماعت کے انتظام کے تحت ہمارے ہاں قیام کے لئے آتے تھے ۔ ہمیں یاد ہے مرزا عبد الرحیم بیگ صاحب کا خاندان ہمارا مہمان ہوتا تھا ۔ پھر بابا برکت علی صاحب برما والے بھی آتے رہے ۔ یہ مہمان ان مہمانوں کے علاوہ ہوتے تھے جو جلسہ کے موقع پر چنگا بنگیال اور راولپنڈی کے اور علاقوں سے ہمارے ہاں تشریف لاتے ۔ بھائی فیض عالم خان چنگوی بھائی ہدایت اللہ بنگوی یہ سب لوگ اپنے اپنے خاندانوں سمیت آتے اور جلسہ کے دنوں میں خوب رونق رہتی ۔ جلسہ گاہ ہمارے گھر سے بالکل قریب پڑتی تھی تعلیم الاسلام کالج کے میدان میں ۔ اینٹوں سے عارضی سٹیڈیم سا بنایا جاتا اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دو تین سیڑھیوں والے پشتے بنائے جاتے اور ان پر لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر رکھ کر بیٹھنے کی جگہ بنا دی جاتی وہ زمانہ تھا کہ لاؤڈ سپیکر نئے نئے آئے تھے اس لئے ان کا انتظام بھی ہوتا تھا مگر جلسہ گاہ اس طرح بنائی جاتی تھی کہ لاؤڈ سپیکر کے بغیر بھی آواز سب لوگوں تک پہنچ جائے ۔ اس زمانہ میں پچاس ساٹھ ہزار آدمیوں تک آواز پہنچانا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا اب وہ دن آ گئے ہیں کہ پانچوں بر اعظموں میں بیک وقت امام کی آواز نشر ہوتی اور پہنچتی ہے ۔

اوپر جن بابا جی برکت علی برمی کا ذکر ہوا یہ برما کے رہنے والے تھے اور ہمارے ابا جب برما میں مبلغ تھے تو ان کی تبلیغ سے احمدی ہوئے تھے ۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ میں ان سے بہتیرا کہتا کہ امام مہدی کے آنے کے تمام نشان ظاہر ہو چکے مگر ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی ۔ وہ ہر نشان کو ظاہر میں پورا ہوتا دیکھنا چاہتے تھے کہ ہاتھ اور کان گز گز بھر کے ہو جائیں گے جو کچھ انہوں نے اپنے علماء سے سنا ہوا تھا انہیں یہ صورت ظاہر نظر نہیں آتا تھا ۔ ابا کہتے ہیں ایک بار وہ رنگون سے کوئی دو تین سو میل کے فاصلہ پر واقع کسی شہر غالباً مانڈلے گئے ۔ ابا جی کو اللہ تعالیٰ نے تدبیر سجھائی ۔ آپ نے انہیں فون کیا اور کہا بابا جی میں رنگون سے بات کر رہا ہوں اور صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے کان اتنے لمبے ہو گئے ہیں کہ آپ تین سو میل سے میری بات سن رہے ہیں ۔ اتنا کہہ کر فون بند کر دیا ۔ بابا جی نے واپس آتے ہیں ابا جی کو بلا بھیجا اور بیعت کر لی ۔ یہ بڑا مخلص خاندان تھا پھر تو ان کے بیٹے محمود صاحب ہماری ایک منہ بولی بہن آپا عزیزہ سے بیاہے گئے ۔

(یہ آپا عزیزہ عزیزم مبارک احمد عابد کی خوش دامنہ ہیں) بابا جی برکت علی برمی کا خاندان جلسہ کے ناطے سے ہمارے ساتھ متعارف ہوا۔ اسی طرح مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب کا خاندان اسی ناطہ سے ہمارا مہمان ہوا ان کے قبلہ والد صاحب غالباً عبدالحکیم ان کا اسمِ گرامی تھا پہلی بار جلسہ کے انتظام کے تحت ہمارے ہاں قیام کے لئے تشریف لائے تھے۔ مہمانداری کا وہ سلسلہ عمر بھر کی شناسائی اور دوستی میں بدل گیا۔ ربوہ میں بھی بھائی مرزا عبدالرحیم بیگ شروع شروع میں ہمارے ہاں ہی قیام فرماتے رہے۔ یہ برکتیں جلسہ کے ساتھ مختص تھیں۔ اب دوسرے ممالک میں ان کا ایک ادنیٰ سا نمونہ تو نظر آ جاتا ہے مگر وہ رونقیں کہاں سے لوٹ کر آئیں؟ ہر ملک میں جلسہ ہونے لگتا ہے تو وہاں کے امیر دوستوں سے کہتے ہیں کہ باہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے اپنے اپنے مکانوں میں جگہ پیش کریں لوگ کرتے ہوں گے اس طرح نئی اخوتیں اور نئے تعلقات جنم لیتے ہوں گے جو پہلے سے موجود احمدیت کے رشتہ میں مزید استواری کا موجب بنتے ہوں گے۔ اب تو جماعت اللہ کے فضل سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر ملک میں ایک ایک خاندان کے کئی کئی جاننے والے اس ملک کے مرکز میں موجود ہوتے ہیں مگر دو چار برس پہلے جرمنی میں جو نظارہ دیکھنے میں آیا وہ بھی عجیب نظارہ تھا کم وبیش پچاس ہزار آدمی جلسہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ فرینکفرٹ اور من ہائم اور ہائیڈل برگ کی اپنی آبادی تو اسقدر نہیں کہ اتنے مہمانوں کو فرودگاہیں فراہم کر سکتی مگر لوگ سما گئے اور کوئی دقت ہوئی ہو تو ہوئی ہو کم از کم رہائش کی کوئی دقت نہیں ہوئی نہ کھانا فراہم کرنے میں کوئی دشواری ہوئی۔ ہم نے ایک جرمن دوست کو بتایا کہ مہمان داری کی روایت ہماری جماعت کی دیرینہ روایت ہے وہ کہنے لگے روایت اپنی جگہ زمینی حقائق اپنی جگہ آخر اتنے لوگوں کی سمائی گھروں میں کہاں سے ہو گئی ہو گی؟ وہ جرمنی گئے تو واپس آ کر بتایا کہ انہوں نے وہاں کئی ایسے لوگوں سے گفتگو کی ہے جن کے گھروں میں اجنبی احمدی مہمان ٹھہرائے گئے تھے اور ان خاندانوں نے بطیب خاطر ان کی مہمان داری کا فریضہ سرانجام دیا۔ ہماری بستی تو خیر چھوٹی تھی ٹرانسپورٹ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر ان ملکوں میں تو ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بڑا مسئلہ ہے جرمنی میں جلسہ گاہ من ہائم کی مارکیٹ میں بنتی ہے جو فرینکفرٹ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے مرکز فرینکفرٹ ہے مگر لوگ دور دراز سے وہاں وقت پر پہنچتے ہیں۔ اگرچہ ہم جیسے کوتاہ قدم لوگ بعض تقریریں نہ سننا چاہیں تو دیر سے پہنچنے کا بہانہ کر سکتے ہیں۔

کہاں کی کوتاہ قدمی ۔ ہم نے جان بوجھ کر اپنے عزیز دوست اور شاگرد عبید اللہ باجوہ کی جلسہ کی تقریر کا وقت رستہ میں گذار دیا تھا اور کہہ دیا تھا رستہ میں دیر ہوگئی ۔ (خوئے بدرا بہانہ بسیار ۔) جو لوگ جلسہ پر پہنچ جاتے ہیں ان کو پھر سارا وقت وہیں گذارنا ہوتا ہے اس لئے منتظمین کو دن بھر کی مصروفیت کا اہتمام رکھنا پڑتا ہے ۔ جلسہ سنا' کھانا کھایا نمازیں پڑھیں' دوستوں بزرگوں سے میل ملاقات کی کہ سال بھر کے بعد دوستوں کے یکجا ہونے کا موقع بھی ایک بار ہی آتا ہے ۔ لندن میں بھی یہی عالم ہے کہاں مرکز اور کہاں ٹلفورڈ ۔ اسلام آباد ۔ غالباً اتنا ہی فاصلہ ہے ۔ ہم نے پہلی بار یہ جگہ دیکھی تو بھیڑوں کا گلہ وہاں چر رہا تھا اب مسیح محمدی کی بھیڑیں وہاں تھیں وسیع وعریض خیموں میں سارا انتظام تھا ۔ بچری کی لمبی لمبی بیرکوں میں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے اسلم صابر سے ملاقات ہوئی ہم نے بہتیرا چاہا اسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لندن لے جائیں مگر وہ کہنے لگا جلسہ کی بیرکوں میں ٹھہرنے کا جو مزہ ہے وہ گھر کے آرام میں کہاں؟ اس لئے ہماری خواہش کے باوجود وہ راضی نہ ہوا ۔ جلسہ کے بعد البتہ ہم اسے لندن کے گلی کوچوں میں لئے لئے پھرے اور ہم تواضع بھی اتنی ہی کر سکتے تھے کیونکہ ہم خود سویڈن سے مہمان کے طور پر گئے ہوئے تھے ۔ امریکہ کا جلسہ دیکھا ۔ وہی عالم تھا لنگر جاری تھا لوگوں کی رہائش البتہ ہوٹلوں میں تھی ۔ ہم تو فدا صاحب کے ہاں متمکن تھے مگر باقی دوستوں سے جس سے پوچھا اس نے یہی کہا فلاں ہوٹل میں ہوں فلاں موٹل میں ہوں ۔ دراصل واشنگٹن میں مسجد کے آس پاس رہنے والے اتنے احمدی لوگ ہیں ہی نہیں جو اپنے مکان پیش کر سکیں اگر دور دور ہی ٹھہرنا ہے تو کیوں نہ قریب کے ہوٹلوں میں ڈیرہ لگایا جائے اور اس میں جماعت اپنا حصہ ادا کرتی تھی تا کہ جماعت کی میزبانی کا فرض ادا ہوتا رہے ہمیں وثوق سے تو علم نہیں غالباً ہوٹل والے بھی جلسہ کے مہمانوں کے لئے خصوصی رعایت کا علان کرتے ہیں اپنی جماعت کا خط دکھایئے وہ آپ کو رعایتی نرخ پر رہائش مہیا کریں گے دور کی ریاستوں سے آنے والے یہی کرتے ہیں اور اسی میں آسائش بھی ہے ۔ کینیڈا میں بھی ہم نے یہی دیکھا لوگ گھروں میں ٹھہرتے ہیں مگر جو لوگ زیادہ دور نہ ٹھہرنا چاہیں وہ ہوٹلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں ۔ اب کے جلسہ انٹرنیشنل سینٹر میں تھا جو احمدی لوگوں کی رہائش گاہوں سے دور ایک جگہ ہے اس کے قریب قریب ٹھہرنے کی جگہ ملنی مشکل تھی ۔ ہمارے دوست مرزا انس احمد بھی کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پر اپنی بیٹی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے البتہ ڈاکٹر

عنایت اللہ منگلا قریب کے ایک ہوٹل میں تھے مبادا دیر ہو جائے اور جلسہ کی تقریر کا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ انتظامات خوب تھے بلکہ لوگ باگ اس جلسہ گاہ پر اتنے خوش ہوئے کہ بیک آواز امیر صاحب سے کہا کہ اگلے برس بھی یہی جگہ ریز رو کروالیں۔ گرمی سے آسائش رہتی ہے اور دیگر ضروریات بھی بطریق احسن مہیا ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر ہم سوچتے ہیں یہ لوگ کھانا کھلانے کے لئے جو کاغذ کے گلاس اور پلیٹیں مہیا کرتے ہیں ان میں اور ہمارے آبخوروں اور پیالوں میں کتنا فرق ہے۔ کاغذ میں مٹی کی خوشبو تو نہیں پیدا ہو سکتی؟ ہمیں ہمارے آب خورے ہی یاد آتے رہے اور جس جلسہ پر جائیں وہاں انہیں کو یاد کرتے ہیں۔ مٹی کی کشش ہے یا جلسہ کی برکت ہے یا کیا ہے؟ آپ جو چاہیں علاجِ دردِ دل کرتے رہیں۔ ہم پرانوں کو وہی نسخہ پرانا چاہیے۔

مالک رام کی احمدیت

اردو زبان کے جن نامور محققین نے اردو ادب کی تاریخ پر گہرے نقوش مرتب کئے ان میں کا ایک نام جناب مالک رام کا ہے۔ غالب کے بارہ میں ان کی تحقیق کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔ غالب کے احوال وآثار پر ان کی تحقیق کا حوالہ دیئے بغیر کوئی محقق ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد ان کے مذہب کے بارہ میں بہت رد وقدح ہو رہی ہے۔ ان کے ورثا نے ان کے عقیدہ کے برعکس انہیں مسلمانوں کی طرح تجہیز وتکفین کا مورد کرنے کی بجائے ہندوانہ رسوم کے مطابق نذرِ آتش کر دیا۔ خیر اس سے مرنے والے کو کیا فرق پڑا کہ اسے تو خاک ہونا ہی تھا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے عقیدہ کے بارہ میں آج بھی وہی بے یقینی کی کیفیت جاری ہے اور کوئی شخص جراءت کے ساتھ بات کرنے کی جراءت نہیں کرتا۔

اس قضیہ کی ابتدا تو اس وقت ہوئی جب جناب مالک رام نے امام جماعت احمدیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنا کوئی اسلامی نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضرت صاحب نے فرمایا اس نام یعنی مالک رام کے نام میں کوئی مشرکانہ عنصر موجود نہیں اس لئے اس نام کو برقرار رکھیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ سلسلہ کے ریکارڈ میں (مثلاً تحریک جدید کے دفتر اول میں) ان کا نام اسی طرح درج ہے۔ مالک رام صاحب اسی نام سے جانے جاتے رہے۔ بعد کے زمانہ میں انہوں نے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اخفا کو قائم رکھا اور غالباً حضرت صاحب کی اجازت سے قائم رکھا۔ کیونکہ راقم الحروف کے علم کے مطابق ایسی مثال قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک پیروکار کی موجود ہے کہ جس نے اپنے ایمان کو اخفاء میں رکھا اور فرعون کو مشورہ دیا کہ وہ خدا کی پرستش کرنے والے لوگوں کو ایذائیں نہ دے۔ ہو سکتا ہے مالک رام صاحب نے یہی سوچ کر اس اخفاء پر استقلال اختیار کیا ہو۔ میرے اپنے علم اور تجربہ کے مطابق انہوں نے اپنے احمدی دوستوں سے کبھی اپنی احمدیت کو چھپایا نہیں لیکن دوسروں میں غیر ضروری طور پر اس کا اعلان بھی نہیں کیا۔

حال ہی میں اردو کے نامور محقق ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب ''شخصیات و مشاہدات'' فضلی سنز لمیٹڈ کراچی کی طرف سے پہلی بار شائع ہوئی ہے اس میں ایک طویل مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''مالک رام کا مذہب''۔ دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں: ''مالک رام کا مذہب ایسا موضوع ہے جس پر جسارت کر کے میں نے لکھنے کی پہل کی۔ متعدد حضرات نے اس پہلو پر لکھا۔ میں نے ڈائجسٹ کے طور پر سب کی تحریروں کے ضروری اقتباس جمع کر دئے ہیں۔ خوفِ فسادِ خلق سے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ ہوشمند قاری ان اقتباسات کو پڑھ کر اپنی رائے قائم کر سکتا ہے'' (صفحہ ۸)۔ ڈاکٹر گیان چند جیسے محقق کی بات بہت وزن رکھتی ہے انہوں نے قاری پر نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہ داری ڈالتے ہوئے بین السطور بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ میں ان کی تصریحات کا مختصر سا جائزہ جماعت احمدیہ کے لٹریچر میں ریکارڈ کی غرض سے معرضِ تحریر میں لا رہا ہوں۔

جناب ڈاکٹر گیان چند نے ''ہماری زبان'' دہلی مؤرخہ ۲۲ مئی ۱۹۹۴ میں ''مالک رام کے مذہب کی بحث کا جواز'' کے عنوان سے لکھا ''ہماری زبان کے بعض مراسلوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ میرے لئے مالک رام کے مذہب کی بحث اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ میرے بزرگ پروفیسر سرور نے مجھے ایک نجی خط میں لکھا ہے'' مالک رام کے مذہب کا مسئلہ آپ نے نہ جانے کیوں چھیڑا؟'' چونکہ میں سرور صاحب کا نہایت احترام کرتا ہوں اس لئے ضروری ہے کہ اپنا موقف واضح کر دوں۔ مالک رام کی وفات کے چھ سات مہینے بعد تک میں نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا لیکن جب ضلع مظفر نگر کے ایک رسالے میں ایک مبینہ خط شائع کیا گیا کہ وہ وفات سے پانچ دن پہلے باقاعدہ مسلمان ہو گئے تھے تو میں نے حقیقت جاننے کی کوشش کی۔ مضمون لکھنے سے پہلے میں نے خلیق انجم صاحب کو لکھ کر پوچھا کہ اگر وہ اس موضوع پر میرا مضمون 'ہماری زبان' میں چھاپنے کو تیار ہوں تو میں لکھ دوں۔ ان کا اثبات میں جواب آنے پر ہی میں نے مضمون سپردِ قلم کیا۔ حسنِ اتفاق سے انہیں دنوں خلیق انجم صاحب لکھنؤ آئے۔ رام لعل کے گھر ان سے ملاقات ہوئی ان کے ساتھ محمد افضل ایم پی بھی تھے۔ میں نے مضمون کے اہم حصے خلیق انجم کو پڑھ کر سنائے انہوں نے کسی بیان پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے مضمون ان کے حوالے کر دیا اور انہوں نے اسے چھاپ دیا۔۔۔۔ اگر مالک رام کے مذہب کا مسئلہ نجی خطوں میں اٹھایا جا رہا ہے، ادیبوں کی صحبتوں میں

موضوع بحث بنتا ہے تو تحریر میں اسے کیوں نہ کھل کر کھنگال لیا جائے تاکہ آئندہ محققین کی رہبری ہو۔ بڑے ادیبوں کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر گوشہ پبلک کی ملک ہوتا ہے اور اس میں زندہ زعمائے ادب بھی شامل ہیں۔۔۔۔۔مالک رام کے مذہب کی حقیقت جاننے کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے مذہب یا اس مذہب میں ہونے سے ''ذکرِ غالب'' یا ''تلامذہء غالب'' کی قدر و قیمت پر کوئی اثر پڑے گا۔مقصد صرف سچ تک پہنچنا ہے۔میں حقیقت کو مقدس جانتا ہوں خواہ وہ فتنہ انگیز یا بے مصرف ہی کیوں نہ ہو'' (ہماری زبان ۲۲ مئی ۱۹۹۴)

مالک رام کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ادبی دنیا کے دستور کے مطابق ۱۹۷۱ میں ایک ارمغان ''ارمغانِ مالک'' کے نام سے شائع کیا گیا اور ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔اس کی پہلی جلد میں جناب سید علی جواد زیدی کا ایک مضمون ان کے مذہبی علوم سے شغف کے بارہ میں شائع ہوا۔اس میں وہ لکھتے ہیں'' مالک رام کی مذہبی تعلیم کی ابتدا ہر ہندوستانی کی طرح آغوشِ مادر ہی سے شروع ہوئی۔پھر چار برس کے سن تک گوردواروں میں گوروبانی کا ربانی پیغام سننے لگے۔ہندو دھرم اور آریہ سماجی اصلاحی تحریک پر کتابیں پڑھیں۔وزیر آباد کے دورانِ قیام میں ملک احمد حسن رہتاسی سے یارانہ ہوگیا۔یہ ہم جماعت بھی تھے اور شاعر بھی۔ان کا اردو اور فارسی کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔یہ اکثر مالک رام کو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے رہتے تھے۔ایک دن انہوں نے مذہب اسلام کے بارہ میں ایک کتاب مالک رام کے ہاتھ میں دیکھی۔ملک احمد حسن خود جماعت احمدیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے احباب کے پاس اسلامی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔انہوں نے کئی کتابیں مالک رام کو پڑھنے کو دیں۔مالک رام کا ذوقِ تحقیق و تجسس بڑھتا ہی گیا۔ان کا یہ مطالعہ بعد میں'' آریہ گزٹ'' کی ادارت کے زمانے میں بھی ان کے کام آیا اور ویسے بھی مذاہب کے تقابلی مطالعے میں مفید ثابت ہوا۔مالک رام کی اسلامی معلومات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اس سلسلے میں قادیان کے خلیفہ جناب مرزا بشیر احمد محمود احمد (صحیح اسمِ گرامی مرزا بشیر الدین محمود احمد ہے) سے ان کی ملاقات ہوئی۔وہ قادیان گئے تو وہیں چوہدری محمد ظفر اللہ خاں سے بھی تعارف ہوا اور وہ بھی ان کی ذہانت اور وسعتِ نظر کے گرویدہ ہو گئے۔جب بعد کو اخبار 'بھارت ماتا' سے علاحدہ ہوئے تو وہ ظفر اللہ خاں کی طلبی پر شملہ بھی گئے اور وہاں ان کے مہمان رہے اسی زمانے میں انہوں نے ایک دوست سید دلاور

شاہ بخاری سے قرآنِ مجید کے سترہ پارے ترجمے کے ساتھ پڑھے'' (''ذکرِ مالک'' مشمولہ ''ارمغانِ مالک'' پہلی جلد' نئی دہلی ۱۹۷۱ء ص ۳۲۔۳۳)۔

راقم الحروف کو یاد ہے کہ مالک رام نے ''وے صورتیں الٰہی۔۔'' کے عنوان سے خاکوں کی جو کتاب لکھی تھی اس میں پہلا مضمون ہی ملک احمد حسن صاحب اور ان کے ساتھ تعلق کے بارہ میں تھا اور میں نے اس کی بنیاد پر الفضل ربوہ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ملک احمد حسن صاحب مشہور شاعر حسن رہتاسی ہیں لیکن بعد میں قبلہ مولانا محمد احمد صاحب جلیل مدظلہ نے بتایا کہ یہ ملک احمد حسن اور بزرگ تھے لیکن اس بات کی تصدیق فرمائی تھی کہ احمدیت سے مالک رام کا تعارف انہیں کے ذریعہ ہوا اور انہیں قبول حق کی توفیق ملی۔

محولہ بالا ارمغان میں ایک مضمون ڈاکٹر محمد باقر کا ہے جس کا عنوان ہے ''مالک رام میرا دوست اور انسان دوست''۔ ڈاکٹر باقر لکھتے ہیں ''اس وقت مالک رام کا ادبی شغف نہ صرف اردو فارسی عربی بلکہ قرآن سے بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ اس نے اسلام اور اس کے مختلف فرقوں پر خاص توجہ کی۔ اس ضمن میں اسے احمدیہ تحریک سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی یہاں تک کہ وہ جب ایک مرتبہ مرحوم حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد کی لاہور میں آمد پر انہیں ملنے گیا تو اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ہم دونوں حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔۔۔ مالک رام تقریباً ایک گھنٹے تک قرآن کے مطالب اور اسلام کے مختلف موضوعات پر حضرت صاحب سے باتیں کرتا رہا اور میں صرف خاموشی سے سنتا رہا۔۔ یہ غالباً ۱۹۳۴ کی بات ہے'' (''مالک رام میرا دوست اور انسان دوست'' ایضاً صفحہ ۸۶)

کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے جو ''مالک نامہ'' مرتبہ کیا اور دلی سے شائع کیا ہے اس میں ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد ''مالک رام'' کے عنوان سے لکھتے ہیں' 'غالباً ۱۹۶۴ میں میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا' ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا میں نے ان سے درخواست کی انہوں نے قبول کر لی۔ اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورہ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا کلام پاک کا احترام تو مجھے ابتدا ہی سے گھر میں سکھایا

گیا تھا لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیم کی ابتدا اس احترام سے کی اور سورہ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے روحِ مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی'' (مالک رام' مشمولہ'' مالک نامہ'' مرتبہ کرنل بشیر حسین زیدی دلی ۱۹۸۷ صفحہ ۱۱)

حبیبہ بانو نے اسی'' مالک نامہ'' میں ان کی اولادوں کے نام اوشا' اروناٴ بشریٰ' آفتاب اور سلمان'' لکھے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۲) ناموں کے سلسلہ میں شیخ منظور الٰہی صاحب' درِ دلکشا' نے بھی سلسلہء روز وشب میں اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے کہ'' اتنے میں ایک بچے نے کمرے میں آکر پہلے مالک رام کے ساتھ چہلیں کیں پھر کتابوں سے بے تکلفی کرنے لگا' مالک رام صاحب نے بشریٰ کو آواز دی کہ آکے صاحبزادے کو لے جائے۔ بچوں کے نام رکھنے میں ان کی وسیع المشربی کو دخل ہے آفتاب' سلمان' اوشا' اروناور بشریٰ'' (سلسلہء روز وشب صفحہ ۱۴۳)۔ مالک رام کے صاحبزادہ نے ڈاکٹر گیان چند کے ایک خط کے جواب میں ناموں کی توضیح یوں کی؛'' والد صاحب نے کہا تھا کہ ناموں میں ایک تسلسل ہے اور اوشا 'تڑکا (دراصل شفق) ہے ارونا سورج کی شعاعوں سے آفتاب تک ہم بشریٰ جیسے نام کو قبول کر سکتے ہیں۔ سلمان دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے پر پیدا ہوا تھا سلمان کے معنیٰ ہیں امن' عبرانی میں شالوم امن ہے۔ اگر اتفاق سے ہمارے نام مسلم نام ہیں تو ان کے یہ معنیٰ نہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اوشا کی دو لڑکیوں کو بشریٰ اور زکی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور بشریٰ کی دو لڑکیوں کا نام مہر النساء اور سمیرا ہے۔ اس طرح ہمارے گھر میں دو بشریٰ ہیں'' (مکتوب بنام ڈاکٹر گیان چند مؤرخہ ۷ جون ۱۹۹۴)۔

دار المصنفین اعظم گڑھ کے جناب ضیاء الدین احمد اصلاحی کا مراسلہ بعنوان'' مالک رام کا مذہب'': ''میرے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑی تھی کہ ان کو قادیانی کہا جاتا ہے اسی لئے کئی بار چاہا کہ ان کے دین و مذہب کے بارہ میں ان سے براہ راست دریافت کروں مگر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان کی وفات سے دو تین برس پہلے ایک دفعہ کچھ اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں تو میں یہ عرض کر ہی بیٹھا کہ آپ کے عقیدہ و مذہب کے بارہ میں عجیب عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں۔ فرمایا جی ہاں میں بھی سنتا ہوں کچھ لوگ مجھے قادیانی کہتے ہیں اور بھی باتیں میری نسبت کہی جاتی ہیں خیر لوگ جو بھی کہیں مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دیگا۔ اس سے یہ خیال ضرور رہوتا

ہے کہ وہ قادیانی نہیں تھے'' (ہماری زبان ۱۸ اپریل ۹۴)۔ اس بات سے جناب ضیاء الدین احمد نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ان کا ذاتی خیال ہے۔ راقم الحروف جماعت احمدیہ کے علمِ کلام سے ذاتی واقفیت کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ مالک رام کا یہ فقرہ ہی ان کے احمدی ہونے پر دال ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا''۔ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ کہنا اور لکھنا فی زمانہ جماعت احمدیہ کے علمِ کلام کی خصوصیت ہے۔

اسی مضمون میں ڈاکٹر گیان چند جین نے انیسویں نمبر پر اپنے ایک مراسلہ کا حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے بعض باتوں کا تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں'' مالک رام صاحب سے متعلق میرے مضمون کی اشاعت کے بعد مجھے دو خطوط ملے جن میں مالک رام کی احمدیت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اپنے ۲۴ فروری ۱۹۹۴ کے مکتوب میں ترقی اردو بیورو کے شیخ سلیم احمد نے مجھے لکھا کہ ایک بار سید برکات احمد مرحوم (عرب ممالک میں سابق سفیر ہند) کے ساتھ امیر جماعتِ قادیان ان کے گھر آئے جب آخر الذکر جانے لگے تو انہوں نے کہا'' مالک رام صاحب کے یہاں جا رہا ہوں'' سید برکات احمد قادیانی تھے شیخ سلیم احمد نے برکات احمد سے پوچھا کہ کیا مالک رام بھی قادیانی ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا''۔ دوسرے خط کا حوالہ درج کرنے سے قبل میں سید برکات احمد صاحب کا تعارف کروا دینا چاہتا ہوں۔ سید برکات احمد' دلی کے مشہور خانوادے سید شفیع احمد اور بیگم شفیع کے صاحبزادے تھے ان کی ہمشیرہ بیگم نسیم سعید ہمارے ہاں کی مشہور مضمون نگار ہیں اور سلسلہ کے لٹریچر میں ان کی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ سید برکات احمد تقسیم ملک کے وقت پاکستان نہیں آئے بلکہ وہیں دفتر خارجہ سے منسلک رہے اور سفیر کبیر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کی کتاب مذہب کے نام پر خون کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ سید برکات احمد کی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جناب ڈاکٹر گیان چند نے جس دوسرے خط کا حوالہ دیا ہے وہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ۱۹۷۲ میں یا اس کے بعد کے ایل گابا (سابق کنہیا لال گابا مسلمان ہونے کے بعد خالد لطیف گابا) دلی آئے۔ رستوگی ان سے ملے تو گابا نے کہا'' ہندو (کذا) میں لچک ہوتی ہے میں ہندو تھا اور

ہوں مگر مالک رام ابھی تک قادیانی ہے۔ رستوگی نے جب مجھے مالک رام کے قادیانی ہونے کی بات لکھی تھی اس کے بعد انہوں نے انجمن احمدیہ قادیان سے رجوع کیا اور وہاں سے بھی تصدیق ہوگئی''۔

ڈاکٹر گیان چند مزید لکھتے ہیں میں نے ''ارمغانِ مالک'' میں مالک رام کی سوانح کو بہ نظر غور پڑھا ۱۹۳۶ سے کچھ پہلے مالک رام قادیان گئے اور احمدیوں کے خلیفہ جناب مرزا بشیر الدین محمود سے ملاقات کی۔ وہیں چودھری محمد ظفر اللہ خان سے ان کا تعارف ہوا اور ظفر اللہ خاں ان کی وسعتِ نظر کے گرویدہ ہوگئے۔ ۱۹۳۶ میں وہ ظفر اللہ خان کی دعوت پر شملہ گئے اور انہیں کے مہمان رہے۔ ۱۹۳۸ میں ظفر اللہ خان حکومت ہند کے کامرس اور ریلوے کے ممبر تھے مالک رام نے انہیں خط لکھ کر کسی مناسب ملازمت کی درخواست کی۔ ظفر اللہ خاں نے انہیں حکومت ہند کی مصر کی اسامی پر مقرر کر دیا۔ ظفر اللہ خاں قادیانی تھے کیا وہ مالک رام کی اس لئے سرپرستی کرتے تھے کہ ان کی رائے میں مالک رام قادیانی تھے؟'' (ہماری زبان ۲۲ اپریل ۱۹۹۴) یہاں پھر راقم الحروف کو کچھ کہنا ہے۔ چوہدری انور احمد کاہلوں نے اپنے محسن سر ظفر اللہ کے بارہ میں ''ظفر اللہ خاں میرا مربی'' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ وہ اس وقت چودھری صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری کے طور پر ان کے ساتھ یورپ جا رہے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ''یورپ جاتے ہوئے وہ اور سر ظفر اللہ سکندریہ میں رکے جہاں حکومت ہند کی تجارتی سفارت تھی۔ وہاں انہیں کمرشل قصل کے علاوہ جناب مالک رام بھی ملے جو احمدی تھے اور چوہدری صاحب نے کچھ وقت ان کے ساتھ گذارا مالک رام کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں چودھری صاحب نے مالک رام کو والدہ کا بہت خیال رکھنے کی تلقین کی اور انہیں اسلامی تعلیمات یاد دلائیں۔ ان کی والدہ اگرچہ ایک ہی گھر میں ان کے ساتھ رہتی تھیں مگر ان کی رسوئی علیحدہ تھی کیوں کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کھانا کھانا پسند نہیں کرتی تھیں۔'' (ظفر اللہ خان میرے مربی۔ صفحہ ۳۵)۔ میں اس کا حوالہ پہلے الفضل میں اپنے ''مالک رام کا ذکرِ مکرر'' والے مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔

اکیسویں نمبر پر پروفیسر مختار الدین احمد کے مضمون کا حوالہ ہے۔ عنوان ہے ''مالک رام کچھ ذاتی تاثرات''۔ لکھتے ہیں ''میں نے ایک بار انہیں لکھا کہ میرے کام وقت پر نہیں ہوتے سیمینار کا مقالہ آخری رات لکھتا ہوں اور ریڈیو کی تقریر کا کچھ حصہ ٹرین اور کچھ نشر گاہ پہنچ کر مکمل کرتا ہوں۔ بہت سے کام یا تو ہوتے نہیں یا

ادھورے رہ جاتے ہیں۔کوئی ترکیب بتایئے۔جواب حسبِ معمول فوراً آیا۔انہوں نے لکھا آپ کے مرض کا علاج بتا دیتا ہوں کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔آپ نمازیں پابندی سے وقت پر پڑھیں اور زیادہ بہتر ہے اگر پانچوں وقت کی نمازیں مسجد جا کر باجماعت ادا کریں۔میں حیران ہوا کہ یہ مشورہ مالک رام دے رہے ہیں یا بہار کے مشہور محقق اور اہل حدیث عالم مولانا عبدالمالک آروی'' (''آج کل''۔ گوشہء مالک رام۔اپریل ۱۹۹۴ص ۴)۔

ستائیسویں نمبر پر پروفیسر محمد اسلم صاحب کے مضمون ''ذکرِ مالک رام'' کا حوالہ ہے۔لکھتے ہیں ''ایک بار مالک رام کسی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کابل گئے ہوئے تھے۔وہاں دوتین مسلمانوں نے ان سے کہا کہیں وہ درپردہ مسلمان تو نہیں ہوگئے۔انہوں نے کہا اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو انہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟۔۔۔مالک رام صاحب کے گھر میں آیت الکرسی اور قرآنی آیات کے قطعات آویزاں تھے جناب خالد شمس الحسن نے ایک وڈیو کیسٹ تیار کی ہے جس میں ان قطعات کی بھی عکاسی ہے۔ان کے ڈرائنگ روم کا ماحول خالصتاً اسلامی تھا اور اس میں ہندو معاشرے کی کوئی معمولی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔۔جو مسلمان انہیں ملنے آتے تھے ان کے لئے جائے نماز بھی رکھی ہوتی تھی۔اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کا معاملہ خدائے عظیم و برتر کے ساتھ ہے۔قرآن حکیم کی سورہ الفتح کی پچیسویں آیت میں یہ ارشاد ہے کہ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں موجود ہیں جنہیں تم نہیں جانتے یعنی ان کے ایمان کا صرف خدا کو علم ہے۔شاید مالک رام بھی اسی زمرہ میں شامل ہوں'' (قومی زبان اپریل ۹۴' ص ۶۰۔۶۲)۔راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ سورہ الفتح کی آیت یہ ہے: ولو لا رجال مومنون و نساء مومنت لم تعلموھم ان تطئوھم فتصیبکم منھم معرہ بغیر علم (الفتح ۲۵)۔اسی سلسلہ میں انور سدید صاحب نے اپنے مضمون ''مالک رام کے نام کام اور ادبی مقام کو دوام حاصل ہے'' میں ڈاکٹر ریاض مجید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ'' وہ دہلی سے لوٹے تو میں نے پوچھا کس کس ادیب سے مل کر آپ کو سچی خوشی ہوئی؟ ریاض مجید نے بلا تامل جواب دیا پنڈت مالک رام سے۔ہم بھی ان کے دولت خانے پر سلام روستائی کے لئے حاضر ہوئے۔۔ریاض مجید نے ان کے گھر میں جس مشرقی تہذیب کا جلوہ دیکھا اس کی اساس پر کہنے لگے کہ مجھے تو مالک رام اندر سے مسلمان نظر

آتے ہیں'' (قومی زبان اپریل ۹۴ ص ۷۹۔۸۰)

بتیسویں نمبر پر جناب ڈاکٹر گیان چند کے نام ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا ایک مراسلہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں ''چونکہ اس موضوع کے بارے میں ایک سے زیادہ موقعوں پر مالک رام سے تبادلہء خیالات کا موقع ملا تھا اس لئے میرا کچھ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ مالک رام نے 'اسلامیات' سے متعلق کوئی کتاب شائع کی تھی اس پر عبدالمغنی صاحب نے غالباً مخالفانہ تقریر یا تبصرہ کیا تھا۔ ایک بار مالک رام صاحب سے اس کا ذکر ہوا جو کچھ انہوں نے کہا وہ ان کے تصور مذہب کے بارہ میں بھی اہم تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ دین ایک مکمل اور قدیم سچائی ہے جو مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجی جاتی رہی قرآن مجید میں واضح طور پر مختلف ملکوں اور زمانوں میں مختلف پیغمبر بھیجے جانے کا ذکر ہے ''ان مِن اُمةٍ اِلّا خَلا فِیہا نَذیر''۔ اور اس کی بھی صراحت ہے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے ممالک اور معاشروں میں ایسے پیغمبر بھیجے گئے جن کا ذکر قرآن میں موجود نہیں۔ مالک رام صاحب ہندوستان کے اوتاروں کو بھی شامل سمجھتے تھے اس عقیدے کے مطابق معمولات مظہری میں مرزا مظہر جانجاناں نے ہندو اوتاروں کو پیغمبر اور ہندوؤں کو ان پیغمبروں کا مقلد کہا ہے۔ ہمارے آپ کے زمانے میں مولانا حسرت موہانی کرشن جی کو خدا کا اوتار یا پیغمبر مانتے تھے۔ مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔ گویا مالک رام کے نزدیک اسلام الگ مذہب نہیں ہے۔ اور کبھی بھی اس کا دعویدار نہیں رہا بلکہ وہ اس دین فطرت کا تسلسل ہے اور اسی ابدی دین کا تسلسل ہے جو شروع سے چلا آتا ہے اور جس کی مختلف شکلیں یہودی اور عیسائی مذہب میں ملتی ہیں۔ ان سب مذاہب کو بھی الگ سمجھنے کے بجائے مالک رام صاحب اسلام ہی کے پیش رو دائرے میں شامل جانتے تھے اور یہ باتیں میں ان سے گفتگو کی بنیاد پر عرض کر رہا ہوں میری رائے یا تبصرہ اس میں نہیں ہے''۔

''وہ یہ کہتے تھے کہ قرآن مجید اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ ہم نے ہر دور ہر معاشرے میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں اس نصِ قطعی کی روشنی میں بھی ہندوستان میں رام کرشن اور بدھ کا پیغمبر ہونا ثابت ہے۔ (اور ثابت نہ بھی ہو تو کم سے کم قرینِ قیاس ضرور ہے) اس اعتبار سے ہندو رہ کر بھی کوئی شخص اسلام یعنی آخری مبعوثہ مذہب کے راستے پر چل سکتا ہے''۔

''یہ تو ہوا اسلام کے مذہب کے بارے میں ان کا رویہ۔ اسلام کے بعد کے دور میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے قائل تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ پیغمبر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو الگ شریعت الگ صحیفہ اور الگ نظام ہدایت ساتھ لاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو یہ سب ساتھ نہیں لاتے بلکہ اپنے سے پہلے پیغمبروں کی شریعت صحیفے اور نظامِ ہدایت کی ہی توضیح کرتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو وہ دوسری قسم کے پیغمبروں میں شمار کرتے ہیں اور دو باتوں کو سند کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ایک تو مرزا غلام احمد کی آنکھیں نیلی تھیں اور ان میں غیر معمولی کشش تھی اور اس قسم کی آنکھیں ان کے نزدیک کسی پیغمبر ہی کی ہو سکتی تھیں۔ دوسرے انہوں نے اپنی کسی کتاب میں دہی کو مختلف امراض کے لئے اکسیر بتایا ہے اور اسی بنا پر مالک رام صاحب نے کسی مرض کے سلسلہ میں دہی کا استعمال کیا اور فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ بھی مختلف واقعات مرزا صاحب اور ان کے صاحبزادے کے بارہ میں بیان کرتے ہیں۔ پروفیسر اختر اورینوی کا بیان ہے کہ انہوں نے مالک رام کے ساتھ احمدیوں کی کسی مسجد میں دریا گنج میں نماز ادا کی تھی۔''

''اب انہیں دونوں تصورات کو ملایئے تو تصویر یہ بنے گی کہ جس طرح قبل اسلام دور میں اسلام کے علاوہ مختلف مذاہب مثلاً یہودی اور عیسائی مذاہب بھی الہامی تھے اور دراصل اسلام ہی کا حصہ تھے اسی طرح ہندوستان میں بدھ، رام چندر جی، اور کرشن جی کے لائے ہوئے مذاہب بھی اسلام ہی کا حصہ بلکہ اس کے پیش رو مذاہب ہیں اور ہدایت کے مشترکہ سلسلہ سے وابستہ ہیں۔ اور یہی نہیں، یہ سلسلہ اسلام کے بعد بھی جاری رہا اور اس کے بعد بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی شکل میں پیغمبر یا ہادی آتے رہے جو گو اپنے ساتھ کتاب نہیں لائے تھے مگر اسی مشترکہ مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کر رہے تھے جو ازل سے آج تک مبعوث ہوتا آیا ہے۔ اس طرح مالک رام صاحب کا عقیدہ ہندو اور مسلمانوں کے معتقدات کا مجموعہ ہی نہیں تھا بلکہ مختلف مذاہب کی ظاہری تفریق میں ایک اندرونی مشترکہ بنیاد پر مبنی تھا'' ('' ہماری زبان'' ۸ اگست ۱۹۹۴)۔

جناب ڈاکٹر محمد حسن کا یہ طویل مراسلہ اپنے موضوع پر بڑا واضح مراسلہ ہے۔ جہاں تک جماعت احمدیہ کے عقائد کا تعلق ہے جماعت احمدیہ حضرت بدھ علیہ السلام۔ حضرت کرشن جی علیہ السلام اور حضرت رام چندر جی کو اللہ کے برگزیدہ اوتار سمجھتی ہے بلکہ حضرت مرزا صاحب کے دعوے کے مطابق وہ اس زمانہ

میں مثیلِ کرشن ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر صاحب نے یہ بات بھی ٹھیک لکھی ہے کہ حضرت مرزا صاحب کا دعویٰ کسی تشریعی نبوت کا نہیں وہ اپنے آپ کو پیغمبر اسلامؐ کا ظل اور بروز قرار دیتے ہیں۔ ان کی نبوت کا دعویٰ اسلام سے علیحدہ کوئی شے نہیں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کی تصدیق جماعت کے عقائد سے بھی ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر اختر اور ینوی صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی نہایت مخلص احمدی خاندان کے فرد تھے اس لئے ان کے بیان پر یقین کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ انہوں نے مالک رام کے ساتھ احمدیوں کی مسجد میں نماز ادا کی تھی۔

اس مضمون میں تیسویں نمبر پر جناب بشیر ساجد کا ایک مراسلہ درج ہے ''۱۹۴۲ میں راقم دہلی میں تھا وہاں ایک صاحب فضل محمد خاں جالندھری سے گاہے گاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ فضل محمد خاں نے بڑے وثوق سے کہا کہ مالک رام مسلمان ہو چکے ہیں لیکن اپنی خاندانی مصلحتوں کے پیشِ نظر اپنے اسلام کو پردہ ء اخفا میں رکھے ہوئے تھے' کیونکہ ان کے والدین اور دوسرے رشتہ دار ہندو تھے۔ بعض آثار وقرائن بھی فضل محمد خان جالندھری کے مالک رام کے اسلام کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔۔۔ ممکن ہے ۴۷ کے بعد بھارت کی آزادی ہندو' غلبہ اور مسلمانوں کے خلاف عداوت اور تشدد و تعصب کی وجہ سے مالک رام نے آخری دم تک اسلام کو چھپانے ہی میں مصلحت سمجھی ہو۔ آخری بات فضل محمد خان جالندھری کے بارہ میں بھی کہہ دوں کہ یہ صاحب کٹر قادیانی تھے اور دہلی کی قادیانی جماعت کے پروپیگنڈا سکرٹری اور مبلغ تھے''۔ (ماہنامہ سیارہ لاہور اشاعت خاص سالنامہ فروری ۱۹۹۴ ص ۳۶۴۔۳۶۵)۔

(فضل محمد خان صاحب ہمارے حسن محمد خان عارف کے والد گرامی تھے۔ چونکہ بسلسلہ ملازمت شملہ میں مقیم تھے اس لئے جماعت میں فضل محمد خان شملوی کے نام سے جانے جاتے تھے)۔

جناب ڈاکٹر گیان چند جین نے چوبیسویں نمبر پر الفضل ربوہ میں چھپنے والے ایک مضمون کا حوالہ بھی دیا ہے جو عزیزی یوسف سہیل شوق مرحوم نے لکھا تھا اور جو سیارہ لاہور کے کسی پرچہ میں مکرر چھپ کر کسی مراسلہ کی صورت میں ڈاکٹر صاحب تک پہنچا تھا۔ اس مضمون میں سہیل شوق مرحوم نے پہلی بات تو میرے حوالہ سے لکھی تھی کہ میں کسی کانفرنس کے سلسلہ میں ہندوستان گیا اور جناب مالک رام مجھے اپنے ساتھ لوا لے گئے۔ اس ملاقات کا حال جناب مالک رام کے ارشاد کے مطابق اخفاء میں رہا لیکن میں نے

اس کا ذکر اپنے بعض شاگردوں سے کیا جن میں یوسف سہیل شوق بھی تھے ۔ مالک رام صاحب کے احمدیوں کے ساتھ باجماعت نمازیں پڑھنے کا تو میں گواہ ہوں ۔ یوسف سہیل شوق نے دوسری گواہی جناب سید ظہور احمد شاہ مرحوم رکن ادارہ الفضل کی درج کی ہے جنہوں نے قاہرہ میں جناب مالک رام کے ہاں جمعہ کی نماز پڑھی تھی ۔ چونکہ یہ مضمون الفضل ربوہ (۳ ۔ اکتوبر ۱۹۹۳) میں چھپا تھا اس لئے رسالہ سیارہ لاہور والوں نے فروری ۱۹۹۴ کے پرچہ میں اس مضمون کو درج کیا اور اس کا عنوان لگایا'' مالک رام قادیانی تھے الفضل کا انکشاف'' میں اس طویل مضمون کو درج نہیں کرتا کیونکہ یہ سلسلہ کے لٹریچر میں پہلے موجود ہے۔

ڈاکٹر گیان چند صاحب نے پچیسویں نمبر پر جمیل الدین عالی کے ایک اظہاریئے کا حوالہ درج کیا ہے '' یہ ہمیشہ ایک معمہ رہا ہے کہ مالک رام صاحب کو اسلام سے اتنا شغف کیوں تھا؟ ان کی زندگی میں شبہ یہ کیا جاتا تھا کہ دل سے مسلمان ہیں بھارتی حالات کے سبب کھل کر ظاہر نہیں کرتے ۔ ایک افواہ یہ تھی کہ قادیانی ہیں اس لئے ظاہر نہیں کرتے حالانکہ قادیانی چند برس سے پاکستان میں تو احتیاط کر سکتے ہیں بھارت میں کریں بھی تو کیوں کریں'' (جنگ کراچی ۲۸ مئی ۱۹۹۳ ۔ بہ حوالہ قومی زبان کراچی مالک رام نمبر اپریل ۱۹۹۴ ص ۱۲)۔

اس تمام مواد کو جمع کر دینے کے بعد قبلہ ڈاکٹر گیان چند صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہے ۔ مگر مضمون کے آخر میں جو محاکمہ درج کیا ہے وہ سب کچھ کہے دیتا ہے'' مالک رام کے مذہب کے موضوع پر میں نے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اہل الرائے حضرات کی رائیں درج کر دی ہیں ۔ ان میں رسالہ سیارہ لاہور میں بشیر ساجد اور سہیل شوق کے مراسلے مالک رام کے فرزند آفتاب بویجہ کے میرے نام چار خطوط ہماری زبان ۱۸ اگست ۱۹۹۴ میں ڈاکٹر محمد حسن کا مراسلہ اور سید علی جواد زیدی کا مکتوب بنام خلیق انجم بہ طور خاص معلومات افروز ہیں ۔ تنہا ڈاکٹر محمد حسن کا مراسلہ اس موضوع پر جتنی روشنی ڈالتا ہے اتنی کوئی اور تحریر نہیں ڈالتی ۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین جملہ نگارشات کو پڑھ کر اپنے طور پر کوئی رائے قائم کر سکیں گے ''۔ (تجدید کلکتہ پہلا شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵)۔

مالک مرحوم کے بارہ میں یہ معلومات جمع کر دینے کا بڑا جرأتمندانہ کام جناب ڈاکٹر گیان چند جین نے

انجام دیا اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے۔ان کی خوشہ چینی کر کے مالک رام کا ذکر خیر کرنے میرا مقصد یہ ہے کہ احباب جماعت دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس مخلص عالم اور بے نفس انسان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔آمین۔

پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ

۱۹۴۷ء میں برصغیر ہند کو آزادی ملی تو دو ملک وجود میں آئے۔ بھارت اور پاکستان! مگر دونوں ملکوں کی ثقافت مشترکہ ہونے کے باوجود اپنا جدا جدا تشخص رکھتی تھی۔ اردو، برصغیر کی مفاہمتی زبان تھی اور ہندوؤں، مسلمانوں میں خیبر سے لے کر راس کماری تک بولی جاتی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس زبان کا ادبی سرمایہ بھی مشترکہ تھا۔ میر و سودا، ذوق و غالب، میر حسن و دیا شنکر نسیم، سب ہی شاعری کے میدان کے شہسوار تھے، برج نارائن چکبست کی نظمیں ہمارے سکول کے زمانہ تک نصاب میں اسی طرح شامل تھیں جیسے اقبال و حالی کی نظمیں۔ جوش کے ساتھ ساتھ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے کلام کو بھی یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ فیض کے نام کے ساتھ بھارت میں رہ جانے والے شعراء، ساحر لدھیانوی اور علی سردار جعفری کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ غرض دو مختلف ثقافتیں رکھنے والی قومیں ایک نقطہ پر آکر مل جاتی تھیں اور وہ نقطہ ادب تھا!

تقسیم کے بعد ہمارا تشخص اجاگر ہوا تو وہاں یہ رسم بھی چلی کہ ادب کو بھی سرحد کے پار کا اور سرحد کے اندر کا ادب کہا جانے لگا۔ حالانکہ ادب تو سرحدوں کو توڑتا ہے، دلوں کو جوڑتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تقریباً بیس برس تک دونوں ملکوں میں ادبی کتابوں کا تبادلہ بھی بند رہا۔ جو مہاجر ادیب اور شاعر پاکستان آگئے وہ پاکستانی ادیب اور شاعر بن گئے۔ ابتدا میں چند برس تو بھارت میں رہ جانے والے شعراء میں سے جگر مراد آبادی ادھر آتے رہے اور اِدھر کے شعراء میں سے بعض اُدھر جاتے رہے پھر یہ شاعروں کا آنا جانا بھی بند ہوگیا گویا سیاست نے ناقابل عبور دیوار تعمیر کردی۔ جس طرح ادب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نعرے تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہوئے تھے وہاں پاکستانی اور ہندوستانی ادب کے نعرے بھی لگنے لگے۔ بایں ہمہ اردو ادب، برصغیر میں پنپتا رہا اگرچہ پاکستان میں بادی النظر میں اردو

ادب زیادہ مقدار میں تخلیق ہوا مگر ادب کے پرانے مراکز دہلی اور لکھنو کا طنطنہ اسی طرح قائم رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب میں جتنا تحقیقی کام بھارت میں ہوا اور ہوتا رہا اتنا کام پاکستان میں نہیں ہوا۔ اور اب تو اردو ادب کا پھیلاؤ یورپ اور امریکہ کینیڈا تک ممتد ہے۔ اردو ادب دنیا کی پانچویں بڑی زبان ہے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد، پاکستان میں ادب کی جس صنف نے مقبولیت حاصل کی وہ افسانہ تھا۔ اور افسانہ میں بھی زیادہ تر ایسے افسانے جن کا تعلق کسی نہ کسی طریق سے تقسیم کے حوادث سے تھا۔

پھر نظم مقبول ہونا شروع ہوئی۔ مگر پچھلے پچیس برسوں میں، نظم کی دو صورتوں، معریٰ یا غیر معریٰ کے مقابلہ میں غزل نے اپنے پاؤں مضبوطی سے جمائے۔ ایک وقت تھا کہ مشاعروں میں وہ شاعر ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے جو ترنم کے دھنی تھے۔ اور وہ وقت بھی آ گیا کہ لوگ ترنم سے گھبرانے لگے! اب لوگ شعر کی معنویت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ افسانہ میں سے علامتی افسانے نے بہت مقبولیت حاصل کی، ناول ایک دور میں بڑی مقبول صنف سمجھی جاتی تھی، ہمارے اپنے احمدی ادیبوں میں سے سید شفیع احمد دہلوی نے ''دوربین'' جیسا ناول لکھ کر بہت شہرت حاصل کی تھی۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے خسر حضرت مولانا غلام حسن پشاوری نے بھی ایک ناول لکھا تھا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا تھا، نام میرے ذہن سے محو ہو گیا ہے، مگر پاکستان بننے کے بعد شرر کے تتبع میں تاریخی ناول زیادہ لکھے گئے، ہمارے احمدی ادباء میں سے قمر اجنالوی اپنے تاریخی ناولوں کی وجہ سے خاص طور سے ''چاہ بابل'' نامی ناول کی وجہ سے بہت مقبول ناول نگار سمجھے گئے۔ یہ دو تین نام تو محض اتفاق سے معرض اظہار میں آ گئے ورنہ میں پاکستان میں تخلیق ہونے والے اردو ادب کا ذکر کر رہا تھا۔ پاکستان میں ہجرت کر کے آ جانے والے شعراء پاکستانی شاعر بن گئے۔ لاہور ہمیشہ سے ہی اردو ادب کا مرکز رہا تھا۔ بڑے ادبی رسائل، عالمگیر، ادبی دنیا، مخزن وغیرہ یہیں سے شائع ہوا کرتے تھے اس لئے پاکستان کے شعراء کو ایک بنا بنایا ادبی میدان میسر آ گیا۔

جماعت احمدیہ کے جو بزرگ شعراء پاکستان تشریف لائے ان میں حضرت حافظ مختار احمد شاہجہاں پوریؓ، حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکملؓ اور حضرت مولانا ذوالفقار علی خان گوہرؓ کے نام نمایاں تھے۔ حضرت حافظ مختار احمد شاہجہان پوریؓ امیر مینائی کے نمایاں شاگردوں میں سے تھے۔ اور لکھنو کے اکابر شعراء کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں زبان کو برتنے کا جو سلیقہ تھا وہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

قادر الکلامی اس پر مستزاد۔ ان کا کلام محض تبرک نہیں تھا، اپنی استادانہ شان کی وجہ سے ممتاز تھا۔ آج بھی ان کا کوئی شعر سامنے آجائے تو اہل ذوق جھومنے لگتے ہیں! حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکملؓ، جماعت کے نہایت بزرگ اور پر گو شاعر تھے ''نغمات اکمل'' کے نام سے انکا کلام یکجا ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ مولانا ذوالفقار علی خان گوہرؓ علی برادران میں سب سے بڑے تھے، ان کا کلام بھی ان کے صاحبزادے پروفیسر حبیب اللہ خان نے ''کلامِ گوہر'' کے نام سے چھاپ دیا۔ حضرت حافظ مختار احمد شاہجہاں پوریؓ کا کلام غالباً مکرم سلیم شاہجہان پوری مرتب کر رہے تھے یا جمع کر رہے تھے۔ خدا معلوم وہ کام کس منزل میں ہے؟ کون سی منزل میں ہے؟ کون سی وادی میں ہے عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں؟ حیدر آباد کے ایک بزرگ ذوقی صاحب تھے جنکی نظم ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' کے بارہ میں بہت مشہور ہوئی۔ انکا انتقال پاکستان میں آکر ہوا۔

انہی بزرگ شعراء میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا نام نامی بھی آتا ہے۔ مظہر صاحب فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ مگر ان کے شعروں کی بجائے ان کا علمی کام زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور نہ صرف پاکستان کے علمی حلقوں میں بلکہ دنیا بھر کے مستشرق حلقوں میں انکی عربی کو ام الالسنہ ثابت کرنے کی سعی مشکور جانی گئی۔ جماعت احمدیہ کے علم کلام کو دنیا سے روشناس کروانے میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا بہت حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

ہمارے ہاں بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک فارسی گوئی کی روایت چلی آرہی تھی پاکستان کے ادبی حلقوں میں اس روایت کا چلن نہ رہا مگر ہمارے ہاں مظہر صاحب، اور حضرت مولانا راجیکیؓ ان کے صاحبزادے مبشر احمد راجیکی' ڈاکٹر اختر اورینوی' مولانا ابوالحسن قدسی اور ماسٹر عبدالرحمٰن خاکی نے اس روایت کو دیر تک نبھایا۔ جماعت کے پرچوں میں فارسی کی نظمیں چھپتی رہیں۔ پھر وہ وقت بھی آگیا کہ پاکستان کی ادبی روایت میں سے فارسی بالکل ہی خارج ہوگئی اور اس زبان کے جاننے والے خال خال رہ گئے! اور شعر کہنے والے؟ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہماری ساری ادبی روایت میں سے فارسی یوں خارج ہوگئی ہے جیسے کسی نے لُوکا لگا دیا ہو!

مگر جماعت احمدیہ کے جو شعراء تقسیم سے پہلے سے ادبی حلقوں میں معروف تھے ان میں سے دو نام بہت

نمایاں ہیں۔روشن دین تنویر اور سعید احمد اعجاز۔ یہ دونوں شعراء اپنے وقت کے مشہور ادبی پرچوں میں چھپا کرتے تھے۔تنویر صاحب پر تو پنجاب یونیورسٹی نے ایم اے اردو کا مقالہ لکھنے کی اجازت بھی دی تھی۔اور ہماری ایک احمدی بچی عزیزہ صفیہ کلثوم نے ان پر مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔سعید احمد اعجاز کی فلسفیانہ نظمیں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ان کا اصل میدان حکیمانہ شاعری تھا۔خدا معلوم انکا کلام ان کی اولاد نے چھپوایا یا نہیں؟ ان دونوں شعراء کا کلام پاکستان بننے کے بعد بھی جماعتی پرچوں میں چھپتا رہا اور داد وتحسین حاصل کرتا رہا۔ عبدالسلام اختر صاحب کے والد چوہدری علی محمد سرور جو بی ٹی صاحب کے نام سے معروف تھے ان کا کلام بھی نہ چھپا۔

بزرگ شعراء میں سے اب عبدالمنان ناہید ہی ایسے رہ گئے ہیں جن کا کلام تقسیم سے پہلے کے ادبی پرچوں میں چھپتا تھا ورنہ قیس مینائی، فیض چنگوی، نسیم سیفی وغیرہم تو رخصت ہو چکے۔چوہدری محمد علی صاحب بھی پرانی نسل کے نئے لہجے کے شاعر ہیں مگر تقسیم سے پہلے یا تقسیم کے بعد بھی کم کم ہی چھپنے میں آتے تھے۔ چُھپنے میں طاق تھے اس لئے انکا کلام زیادہ تر پاکستان بننے کے بعد ہی ابھر کر سامنے آیا۔

ثاقب زیروی صاحب اپنے ''دورِخسروی'' کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔اس کو شاہنامہ احمدیت بھی کہا جاسکتا ہے۔اس ناطے سے ثاقب زیروی صاحب ہمارے فردوسی ہیں۔ثاقب زیروی صاحب کا مجموعہ کلام ''شہاب ثاقب'' چھپ کر قبول عام حاصل کر چکا ہے۔میجر منظور احمد اور پیام شاہ جہاں پوری کے نام بھی جماعت احمدیہ کے شعراء میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔مجموعوں کا نام یاد نہیں۔عبدالرشید تبسم کی ایک یادگار، انکے پندرہ روزہ مشاعرے تھے۔جو باقاعدگی سے ان کے دولت کدہ پر منعقد ہوتے رہے۔لاہور کے بیشتر معروف شعراء انکے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔مگر تبسم صاحب کی وفات کے بعد'' آں قدح بشکست وآں ساقی نماند'' کا عنوان ہوا۔جماعت کے پرچوں میں جس شخص کا کلام سب سے زیادہ چھپا وہ حضرت مولوی مصلح الدین احمد راجیکی تھے۔

عبدالسلام اختر بھی تقسیم سے پہلے کے ادبی پرچوں میں چھپتے تھے۔ناگپور یونیورسٹی کے ایم اے تھے۔ وہیں سے معروف ہوئے۔حضرت بانی سلسلہ کی سیرت کے بعض حصوں کو آپ نے نظم کیا تھا۔اور یہی

ایک کتاب تھی جو بزرگوارم میاں عبدالسمیع نون کی اعانت سے چھپی بھی تھی مگر اختر صاحب غزل بھی اچھوتی کہتے تھے نہایت شگفتہ اور رواں جماعت کے پرچوں میں ان کا کلام بالالتزام چھپتا تھا۔ بزرگوارم سلیم شاہجہان پوری کا پاکستان سے قبل کا کلام میری نگاہ سے نہیں گزرا مگر آپ پاکستان میں بہت مقبول ہوئے۔ نواب شاہ میں آ کر بیٹھے اور ''ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت'' کا نمونہ دکھا دیا۔ حکیم سید عبدالہادی بہاری بھی بڑے پرگو شاعر تھے۔ مولانا دوست محمد شاہد کے خسر ماسٹر محمد ابراہیم شاد جماعتی موضوعات پر ثابت قدمی سے لکھنے والے شاعر ہیں۔ صاحبزادہ سید ابوالحسن قدسی کے صاحبزادے نعیم قدسی بھی نہایت اعلیٰ شعر کہنے والے تھے مگر ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر آپ اپنی آگ کا خس و خاشاک ہو گئے۔ مرحوم ہونے والوں میں ایک نام اور بھی تھا عبدالمنان شاد! ان کا کلام ان کے بھائی کریم لون نے ان کی وفات کے بعد اب آ کے شائع کیا ہے۔ ''ہم احمدی بچے ہیں کچھ کر کے دکھا دیں گے'' والی مشہور نظم انہی کی ہے۔ ایک اور بزرگ پیام شاہجہان پوری تھے شاعر بھی تھے اور صحافی بھی ان کا رسالہ تقاضے تھا۔
پاکستان میں جس شخص نے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان حاصل کی وہ غالب احمد ہیں۔ غالب احمد کا نام ادب لطیف کے حوالہ سے بہت معروف ہوا۔ انکے ماموں مکرم ملک عبدالرحمٰن خادم صاحب، خود شعر کہتے تھے یا نہیں کہتے تھے ان کے ذوق لطیف اور مزاح کا چرچا بہت تھا۔ آپ نے ہی استاد امام دین گجراتی کا دیوان اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کیا تھا مگر یہ تو تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ گجرات ہی کے شیدا گجراتی کا نام بھی خاصا مقبول ہوا۔ غالب احمد جدیدیت اختیار کرنے والوں میں بہت نمایاں نام ہے۔ پھر غالب احمد کے استاد پروفیسر چوہدری محمد علی کا کلام بلاغت نظام آہستہ آہستہ منظر عام پر آنے لگا۔ ادبی حلقوں کی جچی تلی رائے یہ ہے کہ چوہدری محمد علی اور ناصر کاظمی دو ہمزاد نام ہیں۔ ایک نے اخفا میں رہنا پسند کیا دوسرے نے پاکستان کی چوتھی دہائی تک پاکستان کے ادبی حلقوں میں تہلکہ برپا کئے رکھا۔ چوہدری محمد علی مضطر صاحب تو اخفائے کلام۔ کے سلسلہ میں بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک بڑے کٹر نظریات رکھتے تھے۔ اب خلافت رابعہ کے دور میں کھل کے سامنے آئے ہیں اور چھپنے لگے ہیں۔ مگر ان کا کلام صرف سلسلہ کے پرچوں ہی میں چھپتا ہے۔ ایں ہم غنیمت است۔ تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ میں سے پروفیسر نصیر احمد خاں، بہت نغز گو شاعر تھے۔ ان کا مجموعہ ''رود چناب'' چھپ کر ملک کے ادبی حلقوں سے

تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جنرل محمود الحسن صاحب ایمن آبادی اپنے مخصوص انداز فکر کے ممتاز شاعر ہیں انکا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ ''شہدِ سم''!!

میں شعراء کا ذکر کرتے ہوئے جماعت کے ادیبوں کو نظر انداز کر گیا۔ ادیبوں سے مراد ایسے ادیب نہیں ہیں جو محض ادب تخلیق کرتے ہیں۔ میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جن کی تحریروں میں ادبی شان موجود ہوتی ہے۔ ان ادباء کے سالار تو قمر الانبیاء حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ ہیں۔ حضرت میاں صاحب کی تحریر میں ایک خاص استادانہ دل آویزی تھی۔ انہیں لفظوں کو برتنا آتا تھا۔ ان کی نثر میں بھی لفظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ جماعت کے علم کلام کو ہر کہہ ومہہ تک پہنچانے کا کام انہیں کو سزاوار تھا۔

جماعت کے علماء میں سے حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری، حضرت قاضی محمد نذیر صاحب لائلپوری بھی مناظراتی ادب میں منفرد تھے۔ مولانا دوست محمد شاہد نے تاریخ نویسی میں اپنے اسلوب کا لوہا منوایا۔ جن لوگوں نے ادبی حلقوں میں اپنی انفرادیت منوائی ان میں مکرم شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی بہت منفرد ہیں۔ شیخ صاحب حالی کے ہم وطن ہی نہیں انکے معنوی شاگرد بھی تھے۔ شیخ صاحب ہی کے صاحبزادے محمد احمد پانی پتی نے عربی کی مستند تاریخی اور علمی تصانیف کو اردو میں منتقل کیا اور پاکستان کے علمی وادبی حلقوں میں اپنی شناخت پیدا کی مگر ''خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود'' کا عنوان ہوا۔ قمر اجنالوی صاحب نے ناول نگاری کے علاوہ صحافت میں اپنی فکاہیہ نگاری کا لوہا منوایا۔ عبدالمجید سالک نے ان کے ایک فکاہیہ سے خوش ہو کر اپنا کالم افکار وحوادث انہیں بخش دیا تھا۔

حضرت ماسٹر محمد حسن آسان دہلوی (دلی کے ایک ہندو تذکرہ نگار نے انہیں بلبلِ ہزار داستان کا خطاب دے کر اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے) اور ان کے نامور صاحبزادے مسعود احمد خاں دہلوی نے دہلی کی ٹھیٹھ بامحاورہ زبان میں اپنی امتیازی حیثیت اور شان برقرار رکھی۔ سیٹھ محمد اعظم دکن کی تہذیب کے نمائندے تھے انہیں دکن کی مٹی سے بہت انس تھا۔ ان کے ہاں صاف ستھری زبان لکھنے کا چلن قائم رہا۔ جس طرح بھائی مسعود احمد خاں دہلوی نے دہلی کے اجڑے دیار کی یاد قائم رکھی، سیٹھ محمد اعظم صاحب لیلائے دکن کی محبت کے گن گاتے رہے۔ افسوس کہ ان کے مضامین بھی شاید دیمک کی غذا ہی بن گئے ہوں گے۔ کوئی انہیں یکجا کرنے اور شائع کرنے والا نہ ہوا۔ میاں عبدالسمیع نون صاحب اپنے منفرد انداز

میں جماعتی پرچوں میں لکھتے رہتے ہیں۔ جنید ہاشمی اور شیخ عبدالقادر محقق بھی نثر نگاروں میں نمایاں رہے۔
آج کل محمود مجیب اصغر صاحب بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ مولانا بشیر احمد رفیق کا لکھنے کا اپنا اسلوب ہے۔
احمدیوں کے ہاں خودنوشت کا سب سے مشہور اور عمدہ نمونہ تو حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل دہلویؓ کی آپ بیتی ہے مگر حضرت چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحبؓ کی ''تحدیث نعمت'' کو بھی اردو کی منفرد اور ممتاز خودنوشت سمجھا جاتا ہے۔ مکرم میاں محمد ابراہیم صاحب کی خودنوشت بھی اچھی قابل قدر کتاب ہے۔ ملک محمد عبداللہ صاحب نے بھی اپنی یادوں کو جمع کر دیا ہے اسی طرح جماعت کی بعض اہم شخصیات کے بارہ میں ان کے تاثرات محفوظ ہو گئے ہیں۔
تاریخ نویسی بھی جماعت میں قائم رہی۔ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ نے جماعت کے ابتدائی ریکارڈ کو محفوظ کرنے کا اہم کام کیا تھا مگر اس سلسلہ میں اب سب سے زیادہ اہم اور وقیع کام پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک ملک صلاح الدین صاحب اور مولانا دوست محمد شاہد صاحب نے کیا۔ ''تاریخ احمدیت'' مولانا کا نام رہتی دنیا تک قائم رکھے گی۔

پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب کی جلسہ کی تقریریں جماعت احمدیہ کے علم کلام کا عمدہ نمونہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح موجودہ دور میں دو چار اساتذہ نے معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور پڑھنے والوں سے داد حاصل کی ہے۔ پروفیسر مرزا مجید احمد صاحب اور پروفیسر میاں محمد افضل صاحب' پروفیسر راجہ نصراللہ خان صاحب اور پروفیسر عبدالکریم خالدؔ کے ہاں خلوص، سادگی اور سچائی نمایاں ہے اس لئے ان کی نثر میں تاثیر ہے۔ کیا جانے دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے۔ کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں!! ان سب حضرات کے مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پروفیسر سعود احمد خاں اور پروفیسر محمد ارشد چوہدری اور اب پروفیسر طاہر احمد نسیم مختلف تاریخی اور سیاسی اور سائنسی مسائل پر لکھتے رہتے ہیں۔ کینیڈا سے زکریا ورک سائنسی مضامین پر خوب لکھ رہے ہیں ڈاکٹر عبدالسلام پر ان کا تحقیق کام نمایاں ہے۔ پاکستان کے ادیبوں میں مرزا خلیل احمد قمر خوب فعال ہیں۔ انجینئر خالد سیف اللہ آسٹریلیا میں بیٹھ کر معلوماتی مضامین کے انبار لگا رہے ہیں۔ الفضل ربوہ میں نئے نثر نگاروں کی ایک کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ نثر نگاروں کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد پھر شعراء کی طرف لوٹتا ہوں۔

پاکستان کی پہلی دہائی میں سلسلہ کے پرچوں میں چھپنے میں ہمارے احمدی شعراء میں جو لوگ نمایاں ہوئے ان میں دو نام جامعہ احمدیہ سے متعلق تھے۔ مکرم مولوی ظفر محمد صاحب ظفر جن کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔ اور مولوی عطاء الرحمٰن طالب۔ طالب صاحب سلسلہ کے بعض پرچوں میں چھپتے رہے لیکن انکا کلام یکجا نہ ہوا۔ اسی طرح مابعد والوں میں سے مولانا محمد شفیع اشرف اور ڈاکٹر نذیر احمد ریاض تھے۔ اس وقت کی نئی نسل میں سے راجہ نذیر احمد ظفر، امین اللہ خاں سالک آگے آئے مولانا مصلح الدین احمد راجیکی کی شاعری کا چرچا قادیان کے زمانہ سے تھا مگر ربوہ کے ابتدائی دنوں میں ان کا کلام سلسلہ کے اخبارات و رسائل کی زینت بنتا رہا۔ راقم الحروف کو انہی سے تلمذ حاصل ہے۔ ان کے ہاں دردمندی کی جو کیفیت ابھرتی ہے وہ فانی کے سوا اور کسی میں نظر نہیں آتی۔ انہی کے چھوٹے بھائی مبشر احمد راجیکی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پوری قدرت کے ساتھ شعر کہتے رہے۔ حافظ سلیم اٹاوی بھی بہت عمدہ شعر کہنے والے تھے۔ جناب آفتاب احمد بسمل اور احسن اسماعیل صدیقی صاحب بھی اس عہد کے ممتاز شاعر ہیں۔ جماعت کے علماء میں سے مولانا محمد صدیق امرتسری بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کے ہاں روانی اور سلامت بہت تھی۔ ''نغماتِ صدیق'' کے نام سے کلام چھپ چکا ہے۔ چوہدری شبیر احمد بھی وقتاً فوقتاً شعر کہتے رہتے ہیں۔ ارشاد احمد شکیب اور سید ادریس احمد عاجز عظیم آبادی بھی ان کے ساتھ کے شاعر تھے۔ مولانا محمد دین ناز بھی شعر کہتے ہیں۔ ہم نے ان سے درخواست کی تھی کہ اپنا کلام چھاپیں تو اس کا نام کلامِ ناز کی بجائے ''خرامِ ناز'' رکھیں۔ ان کے بعد کا دور بالکل جدید شعراء کا دور ہے۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ جماعت احمدیہ کے کچھ شعراء ایسے ہیں جو ادبی میدان میں بہت فعال رہے اور ادبی پرچوں میں خوب خوب چھپے۔ مگر جماعت کے پرچوں میں ان کا کلام کم کم ہی چھپا ہے۔ ان میں رشید قیصرانی، اکبر حمیدی، حامد برگی، اور عبید اللہ علیم جیسے شعراء شامل ہیں۔ جن کے مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں۔ رشید قیصرانی چونکہ تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ بوائے ہیں اس لئے المنار میں ان کا کلام چھپتا رہا۔ اکبر حمیدی کا کلام، ''لاہور'' میں تو ضرور چھپا، جماعت کے دیگر پرچوں میں بہت کم چھپا، اس لئے وہ جماعت احمدیہ کے ساتھ مخلصانہ وابستگی رکھنے کے باوجود جماعت میں زیادہ متعارف نہ ہوئے۔ عبید اللہ علیم کو اب آ کے جماعت کے پرچوں کیطرف توجہ ہوئی ہے۔ نئی نسل میں سے صابر ظفر ایسے شاعر

ہیں جو ملک کے ادبی حلقوں میں بہت جانے پہچانے ہیں۔ انکا کلام بھی المنار میں چھپتا رہا۔ انکے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ محمد خالد، ابرار احمد، طاہر عارف، افضال نوید، رشید ندیم، عارف ثاقب، احمد مبارک، رفیع رضا اور آصف محمود باسط' عبدالسلام اسلام اور چھپے رستم سید قمر سلیمان احمد نوجوان نسل میں اپنا منفرد لہجہ رکھنے والے شعراء ہیں۔ اب ان میں مبارک احمد ظفر بھی آ شامل ہوئے ہیں۔ ان کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ انوار احمد بہت نمایاں لہجہ رکھنے والا شاعر تھا مگر دست اجل کا شکار ہو گیا۔ ان میں سے کچھ یعنی افضال نوید، رشید ندیم، رفیع رضا' اکرم ثاقب' مظفر منصور کینیڈا میں ہیں۔ افضال نوید اور اکرم ثاقب کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ کینیڈا میں ہی ایک اور مانوس نام ہدایت اللہ ہادی کا ہے خالد ربانی تو راہی ءبقا ہو گئے۔ جرمنی میں نوجوان شاعر خالد ملک ساحل ہیں جن کا کلام چھپ چکا ہے۔ برطانیہ میں آدم چغتائی ہیں۔ عبدالسلام اختر کے برادر خورد منصور احمد ہیں۔ یہ لوگ اپنے رنگ میں جماعت کے ادبی میدان میں کام کر رہے ہیں۔ امریکہ میں حبیب الرحمٰن ساحر ہیں جن کا کلام جماعت کے پرچوں میں ساحر حبیب کے نام سے چھپتا رہتا ہے۔ ہالینڈ سے جمیل الرحمٰن جمیل کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں ایک تو حال ہی میں چھپا ہے۔ جمیل الرحمٰن نے جماعت کے ایم ٹی اے کے لئے بہت سے ترانے لکھے ہیں اور اللہ کے فضل سے مقبولیت حاصل کی ہے۔ طاہر مجید' غلام محی الدین صادق اور راجہ محمد یوسف کا تعلق جرمنی سے ہے۔ ان کا کلام بھی اب سلسلہ کے پرچوں میں چھپنا شروع ہوا ہے۔

موجودہ نسل کے جن شعراء کے کلام نے جماعت کے پرچوں میں چھپنے کے بعد اپنی پہچان بنائی ان میں ذرا سینئر شعراء عبدالکریم قدسی اور، مبارک احمد عابد اور انجینئر مبشر خورشید ہیں۔ اس کے بعد کے سلسلہ میں عبدالکریم خالد یوسف سہیل شوق، اکرم محمود اور طاہر عارف ہیں۔ طاہر عارف کے دو مجموعہ ہائے کلام چھپ چکے ہیں ایک اردو کا ایک پنجابی کا۔ لطیف قریشی نے آزاد شاعری کرنے کے علاوہ البتہ تنویر صاحب کا کلام یکجا کرنے اور شائع کرنے کی نیکی کی ہے۔ انور ندیم علوی صاحب آج کل خوب لکھ رہے ہیں مگر ان کا کوئی مجموعہ چھپا یا نہیں یہ بات میرے علم میں نہیں۔

موجودہ دور کے نوجوان احمدی شعراء کے نام ہی لکھنے لگوں تو ایک دفتر ہو جائے۔ مگر اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے نوجوان شعراء میں وہ شاعرانہ حسیت جسے poetic sensibility کہتے

ہیں ہماری پچھلی نسل سے کہیں زیادہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے بہت سے شعراء اردو شاعری کے آسمان پر ستارے بن کر جگمگائیں گے اور اس امر کا بھی یقین ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو جماعت احمدیہ کے علم کلام کی ترویج میں صرف کریں گے۔

یہ بات کہنا خودستائی میں شمار نہ ہو تو کہہ دوں کہ نوجوان نسل کے جن شعراء کا نام میں نے لیا ہے ان میں سے اکثر تعلیم الاسلام کالج کے پڑھے ہوئے اور میرے شاگرد ہیں۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

حسن رہتاسی، جماعت کے مزاحیہ شعراء کے سرخیل تھے۔ مگران کے رنگ کا تتبع کرنے والا کوئی نہ ہوا البتہ ناجی سبزواری اس راہ پر افتاں خیزاں اب تک ثابت قدمی سے چلے آرہے ہیں۔ اب بہ قول شخصے ''بندے دے پتر'' بن گئے ہیں اور ''ابنِ آدم'' کے نام سے لکھتے ہیں۔ ناجی صاحب نے مدتوں پہلے ''روح القدس کے موسیقار'' کے عنوان سے احمدی شعراء کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔

خواتین شعراء میں سے بزرگ خواتین میں سے سب سے پہلا نام تو حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کا ہے۔ ''درِ عدن'' جماعت کے علم کلام کا اعلیٰ نمونہ ہے پھر شاگرہ تھیں یا منیرہ ظہور، اب اس میدان میں صاحبزادی امۃ القدوس، ڈاکٹر فہمیدہ منیرؔ آپا طاہرہ صدیقہ ناصر سلمہا اور امتہ الباری ناصر اور ارشاد عرشی کی تگ وتاز جاری ہے۔ جرمنی میں مقیم نعیمہ ضیاء الدین بھی ادبی حلقوں میں خوب معروف ہیں۔ اسی طرح کینیڈا سے نزہت الماس صدیقی اور راشدہ اشرف سیال اور وسیمہ قدسیہ بہت معروف نام ہیں۔ نزہت کو بعض ادبی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ امریکہ کی عاتکہ صدیقہ کے مضامین ''لاہور'' میں چھپ رہے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد پر ان کی دو تحقیقی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ پروفیسر نسیم سعیدؔ سلسلہ کے لٹریچر میں قابلِ قدر اضافے کر رہی ہیں۔ ان کی بہت سی تصانیف معرضِ وجود میں آچکی ہیں۔ اپنے نامور باپ اور باپ سے زیادہ نامور ماں کے ورثہ کا تحفظ ان کا شیوہ ہے۔ ان کے بھائی سید برکات احمد سابق سفیر حکومت ہند نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی کتاب ''مذہب کے نام پر خون'' کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔

یہ تو ادباء شعراء کا ذکر تھا۔ پاکستان میں اردو کی ترویج واشاعت میں ربوہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ تعلیم الاسلام کالج میں ملک کے ممتاز ادباء اور شعراء وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ کالج میں ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۷ء

ہیں دوکل پاکستان اردو کانفرنسیں بھی ہوئیں جن میں سے پہلی کانفرنس کی کاروائی ''ذکر اردو'' کے نام سے چھپی۔

تعلیم الاسلام کالج کو حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحبؒ جیسا پرنسپل ملا جسے آگے چل کر منصب خلافت پر فائز ہونا تھا۔ حضرت صاحب کی رہنمائی میں تعلیم الاسلام کالج اردو کی ترقی میں کوشاں رہا اور ملک کے ادباء اور علماء ان خدمات کے معترف ہیں! ان کانفرنسوں اور بزم اردو کی بیشتر سرگرمیوں کے لئے پروفیسر محبوب عالم خالد اور خاکسار راقم الحروف کو خدمت کی توفیق ملتی رہی!

اب پھر ذرا سا گریز نثر کی طرف۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں سے سعید انجم، ناروے اردو کے چند مشہور ترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے تھے۔ عبدالقیوم شاد، سلسلہ وار افسانوی داستانوں کے لئے بہت معتبر گنے گئے بلکہ وفات کے بعد بھی اب تک ان کے افسانوی سلسلے مختلف رسالوں میں دہرائے جا رہے ہیں۔ انشائیہ نگاری میں اکبر حمیدی اور حامد برگی کے نام بڑے ممتاز ہیں۔ اخباری نامہ نگاروں میں عرفان احمد خان نے اب آ کے قدم رکھا ہے اور اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ امریکہ کے لطف الرحمن محمود کالج کے زمانہ میں لام میم کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے ان کے ہاں طنز و مزاح کی لطیف کیفیات موجود تھیں مگر اب انہیں فرصت نہیں رہی یا ''کشاکشِ غمِ پنہاں'' نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

راقم الحروف کو بھی نظم و نثر میں خدمت کی تھوڑی بہت توفیق ملتی رہی اور اس ہیچ مدان کے مضامین جماعت کے کسی ایک پرچے میں چھپنے کے بعد جماعت کے بہت سے دوسرے پرچوں میں اور دوسرے ممالک میں بھی مکرر چھپتے رہے۔ نظموں کا سلسلہ یہ رہا کہ خاکسار جماعت کے پرچوں میں تو چھپتا رہا مگر ملک کے وقیع ادبی رسائل کے مدیران کے کہنے کے باوجود ان رسائل سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں اپنی شعری صلاحیت کو صرف جماعت احمدیہ کی خدمت کے لئے وقف رکھنا چاہتا ہوں اور ان مدیران نے ازراہ کرم میرے اس عذر کو قبول فرما لیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ادبی جرائد نے جماعت کے پرچوں میں چھپنے والی کسی چیز کو اپنے پرچوں میں مکرر چھاپ کر میری عزت افزائی فرمائی۔ جماعت کے بہت سے شعراء کے مجموعہ ہائے کلام پر تعارفیے لکھنے کی توفیق ملتی رہی حتیٰ کہ ملک کے نامور نقاد ادیب اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک کتاب کا تعارفیہ لکھنے کا اعزاز بھی اس حقیر کے حصہ میں آیا۔

غرض پاکستان میں اردو ادب کی ترویج وترقی میں جماعت احمدیہ کے ادباء اور شعراء کا بھی حصہ ہے اور جماعت کے ادباء شعراء کا مسلک بھی جماعت کا وہی عمومی مسلک ہے کہ صلے سے بے نیاز ہو کر خدمت کرتے چلے جاؤ! اور بے حد خوشی ہے کہ ان پچاس برسوں میں ادب کے میدان میں بھی جماعت احمدیہ کسی سے پیچھے نہیں رہی!

ربوہ کے احمدی شعراء

ہماری ادبی ہوش کی آنکھیں کھلیں تو ربوہ میں مولوی مصلح الدین احمد صاحب راجیکی کی شاعری کا چرچا تھا۔ ان کی نظم ''لغزش'' بہت مشہور اور زبان زد عام تھی۔ مصلح صاحب سے ملاقات ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے فانی بدایوانی سے ملاقات ہوگئی ہے۔ فانی صاحب کے بارے میں کتابوں میں پڑھ پڑھ کر جو تصور قائم کر رکھا تھا مولوی مصلح الدین اس تصور پر ہو بہو پورے اترے۔ طبیعت کے نہایت مسکین۔ گفتگو میں دھیمے۔ چادر کی بکل۔ سر پر ٹوپی پاؤں میں گرد آلود جوتے۔ ہماری گلی کی نکڑ پر حافظ غلام محی الدین صاحب نے ایک چھوٹا سا چائے خانہ کھول رکھا تھا۔ بس مولوی صاحب وہیں براجمان رہتے تھے۔ سیلونی کے چائے خانہ میں بھی نہیں جاتے تھے کہتے تھے اس کی نفاست سے دم گھٹتا ہے۔ ہمیں شعر کہنے کا شوق چرایا تو سب سے پہلے مولوی مصلح الدین احمد صاحب کو اپنا کلام دکھایا۔ آپ نے اصلاح دی مگر ساتھ ہی نصیحت بھی کی کہ اساتذہ کا کلام غور سے پڑھیں، میر، سودا، آتش، ذوق اور غالب کا کلام خود مولوی صاحب کو میر اور غالب بہت پسند تھے۔ غالب کے تو وہ حافظ تھے۔

مولوی مصلح الدین احمد، حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی کے بیٹے تھے۔ باپ کی ولایت سے حصہ وافر پایا تھا۔ حددرجہ مستغنی الاحوال۔ ان کے ذریعہء معاش کا کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا مگر فکر معاش سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کا کلام ان کے چھوٹے بھائی مبشر احمد صاحب راجیکی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ لیکن خود ہمیں بھی کئی مقامات پر احساس ہوا کہ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے کلام میں جہاں تہاں دخل دیا ہے مگر وہ کلام انکی پوری شخصیت پر محیط نہیں۔ بہت سا ایسا کلام ہے جو اس میں شامل نہیں یا بوجوہ شامل نہیں کیا گیا۔ اب وہ کلام کون جمع کرے گا؟

مصلح الدین احمد کی شخصیت کا جو پہلو اب بھی میرے ذہن میں متحضر ہے وہ ان کی حرماں پرستی ہے۔ آپ نے حرماں پرستی میں تصوف کی چاشنی پیدا کر دی تھی۔ ان کے شعر دردمندی کی تصویر ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کرسی پر اکڑوں بیٹھتے تھے۔ چادر یا کمبل کو اپنے سارے وجود کے گرد لپیٹ لیتے تھے۔ شعر سنانے کا

ہو کا نہیں تھا۔ بس کبھی کبھار طبیعت آتی تو سناتے تھے۔ مجھے اب بھی کل کی طرح یاد ہے کہ حافظ محی الدین کے چائے خانے کی ایک بنچ پر بیٹھے، مولوی صاحب نے غزل سنائی تو حاضرین میں سے ایک صاحب اتنا روئے کہ ان کی گھگھی بندھ گئی۔ غزل تھی۔

سلیقہ نہیں تجھ کو رونے کا ورنہ
بڑے کام کا ہے یہ آنکھوں کا پانی

اس غزل کا مطلع غالباً یہ تھا۔

محبت محبت جوانی جوانی
دلوں کا فسانہ نظر کی کہانی

الطاف مشہدی کی غزل بھی تھی جو ان دنوں بہت مقبول تھی۔ مجھے یوں ہی شبہ سا ہو رہا ہے کہ یہ مطلع شاید الطاف کی غزل کا ہے! بہر حال مولوی صاحب کی غزل سے سننے والے وجد میں آجایا کرتے تھے۔

مصلح الدین احمد کے کلام کے ایک حافظ تو اب بھی ربوہ میں موجود ہیں اور وہ ہیں ہمارے چچا، قبلہ مولوی عبدالعزیز صاحب بھامڑی۔ اب بھی ربوہ کے نوجوانوں میں سے کوئی ہمت کرے تو قبلہ مولوی صاحب سے سن سن کر بہت سا کلام جمع کر سکتا ہے۔ ! کیا ربوہ کے نوجوان اہل ذوق میں سے کوئی صاحب دل ہے؟ (حیف کہ مولوی صاحب یہ سارا خزانہ اپنے ساتھ لے گئے)

حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری ربوہ تشریف لے آئے تو ان سے بھی نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت حافظ صاحب، امیر الشعراء، امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اور لکھنوی دبستان شاعری کے آخری چراغ! قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ نہایت مشکل زمینوں میں طویل غزلیں کہتے۔ دوغزلہ سہ غزلہ اور چہار غزلہ تک تو ہم نے بھی سنا ہے۔ غزل کے رویے میں ایک طویل مرثیہ آپ نے کہا۔

بیڑیاں توڑ کے چلتے ہوئے یارانِ کہن۔ اب اسی دھن میں قریب درِ زنداں ہوں میں!

اسکے شعروں کی تعداد میرا خیال ہے سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس کے کچھ اشعار ہم نے حضرت حافظ صاحب کی زبان مبارک سے سنے ہیں۔ حافظ صاحب، سید عبدالباسط صاحب کی بیٹھک میں ایک پلنگ پر تشریف رکھتے تھے۔ وہی بیٹھک ان کا گھر تھا۔ پلنگ پر ہر طرف کاغذ ہی کاغذ اور کمرے میں ہر طرف

کتابیں ہی کتابیں ہوتی تھیں۔ حضرت حافظ صاحب سے ایک بار ایک غیر از جماعت اور جید عالم ملنے کو آئے۔ حافظ صاحب نے ان سے ایسی مدلل گفتگو کی کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئے کہ اتنا سادہ شخص علم کا سمندر اپنے سینے میں دبائے بیٹھا ہے۔ باہر نکل کر انہوں نے جو پنجابی فقرہ کہا اس کا حوالہ ایک بار حضرت صاحب نے اپنی ایم ٹی اے کی گفتگو میں بھی دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ''ایہہ کی بلا بڈھی اوئی ایہہ''! یعنی آپ نے اس چھوٹے سے کمرہ میں کس بلا کا عالم بند کر رکھا ہے۔

بزرگ شعراء میں سے حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل سے صرف ایک بار ملاقات کا موقع ملا۔ اکمل صاحب بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا۔ ناک پر چمکیلے سنہری فریم کی عینک تھی۔ اکمل صاحب نہایت زود گو شاعر تھے۔ اور سلسلہ کے پرانے اخبارات و رسائل انکے کلام سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی کلیات برادرم محترم جنید ہاشمی صاحب نے چھاپ دی تھی۔ ''نغمہ اکمل'' مگر یہ کلیات میر تقی میر کے کلیات کی طرح اتنی ضخیم ہے کہ پڑھنا مشکل ہے۔ اور دوسرے یہ کہ بے ترتیبی سے چھاپی گئی ہے۔ اور اپنی افادیت کھو بیٹھی ہے۔ اے کاش کوئی اس کو دوبارہ ایڈٹ کر کے چھاپ دے۔ اکمل صاحب کے دونوں بیٹے صاحب ذوق تھے جنید ہاشمی اور شبلی بی کام۔ شبلی بی کام کے نام کے ساتھ بی کام کا لاحقہ ایسا چپکا کہ ایم کام ہونے کے بعد بھی لوگ انہیں بی کام ہی لکھتے رہے۔ کسی زمانہ میں اخبار ملت کے ایڈیٹر تھے۔ مانے ہوئے صحافی اور پاکستانی اخبارات میں اقتصادی ریویو لکھنے کے بانی تھے۔ صدر ایوب کے زمانہ میں بیس خاندانوں کا بہت تذکرہ رہا۔ یہ بیس خاندان وہ تھے۔ جن کی اقتصادی چیرہ دستیوں کا تذکرہ شبلی ایم کام نے کیا تھا۔ بہر حال شبلی صاحب کا سلسلہ سے زیادہ گہرا اور قریبی تعلق نہ رہا اس لئے وہ سلسلہ کے حلقوں میں معروف نہ ہوئے۔ جنید ہاشمی صاحب تعلیم الاسلام کالج کے آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ او رنہایت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ سلسلہ کے اخبارات و رسائل میں کبھی کبھار ادبی موضوعات پر لکھتے بھی تھے۔ جنید صاحب کی بیٹیوں میں سے قانتہ اور فائزہ اچھی صاحب ذوق لڑکیاں ہیں ایک انگریزی کی پروفیسر ہے ایک فلسفہ کی۔ ان دونوں میں سے کوئی ہمت کرے تو ''نغمہ اکمل'' کو ایڈٹ کر سکتی ہیں!۔

ربوہ کے تین شاعروں سے ہماری بہت دوستی رہی۔ عبد السلام اختر نسیم سیفی اور روشن دین تنویر۔ اب تینوں ہی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ زندہ شاعروں کے بارہ میں لکھنا تو مشکل ہوتا ہی ہے مگر مرے ہوؤں کے بارہ

میں لکھنا زیادہ ذمہ داری کا کام ہے کیونکہ وہ اپنے بارہ میں کی گئی غلط بیانیوں کا جواب نہیں دے سکتے یا غلط طور پر منسوب کی گئی بات کی تردید نہیں کرسکتے۔ عبدالسلام صاحب اختر نہایت نغز گو شاعر تھے۔ ناگپور یونیورسٹی سے فلسفہ کے ایم اے تھے۔ اور شاعر باپ، یعنی ماسٹر علی محمد صاحب بی اے بی ٹی کے بیٹے تھے۔ زندگی وقف کر کے سلسلہ کی خدمت میں مستعد رہے۔ وفات کے وقت ایڈیشنل ناظر بیت المال تھے۔ نائب ناظر تعلیم بھی رہے۔ گھٹیالیاں کالج کے پرنسپل بھی رہے مگر شاعری کسی حال میں بھی نہیں چھوڑی۔ کلام پر قدرت رکھتے تھے۔ اور بڑے جذب وشوق سے جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ ان کی ایک نظم ''مور'' بہت مشہور ہوئی جب جھوم جھوم کر سناتے تو لوگ ان کے شعروں سے زیادہ ان کے جھولنے کا لطف لیتے اور'' ونس مور۔ ونس مور'' کے نعرے لگاتے! اختر صاحب کی سادہ لوحی بہت مشہور تھی وہ کلام سنانے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ایک روز غریب خانہ پر تشریف لائے۔ ہمارا پوچھا۔ اباجی نے بتایا کہ'' کالج گیا ہوا ہے'' کالج تشریف لے گئے۔ ہم وہاں نہیں تھے واپس ہمارے گھر پہنچے تو اباجی نے بٹھا لیا اور کہا کہ اختر صاحب اپنا تازہ کلام مجھے سنایئے۔ میں شاعر تو نہیں شاعر کا باپ ہوں! اختر صاحب نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں تازہ کلام سنانے کے لئے آیا ہوں؟ اباجی نے کہا دیکھو میاں! شاعر شعر کہنے کے بعد اس بے تابی سے سامع کی تلاش میں گھومتا ہے جیسے مرغی انڈا دینے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے۔ آپ جس بے تابی سے ناصر کو ڈھونڈ رہے ہیں وہ آپ کی حالت کی غماض ہے۔ شعر ارشاد ہو۔ سارے ڈرامے کا کلائمکس یہ ہوا کہ اختر صاحب نے کلام سنانا شروع کر دیا۔ کیسے سادہ دل لوگ تھے۔

اختر صاحب کا کلام یکجا ہوسکتا ہے تو سلسلہ کے ادب میں اچھا اضافہ ہوتا۔ ان کے بیٹے نیدو اور ٹونی ہمارے شاگرد ہوئے (انکے اصل نام ہمیں یاد نہیں آ رہے) اچھے سعادت مند لڑکے ہیں وہ یہ پڑھیں تو ہماری بات پر کان دھریں۔ کہیں نائیلہ بیٹی سن پائے تو وہ اس کام پر کمربستہ ہو۔ ان کا باپ کوئی ایسا معمولی شاعر نہیں تھا کہ اس کا کلام یوں ہی رسالوں میں پڑا پڑا ضائع ہو جائے۔ مکرم میاں عبدالسمیع نون ایڈووکیٹ سرگودھا اختر صاحب کے بڑے مداح تھے۔ اور اختر صاحب اکثر ان کی نوازشات کا چرچا کرتے تھے۔ نون صاحب ہی توجہ کریں۔

آج اپنی ایک کمزوری بھی بیان کر دیں۔ اختر صاحب کی وفات کو لمبا عرصہ گزرا مگر ہم آج تک دوبارہ ان کے گھر افسوس کے لئے نہیں گئے۔ کئی دوستوں نے کہا بھی کہ آپ کا تو اختر صاحب سے بڑا یارانہ تھا۔ آپ ان کے بچوں کو ایسے بھول گئے؟ ہم نے سنی ان سنی کر دی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم دوستوں کو ہمیشہ زندہ سمجھتے ہیں ان کے مرنے کا افسوس کیوں کریں؟

اے ہم نفسان محفل ما

رفتید ولے نہ از دل ما

دوستوں کا وہی تصور آنکھوں میں موجود رہنا چاہیے۔ یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں۔ یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں!

دوسرے شاعر روشن دین تنویر الفضل کا ایڈیٹر بننے اور احمدی ہونے سے قبل وکالت کرتے تھے اور ادبی دنیا، نیرنگِ خیال جیسے ادبی رسائل میں چھپتے تھے۔ الفضل کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے تو اس ایڈیٹری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ تنویر صاحب شاعر تو اعلیٰ درجے کے تھے ہی نثر بھی بڑی مدلل اور خوب صورت لکھتے تھے۔ ہر روز کسی علمی موضوع پر اداریہ لکھنا خالہ جی کا گھر نہیں مگر تنویر صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کا ذہن بڑا صاف تھا۔ حقہ گڑگڑاتے جاتے اور اور اداریہ لکھتے جاتے تھے۔ شعروں کے باب میں بھی یہی بات صادق آتی تھی۔ مگر شعروں کی نوک پلک سنوارنے پر بڑی محنت کرتے تھے۔ اور سو باتوں کی ایک بات کہ اپنے کمزور شعروں کو ترک کر دینے میں انہیں کبھی عار محسوس نہ ہوئی۔ ہم نے کئی بار دیکھا کہ پندرہ پندرہ بیس بیس شعر کی نظم رات میں کہی مگر صبح اٹھ کر ان میں سے آدھے شعر قلم زد کر دیئے۔ ان کے بعض مسودات ہم نے دیکھے ہیں اور انکی جگر کاوی کی داد دی ہے!

تنویر صاحب کا اور ہمارا تعلق دوستی کا تھا۔ عمروں کا تفاوت کبھی اس دوستی میں حائل نہ ہوا۔ وہ بڑے بوڑھے اور ہم ان کے سامنے کل کے بچے! مگر آفرین ہے کہ تنویر صاحب نے ادبی مسائل کے بارہ میں ہماری رائے کو ہمیشہ ہی وقعت دی۔ ''الفضل'' میں کبھی کبھی ہمارا کلام چھاپ بھی دیتے تھے۔ اور اپنی مرضی سے کانٹ چھانٹ بھی کر دیتے تھے۔ ہم نے کبھی برا نہ مانا۔ اس طرح ان کا یہ عالم تھا کہ اتنی پختہ کاری کے باوجود کسی بات پر کھٹک جاتے تو ہماری رائے طلب کرتے اور مناسب سمجھتے تو مان بھی لیتے تھے۔ تنویر

صاحب عین عید قربان کے دن اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ نے کیا حسب حال شعر مرنے سے کئی برس پیشتر کہہ رکھا تھا۔

عید قرباں ہے مگر عید کا سامان کہاں!

جان قربان کروں؟ تن میں مگر، جان کہاں!

اب تیسرے نسیم سیفی صاحب! سیفی صاحب ہمارے ابا کے ہم عمر تھے ان کا بڑا بیٹا ظفر اقبال ہمارا ہم عمر ہے مگر سیفی صاحب کی اور ہماری ایسی بے تکلفی تھی جیسی ہم عمر دوستوں میں ہوتی ہے۔ قادیان کے زمانہ کی ہمسائیگی کے ناطے دوستی کا رشتہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا تھا پھر ربوہ میں یہ ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔ سیفی صاحب زود گو شاعر تھے چٹکیوں میں نظم کہہ لیتے تھے اور کثرت سے شعر کہتے تھے جب الفضل کے ایڈیٹر ہو گئے تو نثر میں بھی یہی کثرت نویسی آ گئی سارے کا سارا الفضل ان کے نثر پاروں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ تحریک کے پرچے تحریک جدید کے ایڈیٹر تھے تو وہاں بھی ان کا یہی طریق تھا۔ ہم نے کئی بار انہیں لکھا کہ یار دوسروں کی چیزیں بھی الفضل میں چھپنے دیا کریں مگر ان کا جواب تھا کہ جتنی محنت دوسروں کی چیزیں ایڈٹ کرنے میں لگتی ہے اس سے آدھی محنت میں سارا پرچہ لکھا جا سکتا ہے چنانچہ یہی ہوتا تھا۔ کچھ وقت ایسا نازک تھا کہ پابندیاں بہت تھیں ذرا اونچ نیچ ہوتی تو پرچے کے خلاف پرچہ کٹ جاتا تھا۔ ان حالات میں ایڈیٹر کا بتیس دانتوں میں زبان کی طرح رہنے کا محاورہ تو بالکل معمولی لگتا تھا ہر طرف سے دشمن تیر و تفنگ لے کر پل پڑے تھے اس لئے ان کے پاس یہی ایک چارہ رہ گیا تھا کہ احتیاط کا دامن پکڑ کر خود ہی سارا کچھ لکھ ڈالیں اور پھر اخبار بھی روز نامہ ہے۔ روز کا اداریہ، مختلف مضامین پر شذرات، تبصرے، قطعات، نظمیں!! سارا پرچہ ان کا اپنا لکھا ہوتا تھا اس پر باتیں بہت بنتی تھیں مگر انہیں پروا نہیں تھی۔ (اب نئے ایڈیٹر مولانا عبدالسمیع خاں صاحب نے تو اداریہ لکھنے سے ویسے ہی توبہ کر لی ہے)۔ یہی حال ان کی شاعری کا تھا نظمیں تو تھیں ہی، سیفی صاحب نے قطعات بھی شروع کر دئے۔ قطعے کیا چو مصرعے ہوتے تھے اور جب قید ہوئے تو روز الفضل کا ایک صفحہ ان کے قطعات سے بھرا ہوتا تھا۔ ہم نے ایک بار مذاق میں انہیں لکھا کہ حکومت نے یہ دریافت کرنے کے لئے آپ کو گرفتار کیا ہے کہ یہ شخص بھلا ایک دن میں اتنی شاعری کیسے کر سکتا ہے؟

ان کی شاعری کے بہت سے مجموعے چھپے ہوئے ہیں۔ایک تو قادیان میں منے سے سائز پر چھپا تھا وہ بھی شاید قطعات ہی تھے۔ہمیں یاد ہے سیفی صاحب ہمارے گھر آئے تھے اور اپنی استانی یعنی ہماری پھوپھی جی کو اپنا مجموعہ کلام پیش کیا تھا پھوپھی جی نے وہ ہمیں دکھایا تھا کہ دیکھو نسیم سیفی صاحب کی شاعری کی کتاب چھپی ہے تم بھی شاعری کیا کرنا۔الحمد للہ کہ ہم نے شاعری تو جیسی کی سو کی مجموعہ ابھی تک نہیں چھاپا! سیفی صاحب بنیادی طور پر مبلغ تھے اس لئے ان کی شاعری میں بھی تبلیغ ہوتی تھی مشاعروں میں بھی الفضل کے مزاج کی چیزیں پڑھتے تھے تو لوگ باگ احتراماً انہیں سنتے تھے کچھ ان کی بزرگی کا احترام آڑے آتا تھا مگر خود مشاعروں کے بہت خلاف تھے بلکہ الفضل میں مشاعروں کے خلاف ایک آدھ بار لکھ بھی دیا۔ہم ان کی دوستی کے قائل ہیں دوستوں کے دوست تھے۔نظمیں سنتے سناتے بھی تھے دوستوں کی تنقید سن بھی لیتے تھے مگر اپنے موقف سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ان کی طبیعت میں استواری تھی۔اللہ مغفرت فرمائے اب تو جنت میں آرام کر رہے ہیں۔

جب یہ مضمون پہلے پہل الفضل میں شائع ہوا تھا اس وقت زندہ تھے حیف کہ کتاب کے چھپتے وقت وہ اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔

وفیات

جانے والے کا جانا

جو بھی آیا ہے وہ ہے جانے والا۔ جانے والے چلے جاتے ہیں ان کی یاد رہ جاتی ہے ان کے کام رہ جاتے ہیں۔ ابھی کل جو وجود گیا ہے اس کو یاد کرنے بیٹھا ہوں تو اس کے آنے کا وقت یاد آ رہا ہے۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ' جون کا مہینہ' ایک کے جانے کا غم دوسرے کے آنے کا انتظار۔ ساری خلقت بے حال تھی کچھ گرمی کے مارے کچھ اس خوف کے مارے جس کا ذکر وَلَیُبَدِّلَنَّہُم مِن بَعدِ خَوفِہِم اَمنا میں ہے۔ بارے یہ مرحلہ طے ہؤا وہ آیا تو گویا خوف سے سہمی ہوئی خلقت کے چہروں کی رونق لوٹ آئی ۔یوں محسوس ہؤا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹھنڈک اور سکینت کا چھینٹا دیتا ہؤا گذر گیا ہے۔ ۱۹۶۵ میں سکینت اترتی ہوئی پہلے بھی دیکھی تھی مگر ۱۹۸۲ کا عالم اور تھا۔ آنے والا آیا' سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ بیعت کا عہد تو سب نے اسی وقت باندھ لیا مگر ہم نے اگلے روز اس آنے والے سے ملاقات کی۔ یوں محسوس ہؤا ہمارا ادبی مجلسوں بیٹھکوں میں بیٹھنے والا ساتھی روحانیت کی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔ دیکھنے میں وہی چہرہ تھا مگر اب اس کے طور اور تھے ایک عجیب نور اس پر برس رہا تھا ۔اس کی باتوں میں موہنی تھی مگر اب اور میٹھی ہو گئی تھیں۔ وہ تصویر دیکھتا ہوں تو اس میں اس کا ہاتھ ہماری کمر میں حمائل ہے اور ہم نے اس کے کندھے پر ادب سے ہاتھ رکھا ہؤا ہے۔ بس ایک تسلی سی ہو گئی کہ یہ ہاتھ ہمارے ساتھ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ ہاتھ جماعت کے سر پر ہے تو جماعت کو کسی کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اور وہ کڑی آزمائش جلد ہی آ گئی۔ مارشل لا اور وہ بھی اس مکروہ شخص کا مارشل لا جس نے اسلام کے مقدس نام کو استعمال کر کے اپنے اقتدار کو طول دیا اور وطن کو اندھیروں میں دھکیل کر اپنے انجام کو پہنچا۔ مارشل کا ضابطہ جمعرات کی شام کو نافذ ہؤا ان کا خیال تھا کہ اگلے روز جمعہ ہے دیکھیں جماعت کا کیا ردعمل ہوتا ہے ؟ ہم نے بھی حیرت اور خوف سے مولوی محمد بشیر شاد صاحب کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مسجد میں آنا بھی یاد ہے ہاتھ اٹھا کر جماعت کو سلام کرنا بھی یاد ہے مگر اس کے منہ سے خلاف قانونِ ملکی ایک لفظ تک نہیں نکلا کہ یہی اس جماعت کی روایت رہی ہے کہ ملک کے قانون کا پورا احترام کرو۔ اب سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ وہ امام جو اپنی جماعت کو محض

خاموش سلام کرسکتا ہے السلام عا[illegible]ن کی گرفت میں آتا ہے' جماعت کی دینی رہنمائی کرے تو گردن زدنی قرار پاتا ہے(یوہ) [illegible] وہ دن بھی کل کی طرح یاد ہے کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے لاہور فون کر کے ہم[illegible]ی ہوائی سیٹ بک کروا کر اسے مطلع کریں مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو[illegible]رواز کر گیا۔ وہ ہراول کا آدمی تھا جسے امام وقت کے باہر جانے کا ا[illegible]ب جھ ہوا۔ قانون کے اندر رہتے ہوئے ہوا' قانون کی کوئی خلاف ورزی نہ ہو[illegible]ت کا قافلہ موٹروں سے کراچی روانہ ہوا' دو یا تین کاریں تھیں۔ ڈرائیور کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر وہ دلیر اور جری امام بیٹھا تھا جسے ملک چھوڑنا تھا۔ رستہ میں اپنے پسندیدہ روڈ سائیڈ ہوٹل پر رک کر اس نے چائے بھی پی۔ اتر کر اپنے جاننے پہچاننے والے ہوٹل والے سے علیک سلیک بھی کی۔ کراچی پہنچا۔ یورپ کی پرواز کا وقت ہوا تو وی آئی پی لاؤنج سے ہو کر جہاز تک گیا یہ نہیں کہ کسی خفیہ راستہ سے جہاز تک گیا ہو۔ قانون کی ذرا سی خلاف ورزی اس نے نہ کی کہ یہی اس کا شیوہ تھا اور یہی اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کے خلاف کوئی مقدمہ درج ہوا ہے تو وہ ہرگز ملک سے نہیں جائے گا۔ کے ایل ایم کا ہوائی جہاز اڑا تو الوداع کہنے والوں کی جان میں جان آئی۔ وہ بفضلہ تعالیٰ بخیریت پہلے ایمسٹرڈم اور پھر لندن پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں رت جگے کی وجہ سے سرخی تھی مگر اس کے چہرے پر بے آرامی کا کوئی اثر نہیں تھا اس کے دورِ خلافت کا سب سے کٹھن دور شروع ہو چکا تھا اور یہ اس کے کام کرنے کا وقت تھا آرام اس دن کے بعد اس نے نہیں کیا۔ دن کام' رات کام' اس ملک کا سفر اس ملک کا سفر' یہ خطبہ' وہ تقریر' یہ جلسہ وہ جلسہ' غرض اس کی لغت سے آرام کا لفظ یوں خارج ہو گیا گویا ایسا کوئی لفظ موجود ہی نہیں۔ وہ بیمار ہوا تو بھی اپنے فرائض کے مطابق سب نمازیں مسجد میں جا کر پڑھاتا رہا۔ ٹھیک ہوا تو' علیل ہوا تو' اس کے کام کے اوقات تبدیل نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ اس کے چاہنے والوں نے بھی محسوس کیا اور اس سے دبے لفظوں میں درخواستیں بھی کیں کہ وہ اپنے وجود کا اپنے آرام کا خیال بھی رکھے مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ ہمارے پیارے عزیز شاگرد عزیزی سید قمر سلیمان احمد نے بڑی خوب صورت نظم میں اس سے خطاب کیا کہ تو جو سب کا خیال رکھتا ہے دوسروں کے دکھ درد بٹاتا ہے کچھ اپنا خیال بھی کر' مگر اس نے اپنے پیاروں کی آواز پر کان دھرا تو صرف اتنا کہ خطبہ دینے کے لئے کرسی پر بیٹھنے کی بات مان لی۔ اس سے

زیادہ آرام اس نے قبول نہیں کیا۔ اپنی زندگی کے آخری روز سے ایک دن پہلے اس نے جمعہ کا خطبہ دیا۔ مغرب عشا کے مابین سوال و جواب کی مجلس عرفان برپا کی۔ وصال سے چند گھنٹے قبل فجر کی نماز پڑھی۔ قرآن حکیم کی تلاوت کی پھر ذرا سی دیر کو سویا' اور ایسا سویا کہ پھر نہ اٹھا تھکے سب اس کو جگا جگا کر یعنی جب آرام کا وقت آیا تو لمبی تان لی۔

اس شخص کے عہد میں ہم نے اور معجزوں کے علاوہ ایک ایسا معجزہ بھی دیکھا ہے جو نئی نسل نے بھی دیکھا مگر وہ اس کے پس منظر سے آشنا نہیں۔ ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں تیسرے امام نے ایک بار بڑی حسرت سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ دور میڈیا کا دور ہے اے کاش جماعت کو کہیں کسی جگہ کسی ملک میں اپنا ریڈیو سٹیشن قائم کرنے کا موقع مل جائے تو کیا خوب ہو۔ پھر اسی امام نے ایک بار بڑی خوشی سے یہ بتایا کہ افریقہ کے ایک چھوٹے سے ملک میں جماعت کو اپنا ریڈیو قائم کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ جماعت خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ حالانکہ ایک چھوٹے سے ملک کا ایک چھوٹا سا ریڈیو' اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا'' کے مصداق' کیا کر سکتا تھا؟ مگر چوتھے امام کی ہجرت نے جماعت کو نہ صرف یکجان اور متحد کر دیا بلکہ ایسا معجزہ بھی دکھا دیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ریڈیو تو ریڈیو اس دور میں جماعت نے اپنا ٹی وی قائم کر لیا اور یہ وہ کام ہے جو حکومتیں نہیں کر سکتیں کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ سود و زیاں کا حساب رکھنے والے کہنے لگے جماعت اس زیاں میں کیوں الجھنے لگی ہے؟ اس نے کہا '' زیاں ہے عشق میں یہ ہم بھی جانتے ہیں مگر۔ معاملہ ہی کیا ہوا گر زیاں کے لئے''۔ اور ہمارے لئے یہ گھاٹے کا سودا منافع کا سودا بن گیا اور وہ آواز جو ایک چھوٹی سی مسجد فضل لندن میں محدود و محصور ہوتی تھی سارے عالم میں گونجنے لگی۔ چار سو معجزۂ حسنِ بیاں گونجتا ہے۔ ایک آواز سے اب سارا جہاں گونجتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمیں ربوہ میں لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی اور دوسرے برملا لاؤڈ سپیکر پر دہاڑتے چنگھاڑتے اور اپنے ہی غیظ و غضب کے بھاڑ میں جلتے بھنتے رہتے تھے۔ ہم لاؤڈ سپیکر کا نام بھی لیتے تھے تو مجرم قرار پاتے تھے وہی عالم تھا کہ '' ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا''۔ عدو سمجھتا تھا ہم نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہے اب '' کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ؟''۔ ربوہ والوں کی آوازیں لاؤڈ سپیکر میسر نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے اندر بھی پہنچانا ممکن نہ ہوتا تھا اب پانچوں بر

اعظموں میں سنی جا رہی ہیں۔ اور عدو اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہے کہ ہمیں ان آوازوں سے بچاؤ وہ سننا نہیں چاہتے تھے اب دیکھ رہے ہیں کہ انہیں دیکھنا بھی پڑتا ہے۔ خود چاہتے ہیں کہ گونگے بہرے اور اندھے بن جائیں کہ ہماری آواز ان کے کانوں تک اور چہرے ان کی آنکھوں تک رسائی نہ حاصل کریں۔ ایک بار نام نہاد عالم نے حکومت کے سامنے دہائی دی تھی کہ اس ٹی وی کا داخلہ ہمارے گھروں میں بند کرو۔ لوگوں نے اس کی کم عقلی پر ٹھٹھے لگائے کہ بھلا سیٹلائٹ سے آنے والی آوازوں تصویروں کو روکا جا سکتا ہے؟ وہ کہتے ہیں سیٹلائٹ کی تصویریں۔ ہم کہتے ہیں نہیں یہ سیٹلائٹ سے نہیں آسمان سے آتی ہوئی آواز ہے اسے سنو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ اسمعُو صَوتَ السماء۔ اسمعُو صَوتَ السماء۔

میں نے اوپر اس جانے والے کے ذوقِ شعر کا ذکر کیا۔ وہ برملا اور برجستہ غالب کے شعروں کا حوالہ دیا کرتے تھے اور ہمیں حیرت ہوا کرتی تھی کہ ان کا غالب کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ ان کی بیگم صاحبہ کی وفات ہوئی تو میں نے ایک نظم لکھ کر ان کی خدمت میں روانہ کی جس میں حضرت بیگم صاحبہ کی غریب الوطنی کی حالت میں وفات کا نوحہ تھا۔ ان کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا جواب آیا

"رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں۔ نالہء مرغِ سحر تیغ دودم ہے ہم کو"۔

یہ غالب کا شعر ہے اور اس کے مشکل ترین شعروں میں شمار ہوتا ہے۔ اتنی برجستگی کے ساتھ غالب کے اس شعر کا حوالہ دے دینا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ ہر مردے و ہر کارے۔ اس شعر کی معنویت سمجھنا تو کجا اس کو صحیح پڑھنے کے لئے بھی عمر بھر کی ریاضت کی ضرورت ہے۔ ان لفظوں کو پڑھنے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ یہ شعر واقعی مشکل شعر ہے اور سمجھنے کے لئے کسی سمجھانے والے کا محتاج ہے' اس شعر کا مطلب یہ بنتا ہے کہ مرغِ سحر یعنی بلبل کی فریاد پر مجھے رشک آتا ہے کہ اے کاش کہ میں اس کی طرح اپنے غم کا اظہار کر سکتا اور اس کی آواز میں جو درد انگیزی ہے وہ میری آواز میں بھی پیدا ہو سکتی۔ ان دو وجوہ کی وجہ سے اس کا نالہ دو دھاری تلوار کی طرح دل کو چیرے دیتا ہے۔ یہ کسے معلوم تھا کہ خود اس کا وقت بھی غریب الوطنی میں آ جائے گا۔ مگر یہ بات ہم نے غلط لکھی اس کا وطن تو اب سارا جہان تھا جہاں جہاں اس کی آواز گونجتی تھی وہاں وہاں اس کا وطن تھا۔ ہم نے کل اسے اسلام آباد کی جس مٹی کو سونپا ہے وہ مقام بھی

تو اسی کا آباد کیا ہؤا ہے اب جانے والے نے وہیں کی مٹی اوڑھ لی ہے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی۔ ''سلا دیا جسے مٹی میں ہم نے پچھلے پہر۔ وہ ایک شخص نہیں تھا وہ اک زمانہ تھا'' اس کا آنا ایک عہد کا آنا تھا اور اس کا جانا ایک عہد کا جانا ہے۔ وہ عہد جس میں جماعت لاکھوں سے کروڑوں تک پہنچی حدوں سے نکل کر بے حد ہوئی۔ جس کی آواز چار دانگِ عالم میں گونجی اور پانچوں براعظم اس کے حلقہ بگوش ہوئے بھلا وہ کوئی ایک شخص یا وجود ہو سکتا ہے؟۔

جانے والا بڑا تیز رو تھا' اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنا مشکل ہوتا تھا۔ ہم نے قادیان اور ربوہ میں خدام کے اجتماعوں میں اسے دیکھا اس کی پھرتی اور اس کی چستی پر بڑے بڑے زور آور رشک کرتے تھے۔ پھر ربوہ میں ہمیں ایک بار سائیکل پر ان کے ساتھ جانے کا موقعہ ملا ہمارے بھائی جان محمد احمد نعیم واقف زندگی مربیء سلسلہ مرحوم مرض الموت میں مبتلا تھے حالت لحہ بہ لحہ دگرگوں ہو رہی تھی انہوں نے لکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مرزا طاہر احمد صاحب کو بلائیں وہ ان کو دیکھیں اور ہومیو پیتھک کی کوئی دوا دیں تو شاید وہ بچ جائیں۔ میں وقفِ جدید کے دفتر میں گیا۔ جب میں نے بھائی جان کی خواہش کا اظہار کیا تو فوراً جانے پر مستعد ہو گئے اپنی سائیکل پکڑی اور یہ جا وہ جا۔ ہم ہانپتے کانپتے اپنی سائیکل پر ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ بڑی مشکلوں سے انہیں جا لیا اور کہا '' تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا۔ ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے''۔ فرمانے لگے آپ نے سکول کے زمانہ کا پسندیدہ شعر یاد دلا دیا۔ پھر ہمارے ساتھ آہستہ آہستہ سائیکل چلانے لگے۔ گھر پہنچے۔ بھائی جان نے حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ پائے کیونکہ فالج کا اثر تھا اور زبان نہیں اٹھتی تھی۔ بس وہ ان کا آخری وقت تھا۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ واپس ہوئے ہمیں کہنے لگے بس آپ بھائی جان کے پاس ٹھہریں ان کا وقت شاید آ چکا ہے میں چلا جاؤں گا۔ ہم نے کہا جناب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آپ کو یوں راہ میں چھوڑ دیں۔ میں انہیں دفتر پہنچا کر واپس ہؤا تو بھائی جان اس جہان سے رخصت ہو چکے تھے لیکن انہیں یہ تو تسلی رہی ہوگی کہ ایک پاک وجود نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں الوداع کہا ہے۔ اس پاک وجود کا ہاتھ ہر مرحلہ پر لوگوں کو سکینت دیتا تھا۔ پھر تو اللہ تعالیٰ نے اس مہربان وجود کو ساری جماعت کے لئے سکینت کا منبع بنا دیا۔

خدام الاحمدیہ میں تھے تو ایک بار ایک مجلس والوں سے کہا کہ آپ کے ہاں فجر کی نماز میں حاضری کم ہوتی ہے اس کی فکر کریں۔ اس کے بعد خدام نے دیکھا کہ کئی دنوں تک وہ فجر کی نماز اس مجلس کے حلقہ کی مسجد میں پڑھتے رہے۔ کہاں دار الصدر میں ان کا مکان اور کہاں وہ دور افتادہ مسجد۔ سائیکل پکڑتے اور تہجد کے وقت وہاں پہنچ جاتے۔ تربیت کا یہ طریق ایسا کامیاب ہوا کہ ان کے زمانہ میں ربوہ میں خدام تہجد گذاروں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ان کا دستور یہی تھا کہ نصیحت زبانی نہیں کرتے تھے عملاً اس کا ثبوت دیتے تھے۔

جلسہ سالانہ کے موقع پر نائب افسر جلسہ سالانہ مہمان نوازی تھے' دن ہو یا رات' ہر وقت اپنی ڈیوٹی پر موجود جلسہ کی سب سے مشکل ڈیوٹی مہمان نوازی کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ ذرا تاخیر ہوئی تو سارا کام تلپٹ ہو گیا۔ کئی بار یوں ہوا کہ رات کو دو ڈھائی بجے ان سے ہدایت لینے کی ضرورت محسوس ہوئی فون کیا تو اپنے دفتر میں مستعد اور موجود پایا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ ہم نے کارکن کو ایک رقعہ دے کر بھیجا وہ واپس آ گیا کہ نائب افسر جلسہ دفتر میں نہیں۔ ہم نے اسے کہا کہ دو چار منٹ انتظار کر لیتے وہیں کہیں کسی جگہ معائنہ کے لئے گئے ہوں گے۔ اتنے میں دیکھا کہ دسمبر کی سردی میں سائیکل پر سوار آ پہنچے کہ کیا ہوا مجھے کارکنوں نے بتایا کہ آپ کا معاون آیا تھا۔ قضیہء زمین بر سرِ زمین طے ہوا۔ لنگر خانہ جانے کی ضرورت تھی کہنے لگے آپ بھی ساتھ چلیں۔ وہ موقع تھا جب پہلی بار ہماری گاڑی میں تشریف فرما ہوئے لنگر کے بعد ہم نے گاڑی ان کے حوالہ کی کہ اب آپ اس میں دفتر افسر جلسہ میں تشریف لے جائیں ہم آپ کی سائیکل پر آ کر وہاں سے لے لیں گے۔ تو ہماری اس ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ آپ نے اس گاڑی کو چلایا بھی ہے۔ وہ گاڑی جب تک چلتی رہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر سال جلسہ سالانہ کی ڈیوٹی میں استعمال ہوتی رہی۔ جلسہ کے دنوں میں ان کی چستی اور مستعدی کو پر لگ جاتے تھے۔ سوائے ''کڑک '' چائے کے اور کوئی چیز ان کو پسند نہیں تھی اور جلسہ کے دنوں میں شاید چائے پر ہی گذارا کرتے تھے کھانے کا یہ عالم بھی دیکھا کہ کسی لنگر میں تنور پر بیٹھے ہیں گرم گرم اترتی ہوئی روٹی بغیر سالن یا دال کے کھا رہے ہیں۔ سالن آتے آتے ان کی بھوک کا تقاضہ پورا ہو جاتا تھا۔

پھر ربوہ کے رہنے والے اکثر لوگوں نے دیکھا کہ عصر کے بعد وہ سائیکل پر احمد نگر کو جا رہے ہیں آگے اپنی

کسی بچی کو بٹھایا ہوا ہے ہینڈل پر یا سائیکل کے کیریئر پر دودھ والا ڈبہ رکھا ہوا ہے اور ہوا کی طرح اڑے جا رہے ہیں۔ مغرب سے پہلے واپس ہوں گے اور مسجد مبارک میں نماز میں شریک ہوں گے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا ورزش کی ورزش اور سیر کی سیر بچوں کی دل دہی الگ۔ بالکل ایک عام آدمی کی زندگی مگر دست با کار دل بایار۔ حتیٰ کہ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو اگلے روز سائیکل پکڑ کر ہسپتال کی طرف چل پڑے حفاظت کا عملہ دم بخود دیکھتا رہ گیا۔ وہ تو خدام الاحمدیہ کے صدر ہمارے محمود احمد بنگالی صاحب نے کہا حضور اب حضور کی حفاظت کے انتظام کا فرض جماعت کے کندھوں پر ہے اس لئے حضور اپنے خدام کو آزمائش میں نہ ڈالیں اور اس انتظام والوں سے تعاون فرمائیں۔ تب کہیں جا کر انہوں نے سائیکل کا پیچھا چھوڑا۔

طبیعت میں مزاح تھا پاکیزہ مزاح سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہم ۱۹۹۰ میں لندن میں حاضر ہوئے انہی دنوں ائین آدم سن کی کتاب آئی تھی۔ از راہ شفقت میز سے ایک نسخہ اٹھا کر دستخط فرمائے اور ہمیں دے دیا۔ ہم نے ایک ہفتہ کے قیام میں اس کا اردو ترجمہ کر لیا۔ سویڈن جانے کے لئے روانہ ہونے لگے تو ترجمہ کا مسودہ ہمارے ہاتھ میں تھا فرمانے لگے ''یہ کیا ہے؟'' عرض کی حضور اس ''بندے دے پتر'' کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ حیرت سے فرمایا ''بندے دا پتر'' کون؟''۔ میں نے کہا'' حضور میں نے ''آدم سن'' نام کا ترجمہ بھی کر دیا ہے''۔ بہت خندہ فرمایا۔ بعد میں ایک دو دوستوں کو خود بھی یہ لطیفہ سنایا۔ اور ان کی اردو کلاس کے لطیفے کسے یاد نہیں؟ ان کی طبیعت کی شگفتگی ماحول کو شگفتہ رکھتی تھی (سوائے مولویوں کے سب لطف اندوز ہوتے تھے) یہ ورثہ انہوں نے اپنے موعود باپ سے پایا تھا۔ اب ورثہ کی بات آ گئی تو ''آنے والا'' یاد آیا۔ وہ اپنے پیش رو کو مٹی دے کر واپس آ رہے تھے تو ہم نے ٹی وی پر انہیں دیکھا۔ کیمرہ کسی اونچی جگہ پر تھا اس لئے ہمیں صرف حضور کی پگڑی اور جسم کی حرکت نظر آ رہی تھی۔ ایک لحظہ کے لئے یوں لگا جیسے حضرت مرزا شریف احمد جا رہے ہیں۔ ان کی چال ڈھال ایسی ہی تھی مجال ہے دائیں بائیں دیکھ لیں۔ تواضع کا یہ انداز حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی تھا۔ حضرت مرزا شریف احمد صاحب کو ہم قادیان کے زمانہ سے دیکھتے رہے۔ اب ان کا پوتا اطال اللہ بقاءہٗ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت مرزا شریف احمد لنگی باندھتے تھے حضور نے پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ انہیں بھی آنکھ اٹھا کر ادھر

ادھر دیکھنا نہیں آتا تھا نظریں زمین پر ٹکی رہتی تھیں ۔ہم اپنی علالت کے باعث لندن میں حاضر نہ ہو سکے مگر یہ اسی جانے والے کا فیضان ہے کہ ہم گھر بیٹھے ان تمام نظاروں میں شریک رہے کون کہتا ہے وہ رخصت ہو گئے؟

ثبت است بر جریدہء عالم دوامِ ما۔

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

پاکستان کی تاریخ میں جن گنے چنے نامور اشخاص نے اپنے اپنے میدان میں نیک نامی اور قومی غیرت اور بے لوث خدمات کا ورثہ پیچھے چھوڑا ان میں سے تین کا تعلق جماعت احمدیہ سے تھا۔ تینوں اپنے اپنے میدان کے مرد تھے، سیاست اور تدبر میں سر ظفر اللہ خاں، سائنس میں ڈاکٹر عبد السلام اور اقتصادیات میں ایم ایم احمد! پہلے دو، پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے کل ایم ایم احمد کی سناؤنی بھی آ گئی! کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام!

ایم ایم احمد کا پورا نام مرزا مظفر احمد ہے۔ آپ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے پوتے تھے۔ تقسیم ہند سے قبل آئی سی ایس میں شامل ہوئے۔ تقسیم ملک کے وقت سیالکوٹ کے ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے مرکزی حکومت میں سکرٹری فنانس، پھر ڈپٹی چیئر مین پلاننگ کمشن۔ پھر چیئر مین پلاننگ کمیشن، پھر مشیر خزانہ اور پھر وزیر خزانہ کے مؤقر عہدوں پر فائز رہے اور ہر رنگ میں قومی خدمات سرانجام دیں۔ استاذی المحترم کنور ادریس نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ ''ایم ایم احمد اقتصادیات کے آدمی نہیں تھے مگر ان کے تجربہ نے انہیں اس میدان میں وہ کمال عطا کر دیا تھا کہ اقتصادیات کے معاملہ میں ان کی رائے پتھر کی لکیر سمجھی جاتی تھی۔'' سرکاری ملازمت سے بڑے وقار سے سبک دوش ہوئے تو عالمی بنک میں اونچے عہدے پر سرفراز کئے گئے۔ امریکہ کی جماعت احمدیہ کی امارت کے فرائض ساتھ ساتھ انجام دیتے رہے۔ شہرت اور نام ونمود کی خواہش کبھی نہ کی۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا! ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کسی رو رعایت کے روادار نہ تھے اسی لئے بعض حلقوں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھے گئے مگر سب لوگ، کیا ان کے ماتحت کیا ان کے افسر، ان کی محنت، ان کی لگن، بردباری اور اصول پرستی کے معترف رہے۔ یہی اوصاف ہماری نوکر شاہی میں مفقود ہیں اور ایم ایم احمد انہی اوصاف سے متصف تھے

قدرت اللہ شہاب جیسے متعصب سرکاری افسر نے اعتراف کیا ہے کہ جہاں کوئی ڈکٹیٹروں کے سامنے کھڑا ہو کر ایک لفظ نہیں کہہ سکتا تھا وہاں یہ کھڑے ہو سکتے تھے اور اپنے دل کی بات کہہ سکتے تھے اور اپنے دل کی بات وہی صاف طور سے کہہ سکتا ہے جس کا ضمیر صاف اور مطمئن ہو۔ ایم ایم احمد قلبِ مطمئنہ کی دولت سے مالا مال تھے۔ نام و نمود سے دور بھاگنے کی ایک مثال تو ہم نے خود دیکھی۔ پنجاب کے ایک آئی جی پولیس ہمارے اچھی جان پہچان کے تھے۔ جب عزیزی صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب امیر مقامی (اب سیدی حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز) کو پنجاب پولیس نے گرفتار کیا تو ہم نے سویڈن سے ان آئی جی پولیس کو فیکس دیا کہ ''میاں شاباش جو کام ضیاء الحق نہ کر سکا وہ تمہاری پولیس نے کر دکھایا''۔ ان کا معذرت خواہانہ فیکس آیا اس میں لکھا تھا کہ ان کی گرفتاری میں پولیس کا کوئی قصور نہیں کوئی اور عوامل تھے جن کی وجہ سے ایسا ہوا۔ پنجاب پولیس کی مستعدی تو دیکھو کہ ایم ایم احمد ''مرحوم'' کے بھتیجے کے اغوا کرنے والوں کو اس نے کس طرح جہنم واصل کیا تھا۔ میں نے آئی جی پولیس کو پھر فیکس دی کہ آپ نے ایم ایم احمد کو مرحوم لکھ دیا حالانکہ وہ اللہ کے فضل سے زندہ موجود ہیں اور امریکہ کی جماعت احمدیہ کے امیر ہیں اس لئے ایم ایم احمد کے باب میں آپ کی ''پولیس رپورٹ'' غلط ہے۔ آئی جی صاحب کا انتہائی ندامت کا خط آیا کہ مدتوں سے انہوں نے ایم ایم احمد کا نام ہی خبروں میں نہیں سنا تھا اس لئے غلط فہمی ہوگئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایم ایم احمد اتنی خاموشی سے کام کرتے تھے کہ بڑے بڑے لوگوں کو ان کے بارہ میں معلوم نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ خاموشی ان کے ساتھ خاص تھی ورنہ ہماری نوکر شاہی کا طرہ یہ تھا کہ کام کم کرتے تھے اپنی پبلسٹی زیادہ کرتے تھے۔

سرکاری افسروں والی اکڑفوں بھی ان میں نہیں تھی کہ ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ تک بھی جائیں تو اردلی اردل میں بھاگتا ہوا اور آگے آگے ہٹو بچو، باادب باملاحظہ، کہتا کرتا ہوا چلے۔ سیدھے سبھاؤ اپنی حفاظت کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز رہتے تھے اسی لئے تو اس بدبخت اسلم قریشی کو ان پر قاتلانہ حملہ کا موقع مل گیا تھا اس وقت بھی وہ لفٹ میں اکیلے تھے وہ انہیں اکیلا دیکھ کر ان کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گیا۔ کوئی اور سرکاری افسر ہوتا تو جھڑک کر اسے لفٹ سے اتار دیتا کہ '' یہ لفٹ سینئر سرکاری افسروں کے لئے مختص

ہے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' مگر ایم ایم احمد کی دینی تربیت آگے آگئی کہ سب انسان برابر ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ اس لئے انہوں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ لفٹ میں اس بدبخت نے عقب سے ان پر چاقو سے قاتلانہ حملہ کیا۔ اس مردِ مومن کے حواس قائم رہے حملہ آور کا ہاتھ یوں پکڑا کہ اسے دوسرا وار کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ لفٹ نیچے پہنچی تو خون میں لت پت تھے مگر ہوش وحواس بجا تھے حملہ آور کو دوسروں نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا اور اس طرح اس بدبخت کا وار مہلک ثابت نہ ہوا۔ گردے بہت بری طرح مجروح ہو گئے تھے مگر اللہ نے فضل کیا آپ صحت مند ہو کر پھر اپنے فرائضِ منصبی میں مشغول ہو گئے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

ہم نے پہلی بار ایم ایم احمد کو جانا تو اس وقت وہ پنجاب کے ایڈیشنل چیف سکرٹری تھے۔ ہم ان کے والد گرامی حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے ساتھ خدمت کر رہے تھے۔ ایم ایم احمد کو لاہور سے اپنے ابا سے دفتر میں ملاقات کے لئے آنا تھا، ہمیں ارشاد تھا کہ مظفر آئیں تو انہیں انتظار نہ کروایا جائے فوراً اندر بھیج دیا جائے کیونکہ ان کا وقت بہت قیمتی ہے۔ میاں مظفر احمد اتفاق سے ایک آدھ منٹ دیر سے پہنچے۔ ہم پہلے ہی ان کے منتظر تھے پوچھنے لگے ابا کو انتظار تو نہیں کھینچنا پڑا ناراض تو نہیں؟ ہم نے جواب دیا ناراض تو نہیں البتہ بیقرار ضرور ہیں۔ ایم ایم احمد نے ہماری اس ''زبان درازی'' پر ہمیں غور سے دیکھا۔ ہم نے فوراً انہیں اندر دفتر میں پہنچا دیا۔ السلام علیکم کی آواز گونجی، ہم دروازہ بند کر کے باہر آگئے۔ غالباً دفتر میں ایم ایم احمد کی اپنے ابا سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد ہمیں یاد نہیں کہ وہ دفتر میں آ کر ملے ہوں۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی یہ بیقراری سب کے لئے تھی کسی کو ربوہ کے باہر سے آنا ہوتا تو بے چین رہتے جب تک آنے والا پہنچ نہ جاتا، انہیں کسی کل چین نہ پڑتا۔ ربوہ والوں میں سے کسی کا انتظار ہوتا تو کان دروازہ پر لگے رہتے تھے۔

اپنے والد گرامی کے نام دعا کی درخواست کے خط ان کی طرف سے باقاعدگی سے آتے تھے اور جواب بھی باقاعدگی سے جاتا تھا۔ خط کے القاب بھی سیدھے سادے ہوتے تھے ''عزیزم مکرم مرزا مظفر احمد سلمہ'' اور کبھی کبھی ان کی بیگم صاحبہ کے نام بھی ساتھ ہی میں لکھا جاتا ''عزیزہ مکرمہ صاحبزادی امتہ القیوم سلمہا''۔ ہمیں عجیب لگتا تھا کہ بیٹے کے ساتھ صاحبزادہ نہیں لکھتے تھے۔ زبان و بیان کی یہ باریکی

ہمیں انہیں نے بتائی کہ اپنی اولاد کے لئے خود ' صاحبزادہ' کا سابقہ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ ایم ایم احمد کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی یہ اس کا اثر تھا کہ انہیں دعا پر پورا یقین تھا۔ اس وجہ سے ان کے ہاں اللہ تعالیٰ پر اعتماد بھی بہت تھا۔ ہمارے ہاں کے افسروں کا وطیرہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے کئے پر بھروسہ رکھتے ہیں خدا پر کچھ نہیں چھوڑتے اس طرح اپنی انانیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک سینئر سی ایس پی دوست نے نواب کالا باغ کی جو مغربی پاکستان کے گورنر اور طبعاً بہت جابر حاکم تھے، یہ بات ہمیں سنائی۔ نواب صاحب نے کمشنروں کی کانفرنس میں ان سے کہا صاحبزادہ مظفر احمد ہمارے ڈپٹی کمشنر رہے ہیں۔ ہم نے انسانی استطاعت کے مطابق تدبیر کر دینے کے بعد نتیجہ خدا پر چھوڑنا ان سے سیکھا ہے ۔ نواب کالا باغ ہمیشہ انہیں صاحبزادہ مظفر احمد کہا کرتے تھے۔

ایم ایم احمد ایسے وقت میں پاکستان کے اقتصادی لحاظ سے اہم عہدوں پر فائز رہے جب مشرقی پاکستان والے مغربی پاکستان والوں کو اور حکومت کو اپنی اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ ادھر پلاننگ کمیشن ایم ایم احمد کے دائرہ کار میں شامل تھا اس لئے کیا کیا باتیں نہ بنتیں کہ مشرقی پاکستان کے استحصال کی ساری ذمہ داری ایم ایم احمد کی ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بھی ایم ایم احمد تنقید کا ہدف بنتے رہے مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔ اعداد و شمار نے ہمیشہ ایم ایم احمد کی صفائی میں گواہی دی تنقید کرنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ایم ایم احمد سے بھی کئی لوگوں نے اس قسم کے سوال کئے مگر آپ نے بڑے وقار سے اپنی صفائی پیش کی کسی دوسرے پر الزام نہیں لگایا۔ حالانکہ ہمارے لوگوں کا وطیرہ یہ ہے اپنے کئے کی ذمہ داری بھی دوسروں پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اب تو حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ الم نشرح ہوگئی ہے اقتصادی استحصال کی ساری باتیں ہوائی باتیں تھیں اور سیاسی لیڈر سیاسی اشکلہ کے طور پر کہتے تھے۔ جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے سابق امیر خرم مراد کی خود نوشت اب آ کے شائع ہوئی ہے اس میں بھی انہوں نے ایم ایم احمد پر الزام لگایا ہے کہ وہ کہتے تھے "مشرقی پاکستان کے لوگ بھک منگے اور بوجھ اور خوامخواہ کی ذمہ داری ہیں اس لئے ان سے پیچھا چھوٹ ہی جائے تو اچھا ہے" (لمحات صفحہ ۴۹۲) مگر اس الزام کا کوئی حوالہ یا ثبوت انہوں نے نہیں دیا محض اپنی صالحیت کا اظہار کیا ہے۔

جب ایم ایم احمد محکمہ خزانہ کے سکرٹری تھے تو ایک روپیہ کا نوٹ ان کے دستخطوں سے جاری ہوا۔ ہم ان

کے دادا کے رفیق ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں آبدیدہ پایا۔ پوچھا ''خیر باشد''؟ فرمانے لگے بات معمولی سی ہے مگر مجھے غیر معمولی لگتی ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا ہے کہ میرے مرشد کے پوتے کے نام کا سکہ چل رہا ہے۔ یہ کہہ کر پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے یہ محبت کے آنسو تھے۔ ہم نے ایم ایم احمد کو ایک خط لکھا کہ آج ہم نے آپ کے دادا ابا کے ایک ساتھی کی یہ بات آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہے۔ بات ذوقی سی ہے مگر ہمیں یہ بات یاد ہے اور یاد رہے گی۔ اسی طرح مدتوں بعد ایک بزرگ کے پاس ایک پھٹا پرانا نوٹ دیکھا جو انہوں نے سینت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ کہنے لگے دیکھتے نہیں اس پر کس کے پوتے کے دستخط ہیں؟ یہ کہہ کر ان کی آواز بھرا گئی۔ پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر دستخط کرنے والے تو بے شمار تھے اور ہوں گے مگر یہ عزت کس کو ملے گی؟ کون ان کے دستخطوں سے جاری ہونے والے نوٹ کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔ پیسا تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے مگر ایم ایم احمد کا جاری کردہ ہاتھ کا میل بھی محبت کرنے والوں کی آنکھوں کا سرمہ بن گیا۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ یہ سارا شرف اس خاندان کا ہے جس کی ایک شاخ وہ تھے۔

ہمیں ذاتی طور پر صرف دو ایک بار ان سے ملاقات کا شرف ملا۔ ایک بار تو لاہور میں جب یہ ایڈیشنل چیف سکرٹری تھے۔ ان کے والدِ گرامی کا بھیجا ہوا ایک بند لفافہ تھا جو ہمیں ان کی خدمت میں پہنچانا تھا۔ ہم دفتر میں پہنچے، پی اے کو اپنے نام کی چٹ دی۔ اس نے ہمیں ایک طرف بٹھا دیا کہ صاحب مصروف ہیں۔ ہم نے کہا بھی کہ ضروری خط ہے اور ہمیں واپس جانے کی بھی جلدی ہے مگر صاحب وہ ایڈیشنل چیف سکرٹری کا پی اے تھا اس پر ہماری بات خاک اثر کرتی۔ بیٹھے انتظار کھینچتے رہے۔ اتنے میں ایم ایم احمد اپنے کسی ملاقاتی کو رخصت کرنے دروازہ تک آئے تو ان کی نظر ہم پر پڑی۔ جانتے تھے کہ ہم ان کے ابا کے خادم ہیں۔ باہر چلے آئے پوچھا آپ کب آئے اور کیا کام ہے؟ ہم نے وہ خط ان کے حوالہ کیا اور جواب کا مطالبہ کیا۔ ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ چائے پانی کا پوچھا۔ اپنے والد گرامی کا خط پڑھا جواب لکھا بند کیا، ہمارے حوالے کیا اور دروازہ تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ پی اے حق دق حیران ہمیں دیکھتا رہا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کا اتنے بڑے سرکاری افسر سے کیا تعلق ہے؟

دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب ان کے والد ماجد کا انتقال ہوا۔ لوگ تعزیت کے لئے حاضر تھے مصافحہ ہو رہا تھا۔ ہماری باری آئی تو ایم ایم احمد نے گیلی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور لپک کر گلے لگا لیا۔ کوئی بات ہم نے کی نہ آپ نے کی۔ ایک ملاقات یہاں امریکہ کی بیت الرحمٰن میں ہوئی۔ نماز کے لئے ہم البیت میں داخل ہوئے تو ساتھ ہی امیر صاحب بھی داخل ہوئے۔ آپ نے ہمیں دیکھا، نظریں ملیں، مصافحہ کیا، لب ہلے، شاید سلام کیا تھا مگر ہم نے الفاظ نہیں سنے۔ ایسی غیر ملفوظ محبتیں ہم نے ان کے سوا دوسروں میں نہیں دیکھیں۔ آنکھوں کی ملائمت سب کچھ کہہ دیتی تھی۔ اگلے روز ان کی بھانجی نے بتایا کہ کل گھر میں آپ کے ربوہ والے مضمون کا ذکر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے میں نے اس مضمون والے کو بیت الرحمٰن میں دیکھا ہے۔ وہ مضمون برسوں پہلے رسالہ خالد میں پھر الفضل میں دوبارہ چھپا تھا۔ لاہور میں ''ہماری بستی کے پچاس سال'' والا مضمون بھی ان کی نظر سے گزرا تو تحسین کے الفاظ کہے۔ ایم ایم احمد کو بھی اس بستی سے وہی لگاؤ تھا جو ہم سب کو ہے۔ ان کا وقت موعود امریکہ میں آ گیا۔ بڑی دیر سے علیل تھے، علاج معالجہ کی بھلا ان کے لئے کیا کمی تھی؟

مگر جان تو جان آفریں کے سپرد کرنی ہے، کر دی اور اب ان کی مٹی اسی زمین کو واپس بھیجی جا رہی ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اپنے وطن کی مٹی کو اوڑھ کر سو جائیں گے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی!

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی!!

قدم قدم تیری یادیں

مرحوم شاعر دوستوں کے تذکرہ میں سے ہم نے اپنے دوست ڈاکٹر نصیر احمد خان کا ذکر علیحدہ کر دیا تھا کیونکہ نصیر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ محض شاعر کہہ دینے سے انصاف نہ ہو پاتا، اسی طرح اپنے استادوں میں انہیں شامل کرنا چاہا مگر پھر خیال آیا کہ سائنس تو ہم نے پڑھی ہی نہیں ہاں ہم نے ان سے پڑھا کچھ نہیں سیکھا بہت کچھ ہے۔

نصیر صاحب نہایت وجیہہ اور حد سے زیادہ جامہ زیب انسان تھے۔ ہر لباس ہی ان کے وجود پر پھبتا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ، چمکتی دمکتی پیشانی، بالائے سرش نہ ہوش مندی، می تافت ستارہ بلندی! استادوں میں استاد تھے۔ لڑکوں میں لڑکے، شاعروں میں شاعر اور حسینوں میں حسین! نصیر احمد خان صاحب کالج یونین کے انچارج تھے۔ کڑے منتظم تھے۔ یونین کے جلسوں میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اونچی نیچی بات کہہ جائے۔ نصیر صاحب کی شخصیت کے آگے بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو جاتے تھے!

ہمارے ساتھ ان کا تعلق محض یونین کا نہیں رہا۔ شاعر تھے اس لئے ہم پر مہربان تھے۔ کبھی کوئی تازہ غزل کہتے تو بلا بھیجتے۔ حاضر ہوتے تو جس استاد کی زمین میں غزل کہی ہوتی پہلے اس پر طبع آزمائی کرتے پھر نہایت لطف لے لے کر کلام سناتے۔ ہم منہ لگے تھے اس لئے کبھی کبھی چٹکی بھرتے تو تلملا اٹھتے۔ مگر نصیر صاحب آخر نصیر صاحب تھے جواب میں ایسی دور کی کوڑی لاتے کہ لینے کے دینے پڑ جاتے! مگر یہ بے تکلفی ہم دونوں کا ذاتی معاملہ تھی۔ گھر سے باہر ہم نے کبھی ان کے بارہ میں کوئی بات کہی نہ نصیر صاحب نے ہم پر کوئی فقرہ چست کیا اور یہ وضع داری آخر تک نبھائی۔

فزکس کے مانے ہوئے عالم تھے اور پاکستان میں نکلیئر فزکس کے گنے چنے ماہروں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر ناقدری کا یہ عالم تھا کہ تعلیم الاسلام کالج میں ان کے اوپر فزکس ہی کے ایک معمولی استاد کو بطور پرنسپل لگا دیا گیا جسے سائنس سے اتنا ہی واسطہ تھا جتنا کسی ان پڑھ کو ہو سکتا ہے۔ نصیر صاحب اپنے پوسٹ

گریجوایٹ ڈیپارٹمنٹ میں مگن رہے مگر اس بات پر ہمیشہ ہی نالاں رہے کہ محکمہ ان کی ایک نہیں سنتا! پوسٹ گریجوایٹ شعبہ چلانا کارے دارد ہے ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ نصیر صاحب نے اپنی تمام تر توانائیاں اس شعبہ پر صرف کر دیں!

ہم نے شعبہ فزکس کا عروج بھی دیکھا اور زوال بھی نیو کیمپس کو زبان خلق نے ہمیشہ یونیورسٹی ہی کہا اس یونیورسٹی کے وسیع وعریض کیمپس میں نصیر صاحب نے اپنا علم کا چراغ روشن کر رکھا تھا۔ صاف ستھری لیبارٹریاں، لیکچر تھیٹر، لائبریری، کوئی دیکھنے کے لئے آنکلتا تو نصیر صاحب ایک ایک کمرہ ایک ایک لیبارٹری اتنے پیار اور اتنے لگاؤ سے دکھاتے کہ دیکھنے والا ان کی محبت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا!

نصیر صاحب کے انتقال پر کالج کے نیو کیمپس میں میں نے ایک تقریب تعزیت برپا کی۔ باہر سے بہت سے دوست آئے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر پر تو اتنی رقت طاری ہوئی کہ ان کی ساری طلاقتِ لسانی دھری رہ گئی کہنے لگے ''میں جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی خاموش نہیں ہوا مگر میں چپ ہوں اور نصیر صاحب کے کیمپس کے سناٹے میں ہر طرف نصیر صاحب کی یاد گونج رہی ہے'' میر انیس کے شعر کی بلاغت اس روز سمجھ میں آئی۔

یہ بے سبب نہیں سونے گھروں کے سناٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

نصیر صاحب کی خواہش تھی کہ وہ اپنا کلام یکجا کر کے چھاپ دیں۔ چنانچہ وہ ''رودِ چناب'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے مرتب کرنے میں کچھ ہماری بھی کوشش شامل ہے۔ مگر صاحب! نصیر صاحب اپنے ہر شعر سے اتنا پیار کرتے تھے کہ کسی شعر کو برا کہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر ہم نے کئی شعروں پر چھری پھیر دی آفریں ہے کہ نصیر صاحب نے ہماری بات مان لی اور وہ شعر ترک کر دیئے۔ مگر ہر شعر میں سقم نکالنے کے بعد پورے سائنسی طریق سے انہیں قائل کرنا پڑتا تھا کہ اس شعر میں واقعی سقم ہے۔

نصیر صاحب کی نفاست ضرب المثل تھی۔ ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، گفتگو کرنے، کھانے پینے میں ایک خاص سلیقہ تھا کسی اور میں اتنی خوش سلیقگی کم ہی دیکھنے میں آئی۔ آداب مجلس کا پاس اور لحاظ بھی ان پر ختم تھا مگر ان کی مجلس میں یبوست کا گزر نہیں ہو پاتا تھا۔ لطیف مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ ہم نے کسی اور جگہ یہ بات لکھی ہے کہ ''جس مجلس میں بھائی مسعود احمد خاں دہلوی، سیٹھ محمد اعظم حیدر آبادی اور نصیر صاحب اکٹھے ہو جاتے وہاں وہ پھلجھڑیاں چھوٹتیں کہ چراغاں ہو جاتا''!

نصیر صاحب پی ایچ ڈی کر کے انگلستان سے لوٹے تو ایک نیلی فوکس ویگن کار بھی خرید لائے۔ کالج کے سٹاف میں پہلی بار نئی کار نصیر صاحب کو ہی اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ کار پرانی ہوتی گئی۔ ربوہ کی مٹی اور اسکی شوریدگی کے آگے بھلا کون ٹھہر سکتا ہے؟ کار پرانی ہوئی تو واقف زندگی پروفیسر کے وسائل اس کے علاج معالجہ کے کہاں متحمل ہو سکتے تھے۔ اس کی برق رفتاری رفتہ رفتہ آہستہ خرامی میں بدلنے لگی تو اسے بیچ کر نصیر صاحب نے ایک فیئٹ کار خریدی وہ آہستہ خرام بلکہ مخرام پر عمل پیرا نکلی۔ ایک بار ہم کالج کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے نصیر صاحب آئے گاڑی روکی کہنے لگے ''آؤ بیٹھ جاؤ'' ہم نے عرض کیا ''شکریہ آپ چلیں۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے'' تلملا کر رہ گئے۔ مدتوں بعد ہماری گاڑی ان کے گھر کے آس پاس خراب ہو گئی۔ ہم نے جا ان کا دروازہ کھٹکھٹایا پہلے تو چائے پانی سے تواضع کی پھر فرمانے لگے ''اگر آپ کو جلدی نہ جانا ہو تو میں اپنی گاڑی پر چھوڑ آؤں''۔

ایک بار کسی محفل میں آپ نے ایک غزل سنائی، زمین تھی۔ ''بے خودی تھی میں نہ تھا'' ''سرخوشی تھی میں نہ تھا'' وغیرہ۔ ''میں نہ تھا'' کی ردیف نبھانا بہت مشکل کام تھا۔ نصیر صاحب آخر تک نبھا گئے۔ مگر مقطع میں آپڑی وہ سخن گسترانہ بات! مقطع تھا۔

رک گئی تھی لب پہ جو آکر نصیر
اک صدائے بے کسی تھی میں نہ تھا

ہم نے پکڑ لیا کہ ردیف حشو ہو گئی ہے۔ الجھ پڑے کہ ثابت کرو۔ ہم نے کہا پہلے مصرعہ میں لب پر آکر رکنے کا قرینہ ہے۔ صدائے بے کسی یا آہ و فریاد لب پہ آکر رک سکتی ہے آپ خود کیسے لب پر آکر رک سکتے ہیں؟ بہت جز بز ہوئے مگر قائل نہیں ہوئے۔ المنار میں چھاپنے کے لئے دی تو ہم نے مقطع کاٹ دیا۔ بہت

دنوں ناراض رہے پھر ایک روز کہنے لگے۔ یار اب سمجھ آگئی ہے۔ اس لئے ناراضگی کو گولی مارو۔ یہ نئی غزل سنو! کیا لوگ تھے۔ کہاں گیا وہ زمانہ کہاں گئے وہ لوگ!

اپنے بچوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ خود بتاتے تھے کہ عاشی، (عزیزہ عائشہ نصیر) چھوٹی سی تھی۔ بھاگتی ہوئی آتی اور میرے کندھوں پر سوار ہو جاتی مگر لباس کے معاملہ میں نفاست اور رکھ رکھاؤ کے باوجود میں دم نہ مار سکتا!۔ عاشی سے ان کے پیار کا یہی عالم تھا۔ عزیزی ظہیر احمد خان اور عزیزی منیر احمد خان ان کے دو بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے۔ ایک انجینئر بنے اور دوسرے ڈاکٹر۔ ظہیر احمد خان لاہور میں تھے۔ ایک روز میں نصیر صاحب سے ملنے گیا تو غصہ میں تھے کہنے لگے، ظہیر کی حرکت دیکھو "مہینے بھر کے بعد خط لکھا اور اس میں اپنی خیریت کے بارہ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا" پھر اس خط کا جواب دکھایا جو یوں شروع ہوتا تھا۔ "عزیزی ظہیر احمد خان والد ماجد عزیزی حماد احمد خان"۔ ہم نے کہا "یہ کیا؟" کہنے لگے "اسے احساس دلانا چاہتا ہوں کہ وہ بھی باپ ہے اس لئے باپ کے جذبات کا خیال رکھنا آنا چاہیئے"۔

بہت برس پہلے کی بات ہے عزیزی ظہیر احمد خان سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ حضرت نے نہایت بھونڈی داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ ہم نے کہا "بیٹے! یہ ریش طرازی (درازی؟) تمہارا ذاتی معاملہ ہے مگر ہمیں اتنا یقین ہے کہ تمہارا باپ تمہیں اس حال میں دیکھتا تو خوش نہ ہوتا"، ظہیر کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ اسے باپ کی نفاست یاد آئی ہوگی۔

ہمارے شاگرد اور دوست عزیزم ڈاکٹر عنایت اللہ منگلا نے جو اقتصادیات کے پی ایچ ڈی اور گولڈ میڈلسٹ ہیں، ہم سے خواہش کی کہ عزیزی عائشہ نصیر کے رشتہ کی تحریک کریں۔ ہم چونکہ دونوں گھروں کو جانتے تھے ہم نے موقع جان کر یہ تحریک کر دی۔ نصیر صاحب یکدم خاموش ہو گئے! اتنا خاموش ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگے آج مجھے احساس ہوا ہے کہ میری ایک بیٹی بھی ہے جسے مجھے بیاہنا بھی ہے۔ ورنہ میری آنکھوں میں تو وہ ایک معصوم سی بچی ہے! عاشی کا اور منگلا کا رشتہ ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے دونوں گھر بار سے خوش اور صاحب اولاد ہیں مگر نصیر صاحب کی خاموشی ہمیں نہ بھولی!

نصیر صاحب کا ذکر تو ایک پیارے دوست کا ذکر ہے کیسے ختم ہو؟ جب قدرت نے ہی وہ رشتہ اچانک توڑ

دیا تو ہم اسے کیسے دراز تر کر لیں؟

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ایک اک کر کے ہوئے کتنے ستارے رخصت

پچھلے چند ہی مہینوں میں ہماری بستی کے کتنے درخشندہ ستارے غروب ہو گئے۔ جانا تو ہر ایک کو ہے مگر غریب الوطنی میں بیٹھ کر کسی کی سناؤنی سنیں تو سیدھی دل پر چوٹ پڑتی ہے حالانکہ ان لوگوں سے جو اپنا وقت گذار کر آگے گذر جاتے ہیں ایسا قریبی تعلق نہیں ہوتا کہ جسے قربت اور دوستی کا تعلق کہا جا سکے۔ مگر وہ لوگ بستی میں چلتے پھرتے جیتے جاگتے نظر آتے رہیں تو دل کو یک گونہ تسلی رہتی ہے کہ یہ لوگ ہمارے پاس ہی ہیں کسی وقت بھی استفادہ کا موقع ملے تو ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ نہ رہیں تو محرومی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا دستور ہے۔ دیکھتے دیکھتے منظر نامہ بدلتا ہے اور لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور دنیا والے انہیں مٹی کو سونپ آتے ہیں۔ مٹھیوں میں خاک بھر کر دوست آئے بہرِ دفن۔ زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے۔

ہم بہت چھوٹے تھے تو اپنے تایا کے ہمراہ اپنی بستی کے ایک درویش نواب کی ڈیوڑھی پر جایا کرتے تھے۔ تایا تو اپنے کارِ دربانی میں مصروف رہتے ہم ان نواب صاحب کے پوتوں میں سے ایک سے کھیلتے رہتے جو ہمارے ہم عمر تھے اور جن سے بعد میں کلاس میں ہمنشینی کا موقع بھی ملا۔ انہی نواب صاحب کے ایک بزرگ پوتے تھے جنہیں ہم نے دور دور سے بہت دیکھا لیکن قریب آنے کا موقع نہ ملا۔ ہجرت کے بعد یوں ہؤا کہ ان سے تھوڑا تھوڑا علمی تعلق پیدا ہونے لگا کہ صاحبِ ذوق تھے۔ پھر ہمارے بزرگ چچا مولوی عبد الکریم لندن سے آتے تو ان نوابزادہ صاحب کی موٹر ان کی سواری میں رہتی۔ اس موٹر کو ڈرائیو کرنے کا موقع ہمیں ملتا کیونکہ چچا کا خیال تھا کہ پاکستان میں ڈرائیونگ کرنا ان جیسے کہنہ مشق ڈرائیور کے بس کا روگ نہیں۔ یوں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ ہم لاہور میں پڑھتے تھے تو دارالذکر میں ان سے علیک سلیک ہوتی رہتی۔ اصل تعلق اس وقت پیدا ہؤا جب ان کے صاحبزادے ہمارے شاگرد ہوئے۔ ایک نواب کے پڑپوتے دوسرے نواب کے پوتے تیسرے نوابزادہ کے صاحبزادے۔

ہونے کے باوجود ہمارا بچہ بن کر رہا بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے اپنے بچے رہتے ہیں۔ وہی بے تکلفی رہی۔ ہم اکثر سوچتے تھے کہ اس نوابزادہ میں اتنی فروتنی کیسے آ گئی ہے؟ اس کا عقدہ اس وقت کھلا جب اس کے باپ کو نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرتے دیکھا۔ اس کے پردادا کے بارہ میں بھی یہی سنا کہ ماموروقت کی جوتیوں میں بیٹھنے کو اپنے لئے فخر سمجھتے تھے۔ ہم جس نوابزادہ کا ذکر کر رہے ہیں وہ نوابزادہ میاں عباس احمد خان تھے اور ان کے دادا نواب محمد علی خان تھے۔ پچھلے دنوں نوابزادہ عباس احمد خان صاحب کی رحلت کی اطلاع ملی تو دیر تک اس درویش نوابزادہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا۔ بات کرنے میں دھیمے، مہمان نوازی میں مستعد اور آگے آگے۔ کئی بار یوں ہوا کہ ان کی کوٹھی پام ویو میں کھانے کا وقت آ گیا تو نوابزادہ صاحب خود اٹھ کر غسل خانے میں ہاتھ دھونے کا انتظام چیک کرتے۔ خود اٹھ کر پینے کا پانی لاتے۔ نوکر چاکر موجود ہیں مگر مہمان کی خدمت میں انہیں لطف آتا تھا۔ خاموش طبع تھے زیادہ باتیں بنانا یا کرنا انہیں نہیں آتا تھا مگر کبھی کبھار کسی علمی موضوع پر رواں ہو جاتے تو ان کا گویا بحر کھل جاتا۔ ایسے ایسے نکتے بیان کرتے کہ سننے والا عش عش کرتا رہ جاتا۔ (دلی والے اسے اش اش لکھتے ہیں)۔ ہم نے بچپن سے انہیں دیکھنا شروع کیا تھا اس لئے ایک رعب داب ان کی شخصیت کا تھا ان سے بے تکلف ہو کر کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا مگر جب بے تکلفی ہو گئی تو احساس ہوا کہ یہ رعب داب محض ہماری اپنی طبیعت کی وجہ سے تھا ورنہ وہ تو ہر ایک سے بے تکلف ہو کر ملنے والے ہیں۔ اب وہ اٹھ گئے ہیں تو ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔ ان کے ہاں ان کے کارخانے میں کام کرنے والے ایک دوست سید سجاد احمد کا انتقال بھی انہیں دنوں ہوا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے کسی آجر کو ان جیسا ملائم طبع نہیں دیکھا مزدوروں، کام کرنے والوں کے حق میں رحمت۔ اللہ تعالیٰ اس درویش صفت نوابزادہ کو اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اور ان کے علمی فیض اور طبیعت کی ملائمت کو ان کی اولاد و اخلاف میں جاری رکھے۔

پھر ہماری بستی میں دلی کے خواجہ میر درد کے خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ ان کی بزرگی اور علمیت کا ایک زمانہ گواہ تھا۔ ہم نے جس کو بھی دیکھا ان کی علمیت کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ حدیث اور قرآن ان کا تخصص تھا۔ ان کا قرآن کا ترجمہ تو اب بھی مقبول خلائق ہے۔ ان کی مہمان نوازی اور غریب پروری کے چرچے آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ معذوروں ناداروں کی دستگیری کرنے اور کسمپرسوں کو پوچھنے

والے۔ ان کی شخصیت اور بزرگی کا رعب بچوں بڑوں سب پر تھا مگر ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے کبھی ان کی بزرگی سے ڈر کر انہیں سلام کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس کی ہو۔ یہی لگتا تھا کہ یہ بزرگ تو بس اپنے ہی ہیں۔ ان کی اولاد میں سے ان کے تینوں بیٹوں کو ہم نے اپنی بستی کے لوگوں میں مقبول ومحبوب پایا۔ ایک اپنی انتظامی قابلیت کی وجہ سے معروف ہوئے اور ایک دینی ادارہ کے سربراہ رہے اور دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے رونے والوں کا ایک گروہ کثیر چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ لوگ اب بھی ان کو یاد کرتے ہیں۔ ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔ دوسرے صاحبزادے جو ابھی پچھلے دنوں اس دنیا سے گئے ہیں عجیب منکسر المزاج بزرگ تھے۔ دیکھنے میں بالکل سادہ اور درویش۔ طبع میں حد سے زیادہ فروتنی۔ علمی ذوق کے حامل تھے مگر اپنی علمیت اور بزرگی کا اظہار کرنے میں بہت محتاط تھے۔ یورپ میں سکینڈے نیویا میں مدتوں دینِ حق کا چرچا کرتے رہے۔ ان کے اپنے ادارہ والوں نے ان کو خط لکھا اور کہا کہ آپ اتنے لمبے عرصہ تک اس نیک کام میں مصروف رہے ہیں مادرِ علمی میں آ کر ایسے واقعات سنائیں جو ''ایمان افروز'' ہوں۔ اسی چٹھی کے پیچھے لکھ بھیجا کہ ''میرے ان ملکوں میں قیام کے دوران کوئی ''ایمان افروز'' واقعہ نہیں ہوا اس لئے مجھے اس تقریر سے معاف رکھئے''۔ یہ ان کی عاجزی کی انتہا تھی ورنہ ہم جیسوں کو موقع ملے تو ہر واقعہ کو ایمان افروز بنا کر اپنے ایمان میں کمی اور دوسروں کے ایمان میں اضافہ کرتے پھریں۔ اس فروتن بزرگ نے یہ ورثہ اپنے بزرگ باپ سے لیا تھا۔ سید میر مسعود احمد بھی اپنے بزرگ باپ کی طرح ''یمشون فی الاسواق'' کرتے تھے۔ بستی میں چلتے پھرتے۔ لوگوں سے ملتے ان کا دکھ درد سنتے ان کے ہم وغم میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے جوتوں کو بھی ہم نے ان کے باپ کے جوتوں کی طرح گرد آلود پایا۔ ان کو شاید ''اشعث اغبر'' رہنے میں مزا آتا تھا۔ ان کی شخصیت کے گرد بھی احترام کا ہالہ تھا ہر کس وناکس ان سے ملنے کے ان کی طرف نہیں لپکتا تھا یہ اپنی دھن میں مگن چلتے چلے جاتے۔ ایک دوبار ہم نے انہیں سائیکل سے اتر کر لوگوں سے بات چیت کرتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس لئے اتر آئے ہیں کہ اس پیدل چلنے والے نے انہیں سلام کہا تھا اور یہ سائیکل پر جاتے جاتے اسے اس کا سلام لوٹانا نہیں چاہتے تھے باقاعدہ اتر کر سلام کا جواب دیا ہے اور پھر یہ جا وہ جا۔ جسم بھاری تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ ''کارِ جہاں'' سے بیکار ہو گئے ہوں اس لئے چلنے میں کچھ حجاب محسوس کرتے تھے مگر ہم نے

انہیں چلتے اور سائیکل چلاتے دیکھا ہے ہمیں تو محسوس نہیں ہوا کہ ان کا جسم ان کی مستعدی کی راہ میں حائل ہوا ہو۔ لائبریری کو جانے والا رستہ ان کی علمی تگاپو کا گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے باپ کے علمی فیضان کو ان کے اخلاف میں جاری رکھے ۔ میری واقفیت تو ان کے کسی بچے سے نہیں البتہ اس دودمانِ علمی کا ایک بچہ قمر سلیمان ہے جس پر اس کے استادوں کو فخر ہے اللہ تعالیٰ اس کے علم اور قلم میں برکت دے۔

یہ تو ہماری بستی کا ذکر تھا ہماری اپنی گلی کے دو بزرگ انہی دنوں گئے اور ہماری گلی کی رونقوں کو ساتھ لئے گئے۔ قریشی محمد افضل اور مولانا رشید احمد چغتائی۔ قریشی افضل صاحب کو ہم نے ہجرت سے پہلے اپنی بستی کے "افضل برادرز" کے حوالہ سے جانا۔ ان کی دکان مشہور خلائق تھی مگر ہمیں یاد نہیں کہ ہم کبھی ان کی دکان پر گئے ہوں ہاں اتنا ہے کہ بڑے بازار میں آتے جاتے وہاں سے گذر ہوتا تھا دو دکانیں ذہن کے پردہ پر کل کی طرح آج بھی لکھی ہوئی نظر آتی ہیں ان کی دکان 'اور علی گوہر اینڈ سنز کی دکان۔ پھر ہجرت کے بعد نئی بستی میں آئے تو ان کی دکان پھر پہلے پہل اس بستی میں قائم ہوئی۔ ادھر ان لوگوں نے گھر ہماری گلی کی نکڑ پر بنالیا منڈی کی طرف سے داخل ہوں تو دائیں ہاتھ پہلا مکان ان کا تھا اور مشرق کی جانب سے آئیں تو اس زمانہ میں پہلا مکان قریشی نذیر احمد صاحب کا تھا بعد کو اولیت ابراہیم اینڈ سنز نے چھین لی۔ قریشی صاحب تو افریقہ میں دین کی اشاعت کا کام کر رہے تھے ان کی اولاد میں سے طاہر قریشی ہمارا شاگرد ہوا۔ دوسرے بھائی قریشی محمد اکمل صاحب گول بازار میں جا بیٹھے ان کا بیٹا انور قریشی ہمارا شاگرد ہوا اس طرح پرانی بستی کے اس خاندان سے ہمارا ہمسائیگی کے علاوہ بھی ایک تعلق بن گیا۔ ان کے بھتیجوں محمد احمد قریشی اور اسلم قریشی شہید سے کچے کوارٹروں کے زمانہ سے دوستی رہی۔ یہ دونوں بھائی محمد افضل قریشی اور قریشی محمد اکمل صاحب اپنی طرز کے بزرگ ہیں۔ خاموش مخلص اور حد سے زیادہ دیانت دار اور امین۔ قریشی افضل صاحب سے تو محلہ داری کی وجہ سے اکثر آمنا سامنا اور علیک سلیک ہو جاتی تھی ہمیں یہ بات بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے قریشی محمد افضل صاحب کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ زیر لب پڑھتے دیکھا کسی آیہ کریمہ کا ورد کرتے ہوں گے۔ ذکر الٰہی کرتے ہوں گے۔ درود شریف پڑھتے ہوں گے۔ ہم نے اس بات کی کرید نہیں کی مگر ہم نے ان کے ہونٹ ہمیشہ ہلتے دیکھے۔ ہمارا یار قریشی محمد احمد تو ایسا کراچی گیا کہ وہیں کا ہو رہا۔ محمد اسلم قریشی کو اللہ تعالیٰ نے شہادت سے سرفراز کیا اور اپنے پاس بلا

لیا اب ان کی آل اولاد یہاں ٹورانٹو میں ہے مگر انہیں اس بات کا علم نہیں کہ ہمارا اور ان کے باپ کا کتنا دوستانہ تھا۔ مگر ذکر قریشی محمد افضل صاحب کا ہے۔ ان کی دعا گوئی کا چرچا بھی بہت تھا۔ یہ بزرگ اپنی گلی کے مکینوں کے لئے شجر سایہ دار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انکی دعاؤں کا فیض جاری رکھے۔

ادھر مشرق کی جانب استاذی المحترم قبلہ شیخ محبوب عالم صاحب خالد کے مکان کے ساتھ مولانا رشید احمد چغتائی صاحب تھے، ہمیشہ کلاہ پر سفید پگڑی باندھ کر باہر نکلنے والے۔ بر میں اچکن ہم نے ہمیشہ دیکھی۔ ایک وضع داری تھی جسے نبھا رہے تھے۔ بلاد عربیہ میں برسوں رہے۔ عربی خوب جانتے تھے جن لوگوں نے ان سے پڑھا ہے (اور ان میں ہماری بیگم بھی شامل ہیں) وہ ان کے تبحر علمی کی تعریف کرتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے ایک گلی میں قریب تر رہنے کے باوجود ہمارا بے تکلفی کا تعلق اس لئے نہ ہوا کہ ان کی طبیعت میں خوردوں سے میل ملاپ رکھنے میں حجاب تھا ادھر ہماری تمام تر دوستی اپنے سے بڑی عمر کے بزرگوں سے رہی۔ چغتائی صاحب کی دوستی سے ہم محروم رہے مگر ان کی دعاؤں سے ہرگز محرومی نہیں رہی وہ گلی کے سب مکینوں کے ساتھ ہمسائیگی کے حق کو نباہتے تھے۔ ہر ایک کی خبر گیری کرتے رہنا بیماروں کی عیادت کرنا۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اسی لئے تو ہم نے ابتدا ہی میں یہ لکھا تھا کہ ہماری گلی اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنے بزرگ لوگوں سے محروم ہو گئی۔ اب شیخ محبوب عالم صاحب خالد ہیں اللہ ان کی زندگی میں برکت دے۔ ہم جیسے غریب الوطن لوگ دعائیں ہی تو دے سکتے ہیں۔ قبلہ شیخ محبوب عالم خالد بھی اس کتاب کے مرتب ہوتے وقت رخصت ہو چکے ہیں۔ کل من علیہا فان۔

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن۔۔۔

ہجرت کے بعد قادیان میں جو درویش دھونی رما کر بیٹھ گئے ان میں کا ایک وجود ملک صلاح الدین صاحب کا بھی تھا۔ وہی بستی جو اپنی تھی پرائی ہو گئی تھی۔ وہ گلی کوچے جن میں اپنائیت کا مِن برستا تھا انہیں اجنبیت کا گھن لگ گیا تھا۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا مضمون تھا۔ لوگ دار المسیح میں محصور ہو کر جان ہتھیلی پر رکھے، بتیس دانتوں میں زبان کی طرح بیٹھے تھے۔ باہر کی دنیا سے صرف دعاؤں کا رابطہ تھا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے اپنے انہیں بھولے نہیں بلکہ ان کی یاد میں بے قرار ہیں۔ دن رات ان کی سلامتی کی دعائیں کرتے نہیں تھکتے۔ شعبِ ابی طالب کی تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ وقت کی طنابیں رفتہ رفتہ ڈھیلی ہونے لگیں۔ حالات میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ باہر کی دنیا سے رابطہ ہونے کی موہوم سی صورت ہویدا ہونے لگی۔ ان محصور درویشوں کی پامردی اور اولوالعزمی نے تاریخ کا سینہ شق کر دیا۔ اجنبیت کے بادل چھٹنے لگے اور زندگی معمول پر آنے لگی۔ ایسے جاں کاہ ماحول میں جس شخص نے قلم کو ہاتھ سے رکھنے نہیں دیا تھا پچھلے دنوں موت نے اس کے ہاتھ سے قلم رکھوا لیا۔ وہ درویش منھم من قضی نحبہ' کے زمرہ میں جا شامل ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین۔ کیا صاحبِ قلم تھا کہ جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا مگر تاریخ کے اوراقِ پارینہ کو محفوظ کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ اس کے لئے دن دن تھا نہ رات رات تھی، قلم تھا اور وہ تھا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور وہ قومیں خوش نصیب ہوتی ہیں جنہیں ایسے دیوانہ وار کام کرنے والے مل جائیں۔

ہمارا ان سے تعلق قادیان کی ہمسائیگی کا تعلق تھا۔ ہم ان کے دیوار بیچ کے پڑوسی تھے۔ ہم نے اپنے ہوش میں جب بھی انہیں دیکھا ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہی دیکھی۔ اس زمانہ میں یہ تو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے یہ ہمسائے علمی دنیا میں جانے پہچانے ہیں۔ بعد میں جا کر اندازہ ہوا کہ ہماری طرح محض ادب ہی نہیں چھانٹتے اپنے قلم کو سلسلہ کی خدمت کے لئے وقف رکھتے ہیں۔ ہمارے پھوپھا حضرت

مولوی غلام نبی مصری سے ان کا عاشقانہ تعلق تھا ہر وقت ان سے کچھ نہ کچھ پڑھتے پوچھتے رہتے ۔ آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے ان کا یہی طریق تھا۔ ہمارے گھر میں ان کا پڑوسی ہونے کے ناطے بڑا احترام تھا اس پر مستزاد ان کا ہمارے بڑوں سے علمی رابطہ اور رشتہ اس لئے ملک صلاح الدین صاحب ہمارے گھر کے ایک فرد ہی تھے اور قادیان میں محلہ داری کے سارے تعلقات ایسے ہی تھے حق ہمسایہ ماں جایا' لوگوں کے نزدیک محض لفظ تھے مگر ہمارے ہاں قادیان میں اور بعد کو ربوہ میں جیتا جاگتا رویہ بن گئے تھے ۔ جب دونوں ملکوں کے مابین آمد ورفت شروع ہوئی اور قادیان کے درویشوں کو ربوہ آنے کا موقع ملا تو ہمارا قوی خیال ہے کہ ملک صاحب جب آئے تو حضرت مصلح موعودؓ اور حضرت مرزا بشیر احمدؓ صاحب سے ملنے کے بعد سیدھے ہمارے ہاں آئے تھے اور پھوپھا جی سے گلے لگ کر ٹوٹ کر ملے تھے ۔ ہماری پھوپی جی نے اپنے بچوں کی طرح ان کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ کئی سال بعد ان کے برادر محترم اپنے بیٹے کے لئے بھائی جان محمد احمد نعیم مرحوم کی بیٹی کا رشتہ لینے آئے تو اور کچھ نہیں کہا صرف یہ کہا تھا کہ میں اپنے بزرگوں کی اولاد میں سے ایک بچی کا رشتہ مانگ رہا ہوں اور ہم نے بلا چون و چرا اس رشتہ پر صاد کر دیا تھا۔ قادیان کی ہمسائیگی اور ملک صلاح الدین کا خاندان اور بھلا کس چیز کی ضرورت تھی۔

ملک صاحب نے سلسلہ عالیہ احمدیہ کی جو خدمت کی اس کا صلہ تو اللہ تعالیٰ ہی دے گا مگر ایک نازک وقت میں ایک نازک موضوع کو چن لینا اور پھر ساری عمر اس کی تحقیق و جستجو میں کھپا دینا ہر کسی کا کام نہیں ۔ ہر مردے وہر کارے۔ سلسلہ کی ابتدائی تاریخ تو حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی نے محفوظ کی اور اب اس بنیاد پر مؤرخِ احمدیت مولانا دوست محمد شاہد تاریخِ احمدیت کی عمارت استوار کر رہے ہیں اگر یہ بنیاد موجود نہ ہوتی تو عمارت کیسے استوار ہوتی ؟ ملک صاحب نے جو کام اپنے ذمہ لیا اور کیا وہ بھی کسی ایک شخص کے کرنے کا کام نہیں تھا اداروں کا کام تھا مگر ملک صاحب نے تنِ تنہا اس کام میں ہاتھ ڈالا اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول عام بخشا اور توفیق ارزانی فرمائی کہ وہ اس کام کو اپنی بساط کی حد تک پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے مگر افراد تو ایسے کاموں کی بنیاد ہی رکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے ان بنیادوں پر عمارت اٹھاتے ہیں۔

ملک صاحب نے بر وقت اس ضرورت کو محسوس کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ماننے والوں کی زندگی کے حالات اگر اب محفوظ نہ کئے گئے تو عین ممکن ہے پھر وقت ایسے کام کی مہلت ہی نہ دے کیونکہ

جوں جوں وقت گذرتا جائے گا ان اصحاب کے جاننے والے معدوم ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ زندگی کا قافلہ تو رکتا نہیں۔ وقت اس بات کا انتظار نہیں کیا کرتا کہ بزرگوں سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو ورنہ کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے۔

ہمیں یاد ہے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اصحاب مسیح موعود کی روایتوں کو جمع کرنے اور سیرت المہدی مرتب کرنے کی جو توفیق دی وہ ان کی زندگی کا سب سے قیمتی کام رہے گا کیونکہ یہ روایتیں اس وقت محفوظ نہ ہوتیں تو معدوم ہو جاتیں۔ ان روایتوں کے بیان کا سلسلہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی جلسہ سالانہ کی تقریروں میں جاری رہا۔ ملک صاحب نے ان اصحاب کے حالات زندگی جمع کرنے اور چھاپنے کا بیڑا اٹھایا اور تنِ تنہا یہ کام کرتے رہے، اور یہ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔ ہمیں تفصیلات کا تو پتہ نہیں کہ ملک صاحب کو ان حالات کے حصول اور پھر تدوین اور پھر اشاعت کے لئے جو اخراجات اٹھانا پڑتے تھے ان کا کیا انتظام ہوتا تھا مگر ظاہر ہے کہ حالات حاصل بھی ہوئے مدون بھی ہوئے اور زیورِ طبع سے آراستہ بھی ہوئے اور اب انہیں بنیادوں پر لوگ آگے کام کر رہے ہیں۔

ملک صلاح الدین صاحب کی سیرت کے بارہ میں جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں وہ بھی اپنی ذات میں عجیب ہے۔ قادیان میں جب ملک صاحب سے ملاقات ہوتی تو ہم سے پہلا سوال یہ کرتے کہ حضرت مولوی صاحب کیسے ہیں؟ پھر فرداً فرداً تمام گھر والوں کی خیریت دریافت کرتے۔ ہماری پھوپھی جی کو استانی جی کہا کرتے تھے اور سارا محلہ ہی انہیں استانی جی کہتا تھا کیونکہ وہ شہر بھر کے بچوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ ہم نے ایک مضمون میں جس میں پھوپھی جی کا ذکر خیر تھا یہ لکھ دیا کہ قادیان کا شاید ہی کوئی بچہ ایسا ہو جس نے پھوپھی جی سے قرآن نہ پڑھا ہو۔ اس پر کسی بزرگ نے کہا بھئی اپنے محلہ تک ہی بات رکھو کیوں سارے شہر تک اس دائرہ کو ممتد کرتے ہو؟ ہم چپکے ہو رہے کیونکہ ہمارے ناقص علم کے مطابق دور دور کے محلوں کے بچے بھی پھوپی جی سے قرآن پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ مضمون ملک صاحب کی نگاہ سے بھی گذرا۔ قادیان سے ان کا خط آیا کہ تم نے بالکل ٹھیک لکھا ہے استانی جی سارے قادیان کے بچوں کی استانی تھیں اور شاید ہی قادیان کا کوئی بچہ ایسا رہا ہو جس نے ان سے استفادہ نہ کیا ہو۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ

تعالیٰ نے ہماری بات کی تصدیق اس دور کے ایک بزرگ سے بھی کروادی۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ملک صاحب اپنے خوردوں کے لکھے ہوئے مضمون پڑھا بھی کرتے تھے ان برخود غلط علماء کی طرح نہیں تھے جو خود تو لکھتے نہیں اور دوسروں کے لکھے کو پڑھنا مستحب نہیں سمجھتے۔ ہمارے پاس سویڈن میں ان کے کئی خطوط آئے جس میں الفضل یا بدر یا سلسلہ کے دوسرے پرچوں میں چھپے ہوئے مضامین پر ان کی رائے درج تھی یعنی وہ سلسلہ کے سارے پرچے بالاستیعاب پڑھتے تھے اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے یہ صفت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ اہلِ ادب یہ کہتے ہیں کہ جو لکھنے والا دوسروں کے لکھے پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ بہت بڑا ادیب ہوتا ہے۔ ملک صاحب نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہوگا مگر ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ بہت بڑے ادیب تھے کیونکہ وہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بعض شعرا کے بارہ میں ادب والوں نے ان کے ''بے فیض'' ہونے کی یہ دلیل دی ہے کہ وہ اس لئے بے فیض تھے کہ وہ اپنی رائے کے اظہار میں بخیل تھے۔ ہم نے اپنی جماعت کے بزرگوں کو فیض رساں پایا۔ حضرت مرزا بشیر احمد تھے' حضرت حافظ مختار احمد شاہجہان پوری تھے' حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل تھے۔ پھر متاخرین میں روشن دین تنویر تھے بھائی مسعود احمد خاں دہلوی ہیں، نسیم سیفی تھے' یہ لوگ اپنی جماعت کے کسی فرد میں ادبی صلاحیت اور سلیقہ دیکھتے تو اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ملک صاحب بھی صاحبِ فیض تھے ہم جیسے دور بیٹھے ہوئے ان کے فیض سے متمتع ہوتے تھے تو ان کے قریب رہنے والوں نے ان سے کیا کیا فیض نہ پایا ہوگا۔

ہمیں ۱۹۵۸ میں یعنی تقسیم ملک کے کوئی گیارہ برس بعد قادیان جانے کا موقع ملا۔ ملک صاحب ازبسکہ بے حد مصروف تھے مگر ہمیں خود اپنے ساتھ لے کر محلّہ دارالفضل گئے اور ہمیں ہمارے بزرگوں کے مکان دکھائے اور ان کا ذکر خیر کر کے آب دیدہ ہوتے رہے۔ ہمارے گھر میں آم کا جو درخت تھا وہ اس وقت تک موجود اور ثمر ور تھا۔ اس کے نیچے چارپائی بچھا کر بیٹھے تو ان وقتوں کو یاد کر کے سسکیاں بھر بھر کے روئے کہ وہاں بیٹھ کر وہ پھوپھاجی سے درس لیا کرتے تھے۔ ہم نے انہیں یاد دلایا کہ ہم نے اپنے دادا جان کی جو تصویر دیکھی ہے اس میں وہ اس آم کے نیچے چارپائی پر بیٹھے قرآن پڑھ رہے ہیں اور ملک صاحب کو یہ بات بھی یاد تھی۔ ان سے مل کر یہ معلوم ہوتا تھا وقت رک گیا ہے ان کی باتوں میں ملائمت اور

مزاج میں دھیما پن تھا۔ ان کی ٹوپی اور ان کی عینک ان کے چہرے کا جزو لاینفک تھی۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کبھی انہیں ٹوپی یا عینک کے بغیر دیکھا ہو ہاتھ کبھی خالی نہیں ہوتے تھے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ربوہ میں ہم نے انہیں فائلیں بغل میں دبائے دیکھا وہ فائلیں صحابہ کے جمع شدہ حالات پر مشتمل ہوتی تھیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ انہوں نے اتنا کچھ لکھا اور ہمارے پڑوس میں بیٹھ کر لکھا مگر ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے انہیں کبھی لکھتے دیکھا ہو۔ شاید لکھنے میں انہیں یکسوئی درکار ہوتی ہوگی اس لئے تنہائی میں بیٹھ کر لکھتے ہوں گے۔ ہمارے پھوپھا جی تو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے مسجد میں نماز کے لئے جاتے ہوئے بھی لکھتے رہتے تھے انہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سنت کی پیروی میں چل پھر کر لکھنے کی مشق ہوگئی تھی۔

ہم نے ملک صاحب کے ذکر خیر کا مضمون اس شعر کے ایک حصہ سے شروع کیا تھا کہ ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ۔ ملک صاحب نے بھی تند و تیز مخالف ہوا کے باوجود اپنے کام کو جاری رکھا اور اس چراغ کو جو ہوائے مخالف کے جھونکوں سے کسی وقت بھی بجھ سکتا تھا اپنی اولوالعزمی سے نہیں بجھنے دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے آمین۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد بہ ظاہر کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو ان کے کام کو جاری رکھ سکے۔ مگر الٰہی جماعتوں کے کام کبھی رکتے ہیں؟ یہ فیض انشاء اللہ جاری رہے گا۔

دو تین سفرنامے

جادہ، جادہ، جادہ پیمائی

”یورپ میں رہتے ہوئے بھی ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرنا اتنا مہنگا ہے کہ عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہاں سویڈن میں تو سفر اتنا گراں ہے کہ اپنے پڑوس کے شہر سٹاک ہالم تک ایک بار جانا ہوتو دو بار سوچنا پڑتا ہے مگر ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے شاگردوں کی وساطت سے سفر آسان اور راستے کشادہ کر رکھے ہیں۔ ابھی پچھلے برس انگلستان اور جرمنی کا سفر کیا تھا۔ اب کے پھر تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن والوں نے جرمنی بلا بھیجا کہ ’جدید اردو شاعری میں احمدی شعرا کا حصہ‘ کے عنوان پر لیکچر دیں۔ کالج کے پہلے گروپ کے ”اولڈ“ بوائے میاں عبدالسمیع نون پاکستان سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کی صدارت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو خوش رکھے کہ امسال پھر انگلستان اور جرمنی جانے کا موقعہ ملا نہ صرف جرمنی اور انگلستان کا سفر میسر آیا بلکہ سویٹزرلینڈ، آسٹریا، لی سٹنائن، فرانس کو بھی جھانک آئے جرمنی کے بلیک فارسٹ کو بھی دیکھا جھیل ٹی ٹی سی کا نظارہ بھی کرلیا۔ معاذ اللہ نے پچھلے برس کی اپنی غیر حاضری کی تلافی ہی نہیں کی جتنے دن ہم اس کے ہاں رہے وہ پابہ رکاب ہی رہا اور ہم جادہ جادہ، جادہ پیمائی کرتے پھرے۔ اگر ہمارے ساتھ ”وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی“ والی علت نہ لگی ہوتی تو خدا جانے اور کون کون سے مقامات کی سیر کروالاتا۔ اس لئے ہم ان سب لوگوں کے احسان مند ہیں جو اس سفر کا سبب بنے اور ہماری سیر و تفریح کا اہتمام کیا۔ لیکچر دینا اور مشاعرے پڑھنا تو اب ایک عام سی چیز ہوگئی ہے اور اس سے ہم نے بڑے سبق حاصل کئے ہیں مگر شاگردوں کی محبتوں میں شرابور ہیں۔ اللہ کا کرم ہے ورنہ ہم کیا ہماری حیثیت کیا!

جرمنی جانے کا پروگرام بنا تو حسب دستور نصیر شاہ درمیان میں آگئے کہ وہ اپنے ایک پاکستانی دوست کے اعزاز میں برمنگھم میں ایک شعری نشست کا اہتمام کررہے ہیں اس لئے ہماری موجودگی ضروری ہے۔ ہم مان گئے اور ٹکٹ اسی حساب سے بنوالیا۔ بریڈفورڈ کہ انگلستان میں ایک چھوٹا سا پاکستان کہلاتا ہے، کب

سے ہماری ''ہٹ لسٹ'' پر تھا۔ باری ملک کو فون کر کے ہم نے خود متنبہ کیا کہ اب کے بریڈفورڈ جائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔ ادھر برمنگھم کی نشست جسے ہم اپنوں کی نشست سمجھ کر گئے تھے غیروں کے انتظام میں نظر آئی تو کان کھڑے ہوئے مگر مفر نہیں تھا اسے بھگتایا اور اگلے روز بریڈفورڈ جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ لنڈن سے بریڈفورڈ جانے میں چار گھنٹے لگتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آدھا سفر تو ہم طے کر کے برمنگھم آئے بیٹھے ہیں باقی دو گھنٹے کا سفر ہوگا۔ باری ملک کو دو گھنٹے کا حساب رکھ کر مطلع کر دیا کہ ہم گیارہ بجے چلیں گے اور کوئی ایک ڈیڑھ بجے پہنچیں گے۔ ریزرویشن ہو چکی تو باری کا فون آیا کہ جناب کوئی کوچ ایک ڈیڑھ بجے نہیں آتی پہلی کوچ تین سوا تین بجے پہنچتی ہے آپ کون سے کوچ سے سفر کر رہے ہیں؟ وہی ہوا جس بات کا ڈر تھا رستے میں اک شیر کا گھر تھا۔ معلوم ہوا برمنگھم سے بریڈفورڈ تک چار گھنٹے لگتے ہیں اور اس حساب سے ہمارے ورود کا وقت عین وہ وقت بنتا تھا جس سے ہمیں باری ملک نے منع کیا تھا کہ تین سے چار بجے تک وہ شہر سے باہر مصروف ہیں اس لئے ہم تین اور چار کے درمیان ہرگز نہ آئیں اور ہم نے اپنی دانست میں اتنی احتیاط کی تھی کہ ایک ڈیڑھ بجے تک پہنچ جائیں تاکہ باری ملک کو کوئی دقت نہ ہو۔ اب کیا ہو سکتا تھا وہاں پہنچے تو باری کے ابا جان ہمارے منتظر تھے ان کو ہماری پیشوائی کے لئے آنا پڑا تھا۔ اگر ''پسر'' نتواند ''پدر'' تمام کند!

برمنگھم کی شعری نشست واقعی ''نشست'' تھی۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں کوئی چالیس پچاس آدمی ٹھسے بیٹھے تھے۔ مشاعرہ فرشی تھا۔ ادھر ہمارا حال یہ ہے بیٹھ جائیں تو وہ حال ہوتا کہ حضرت شیخ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ کوئی دوسرا ہی اٹھائے تو اٹھ سکتے ہیں۔ گھٹنوں نے زمین پر بیٹھنے کی حد تک بلکہ یوں کہئے کہ فرشی مشاعرہ کی حد تک ساتھ دینا چھوڑ رکھا ہے۔ طوعاً کرہاً بیٹھے تو یوں بیٹھے جیسے کوئی بوسیدہ دیوار بیٹھتی ہے۔ جب شعر سنانے کی باری آئی تو بھی دوزانو بیٹھنا مشکل نظر آیا۔ بعد میں وڈیو دیکھی تو محسوس ہوا ہم ایسے شعر پڑھ رہے ہیں جیسے کوئی بچہ گھٹنیوں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نصیر شاہ صاحب سے نشست شروع ہونے سے ذرا پہلے ملاقات ہوئی تب اندازہ ہوا کہ اس نشست کے اہتمام میں شاہ صاحب قبلہ بھی محض مہمان ہیں میزبان نہیں۔ جی تو چاہتا تھا انہیں کہیں جناب یہاں بلا کر آپ نے ہمیں دوسروں کے حوالے کیوں کر دیا ہے مگر ان کی مسکراہٹ سے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی مروت کے مارے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی اندازہ

نہیں تھا کہ میزبان مہمانوں کو اس بلیک ہول میں اکٹھا کر کے مشاعرہ کی سولی پر چڑھا دیں گے ۔ وہ تو اتفاق ایسا ہوا کہ لاہور سے آنے والے معزز مہمان ہمارے اورینٹل کالج کے اولڈ بوائز نکلے اور بے تکلفی کی صورت نکل آئی ورنہ ہم ان اجنبیوں میں کسی مانوس اجنبی کو تلاش کرتے رہ جاتے ۔ لندن سے بخش لائلپوری اور اعجاز احمد اعجاز آئے ہوئے تھے ۔ مقامی شعرا میں یاسمین حبیب تھیں ۔ اپنے چغتائی صاحب تھے اقبال ندیم صاحب میزبانی کر رہے تھے ۔ مہمانوں میں سے ایک مبتدی سے شاعر تھے عزیر احمد ان کی کتاب کی تقریب رونمائی ہوئی ۔ جب وہ عزیر صاحب اپنا کلام سنانے لگے تو معلوم ہوا مہمان خصوصی نے ''ز'' پر نقطہ ڈال کر انہیں ''عزیز'' کر رکھا ہے ورنہ اس قابل کہاں تھے کہ صاحب کتاب ہوتے ! استاد ہی کا فیضان تھا ۔ ہماری تھوڑی سی بے تکلفی مہمان خصوصی سے تھی ۔ ہم نے کہہ بھی دیا کہ صاحب کتاب بنا دیا ہے تو شعر کہنا بھی سکھا دیتے ۔ وہ حضرت مسکرا کر چپ ہو رہے ۔ مشاعرہ کے بعد لندن سے آنے والے ایک شاعر نے ہمیں علیحدہ لے جا کر پوچھا آپ کو کتنا معاوضہ ملا ہے ؟ ہم نے کہا ہم تو نصیر شاہ صاحب کے مہمان ہیں ہمیں معاوضہ سے غرض نہیں ۔ وہ بڑے حیران ہوئے اور اپنے معاوضہ کی رقم ہمیں بتائی اور کہا کہ آپ تو دیار غیر سے آئے ہیں آپ کا معاوضہ تو کہیں زیادہ ہونا چاہیئے ۔ ہم نے ان سے کہا آپ ٹھہرے پیشہ ور شاعر ہم محض استاد ہیں شاعری کو ہیچ جانتے ہیں اس لئے معاوضہ کی خاطر مشاعرے نہیں پڑھتے محض دوستوں شاگردوں کا دل رکھنے کی غرض سے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں ۔ انہیں ہمارا فلسفہ ایک آنکھ نہیں بھایا فوراً بھاگ لئے ۔ وہ غالباً ہمارے معاوضہ کا حوالہ دے کر اپنے معاوضہ میں اضافہ کروانا چاہتے تھے ۔

اس مشاعرہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مطیع اللہ درد سے کوئی چالیس بیالیس سال کے بعد ملاقات ہوگئی اسی بازیافت کو ہم نے اپنا معاوضہ جانا ۔ وہ آدم چغتائی صاحب کی نظم کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کے لئے مجلس میں شریک ہوئے تھے ورنہ شاعر وہ کہاں تھے ۔ اپنے بزرگ صوفی عبدالقدیر نیاز کی سنت کی پیروی میں ترجمے کرنے میں لگے ہوئے تھے ۔ ہم کالج میں فرسٹ ایر میں داخل ہوئے تو پہلے سال ہی کالج کے مجلّہ المنار کی مجلس ادارت میں شامل کر دئے گئے ۔ چیف ایڈیٹر مطیع اللہ درد تھے ۔ وہ کالج سے گریجوایشن کر کے نکلے تو ایسے غائب ہوئے کہ اب چالیس برس کے بعد نظر آئے ۔ فرمانے لگے جب تم نے اپنے ایک

مضمون میں یہ لکھا تھا کہ مطیع اللہ در در خدا معلوم کہاں ہے اور کہاں نہیں تو میں نے تمہیں پیغام بھجوایا تھا کہ میں یہیں رہتا ہوں۔ ہم نے کہا جناب آپ تو اب بھی یہیں رہتے ہیں مگر ہمیں آپ کا پیغام نہیں ملا۔ ہم تو آپ کو گمشدہ چیز سمجھتے تھے آج مل گئے ہیں تو دل باغ باغ ہو رہا ہے کہ اتنی مدت کا بچھڑا ہوا دوست مل گیا دو لتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے۔

اگلے روز بریڈ فورڈ روانہ ہوئے۔ موسم ابر آلود تھا جو انگلستان والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا مگر ہم گرمیوں میں جھلسے ہوئے لوگوں کو اچھا لگتا ہے۔ پھر خدا لگتی بات ہے کہ بھیگے ہوئے موسم میں سبزے کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے اور اس موسم میں سارے یورپ پر سبزے کا راج ہوتا ہے۔ اترتی چڑھتی بل کھاتی ہوئی سڑک، ایک متوازن اور معین رفتار پر ہوا سے باتیں کرتی ہوئی بس، وہ جو ذہن پر چار گھنٹے کے سفر کا بوجھ تھا اتر گیا اور طبیعت آسودگی محسوس کرنے لگی۔ رستہ میں دو چار شعر بھی ہو گئے۔ اس طرح ہم اپنی روایت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے کہ اوّل تو مشاعرے پڑھتے نہیں پڑھیں تو ہمیشہ تازہ ترین کلام سناتے ہیں لوگوں کی طرح ایک ہی غزل کو بقول شخصے ''ری پیٹتے'' نہیں چلے جاتے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو برسوں سے ایک ہی غزل ہر مشاعرہ میں سناتے تھے جس کی زمین ہے'' فرہاد ہونا چاہیئے، ایجاد ہونا چاہیئے ''۔ وہ یہ غزل سنا رہے تھے کہ ہم نے آوازہ لگایا'' اس غزل کو صاحبِ اولاد ہونا چاہیئے''۔ سارے سامعین نے بیک آواز یہ مصرعہ اٹھا لیا اور الاپنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اب وہ اپنی غزل کی اولاد لوگوں کو سناتے ہیں اگر چہ وہ اولاد بھی اب سن بلوغ کو پہنچنے والی ہے۔ ایسی حرکت کرنے والے اپنی اس حرکت کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ مشاعرہ کے سامعین کے ذوق کا اندازہ نہیں ہوتا اس لئے ہر شاعر اپنا ایسا کلام ہی سناتا ہے جو مشاعروں میں مقبول ہو چکا ہو۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ شعراء ایک ہی چیز کے قبول عام پر قناعت کر کے کیوں بیٹھ رہتے ہیں؟ اچھا کلام خود بخود لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لے گا ہاں بعد میں فرمائش پر دہی پرانا آزمودہ کلام بھی سنایا جا سکتا ہے۔ ہمارے یار انور مسعود نے بنیان کا جانگیہ کیا بنایا اب لوگ ہر مشاعرہ میں اسی کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس کا نقصان لوگوں کو نہیں انور مسعود کو ہو رہا ہے جو اسی نظم پر رکے ہوئے ہیں نئی چیز لکھنے کی تحریک کیسے ہو؟ نہ بنیان بکتی ہے نہ سامعین کی جان چھوٹتی ہے نہ انور مسعود کے ہاں نیا مال آتا ہے۔

بریڈفورڈ جاتے ہوئے شیفیلڈ اور لورپول سے گذرے۔ چلئے دو مقامات جو مدتوں کے سنے ہوئے تھے دیکھنے میں بھی آ گئے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ہمارے اعزاز میں ہونے والے مشاعرے کے صدر محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد بھی لورپول سے تشریف لائے ہیں۔ ہم اپنی دانست میں انہیں علی گڑھ یونیورسٹی والا ڈاکٹر مختار الدین احمد سمجھے ہوئے تھے اور عند الملاقات پہلی بار ہی علی گڑھ کے ایک عزیز دوست کے بارہ میں پوچھ بیٹھے۔ وہ کچھ چہ می گنم سے ہو گئے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے تشریف نہیں لائے آپ نے خود ہی وضاحت فرما دی کہ میرا تخلص مختار ہے اور علی گڑھ والے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو تخلص کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس مشاعرہ میں اتنے لوگ آ جائیں گے۔ ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ سامعین میں کچھ ہمارے شاگرد تھے، کچھ مقامی لوگ۔ سابق لارڈ میئر جناب محمد عجیب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ آپ سٹیج پر رونق افروز ہوئے اور سیاسی سوجھ بوجھ کی باتیں کیں۔ مشاعرہ کی روداد لکھنا مقصود نہیں مگر اچھے اچھے شعر سننے میں آئے۔ بریڈفورڈ میں عزیزی باری ملک نے سیاسی اور سماجی حلقوں میں خوب جان پہچان بنا رکھی ہے۔ پہلے روز ہی ڈیلی ٹیلیگراف کے فوٹوگرافر کو اپنے استقبال کے لئے آیا ہوا پایا تو ماتھا ٹھنکا مگر دوسرے روز سن رائز ریڈیو والوں نے لائیو انٹرویو کوئی چالیس منٹ تک نشر کیا تو اندازہ ہوا کہ باری ملک نے میڈیا سے خوب تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ اردو بولنے والے حلقہ میں خاصی یکجائی ہے اور تعاون ہے اور یہ بات اردو کے حق میں اچھا شگون ہے۔ محمد عجیب صاحب نے اپنی تقریر میں تارکین وطن کے اس جذبہ کو سراہا کہ وہ لوگ ادیبوں اور شاعروں کو بلاتے اور اپنی زبان سے دلچسپی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں مگر ہم نے اپنی تقریر میں یہ سوال اٹھایا کہ اس نسل تک تو آپ اردو لکھتے بولتے پڑھتے ہیں کیا اگلی نسل بھی ایسا کر سکتی ہے؟ اپنی اگلی نسلوں کی فکر کریں۔ اردو بولنے تک تو بات حوصلہ افزا ہے مگر نئی نسل میں کتنے لوگ ہیں جو اردو لکھ اور پڑھ سکتے ہیں؟ اگر نئی نسل ایسا نہیں کرے گی تو ادب اور شعر کے ساتھ دلچسپی نہیں رہے گی اور اپنے کلچر سے رابطہ ٹوٹ ہو جائے گا۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ یورپ میں ہی نہیں برصغیر سے باہر رہنے والے سب لوگوں کا یہی مسئلہ ہے۔ سویڈن میں بھارت کے طلباء ہندی سیکھتے ہیں اس لئے ہندی اور سنسکرت کے کورسز موجود ہیں اردو کوئی نہیں پڑھتا اس لئے استاد موجود ہونے کے باوجود کوئی کورس جاری نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ''متعلقہ مضامین'' پر سیمینار

دے دے کر اپنی روزی حلال کرتے رہتے ہیں۔ برصغیر پر آٹھ سو برس تک مسلمانوں کی حکومت رہی اس لئے فارسی شاعری اور اسلامی ثقافت اور اسلامی تاریخی ہمارے دائرہ کار میں شامل ہے۔ غالب اور اقبال تو فارسی شاعری کے حوالہ سے پڑھائے جاسکتے ہیں باقی رہے نام اللہ کا۔ یہاں کی پاکستانی کمیونٹی سے رابطہ کریں تو کہتے ہیں نئی نسل نہیں پڑھنا چاہتی تو ہم کیا کریں۔ بریڈفورڈ میں ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے ہمارے سوال کا یہی جواب دیا مگر یہ بھول گئے کہ جب تک پہلی نسل اپنے ورثہ کو آگے منتقل نہیں کرے گی وہ ورثہ اور دلچسپی آگے منتقل نہیں ہوگی۔ کتنے بڑے ہیں جنہوں نے اپنے مشاغل میں سے کچھ وقت نکال کر اگلی نسل تک اپنے ورثہ کو پہنچایا؟ شاید ایک یا دو فیصد لوگ ایسے ہوں گے۔ اس کی مثال یہ بھی ہے کہ اگر آپ اپنی اولاد کو بچپن میں قرآن پڑھنا نہیں سکھائیں گے تو بڑے ہو کر وہ نہیں پڑھیں گے ورثہ کے منتقل کرنے کی بنیاد بچپن ہی میں پڑتی ہے حیف کہ یہ نکتہ لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہ جاتا ہے۔ مغربی معاشرہ میں پیدا ہو کر بڑھنے والے بچے صرف اسی صورت میں اپنے وراثتی کلچر سے منسلک رہ سکتے ہیں جس میں بڑے اپنے کلچر سے وابستگی کی بنیاد اگلی نسل کے بچپن ہی میں رکھ دیں۔ احمدیوں نے البتہ اس نکتہ کو سمجھا ہے ان کا بین الاقوامی ٹی وی ایم ٹی اے دیگر دینی پروگراموں کے ساتھ ساتھ اردو کے اسباق بھی نشر کرتا ہے۔ حضرت امام جماعت احمدیہ اردو میں خود دلچسپی لیتے اور بچوں کو، اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود، بذات خود اردو پڑھاتے ہیں اس لئے احمدیوں کے ہاں وہ خلا پیدا نہیں ہوتا جو دوسروں کے ہاں ہو رہا ہے۔ اے کاش سب لوگ اس طرف توجہ کریں دین میں ان کے مسلک کی پیروی نہیں کرتے تو دنیا کی اور اپنے کلچر کی خاطر ہی اس نیک اسوہ کو اپنا دیکھیں کہ اس میں ان کی اور ان کی آئندہ نسلوں کی بھلائی ہے۔

بریڈفورڈ میں مشاعرہ کی نظامت بریڈفورڈ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خاتون نجمہ خان کر رہی تھیں اس لئے جب ہمارے تعارف کا مرحلہ آیا تو اپنے استاد اور ہمارے شاگرد عزیزی جاوید احمد کو تعارف کروانے کی دعوت دے کر سبک دوش ہو گئیں۔ جاوید احمد نے ہمارے کہنے کے باوجود تعارف میں خاصی طول بیانی سے کام لیا حالانکہ دو چار لفظ ہی کہہ دینا کافی تھے۔ نجمہ خان کی بن آئی جب ہمیں دعوت کلام دینے لگیں تو استاد الاساتذہ کہہ کر اگلی پچھلی کسر نکال دی۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر کے یکتا ہیں؟

من آنم کہ من دانم ! تعارف سے پہلے جاوید کہنے لگا کہ آپ سے کوئی بیس برس بعد ملاقات ہو رہی ہے مجھے علم نہیں کہ اس دوران آپ کی کون کون سی کتابیں چھپ چکی ہیں اس لئے ایک مختصر سا تعارفیہ مجھے لکھ دیں۔ ہم نے کہا تو تعارف کروانا کیا ضرور ہے کہہ دو کہ بیس سال سے ان سے ملا نہیں اس لئے بیس سال پہلے کی باتیں کہہ رہا ہوں مگر وہ مصر رہے کہ اجنبی لوگوں کو بتانا ضروری ہے کہ آپ کون ہیں؟ خیر ہمیں شرارت سوجھی۔ ہم نے ایک مختصر سا خاکہ اپنے تعارف کا لکھ کر انہیں دے دیا کہ کہاں رہے کہاں نہیں رہے۔ کیا کیا' کیا نہیں کیا۔ ایک فقرہ ہم نے آخر میں لکھا کہ ''الحمد للہ کہ ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔'' جاوید بڑے خوش ہوئے اور اسی کاغذ کو لے کر تعارف کروانے کھڑے ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس فقرہ تک پہنچ گئے۔ پڑھا ''الحمد للہ کہ ابھی تک۔۔۔'' یکدم ٹھٹکے مگر آدمی ذہین ہیں بات بنا لی کہ ابھی تک ادب کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ تعارف کروا کے بیٹھے تو پسینے میں شرابور تھے۔ بعد میں کہنے لگے آپ نے مروا دیا تھا فقرہ پڑھ کر مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا مگر اللہ نے خیر کی کہ وقت پر بات سوجھ گئی اور میں سرخرو ہو گیا۔ ہم نے کہا میاں اگر ہمیں سے ہمارا تعارف لکھواؤ گے تو ایسا ہی ہوگا۔

اگلے روز ریڈیو والوں نے انٹرویو کے لئے بلایا۔ چالیس منٹ تک لائیو انٹرویو نشر ہوتا رہا۔ انٹرویو کرنے والے ہماری ادبی اور ثقافتی تاریخ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ بزرگ آدمی تھے نام ذہن سے اتر گیا ہے مگر تراسی برس کی عمر میں بھی حافظہ چاق چوبند تھا۔ ہمارے سالک و مہر کے شناسا اور ان کی باتیں کرنے والے۔ گفتگو کرتے کرتے پنجابی پر آ گئے۔ ہم نے بھی پنجابی کا دامن پکڑ لیا۔ چنانچہ یہ انٹرویو بائی لنگویل (دوزبانی) ہو گیا۔

بائی لنگویل سے بات ٹورنٹو تک جا پہنچی۔ دو برس پہلے وہاں کی جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کا موقع ملا۔ وہاں کی روایت ہے کہ ہر مقرر بائی لنگویل تقریر کرتا ہے۔ اردو میں بولے تو ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ خود ہی کرتا ہے یعنی آدھا وقت ایک زبان آدھا وقت دوسری زبان اسی ڈگر پر جلسہ کی کاروائی چل رہی تھی کہ ہمارے ایک بے تکلف دوست مولانا کی باری آ گئی۔ مولانا نے فراٹے سے اپنی انگریزی میں تقریر فرمائی اور چپکے سے بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب ہی ایک دوست بیٹھے تھے فرمانے لگے مولانا نے بائی لنگویل تقریر نہیں کی، صرف انگریزی میں تقریر کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ہم نے جواب دیا آپ کو غلط فہمی

ہوئی ہے مولانا نے بائی لنگویل تقریر فرمائی ہے۔ کہنے لگے وہ کیسے؟ ہم نے جواب دیا ایسے کہ مولانا نے ''ٹھیٹھ پنجابی'' میں انگریزی ارشاد فرمائی ہے۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو احمدیہ مشن ہاؤس میں حاضری دی اور پھر لنڈن کا رخ کیا کہ انگلستان آئے ہیں تو ایک جمعہ مسجد فضل میں پڑھ لیں کیونکہ اگلے روز جرمنی پہنچنا ہے۔ جمعہ کے بعد عزیزی مرزا لقمان احمد نے پکڑ لیا کہ شام میرے ساتھ گذاریں۔ ہم نے اس عزیز کو سمجھایا کہ شام کو ایک عزیز بچی کی رخصتی ہے ہم لنڈن میں ہو کر بھی اس میں شریک نہ ہوئے تو ''شریک'' باتیں بنائیں گے اس لئے آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھنا ہے ابھی اس سے سبک دوش ہو جائیں۔ چنانچہ ہم مرزا لقمان احمد کے ہاں جانے کی بجائے گیسٹ ہاؤس میں رفیق روزی کے ہاں جا بیٹھے اور مرزا لقمان احمد سے اس کے ابا، حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نور اللہ مرقدہ، کے کالج کے سنہری زمانہ کو یاد کرتے رہے اور ان مشاعروں کو بھی جن کا ذکر میں نے ''ثاقب زیروی کے ساتھ ساتھ والے'' مضمون میں لاہور میں کیا تھا۔ کالج کا ذکر ہو اور سننے والے کالج کے پرانے طالب علم ہوں تو وقت پر لگا کر اڑتا ہے۔ چنانچہ وہی ہوا ہوش اس وقت آئی جب شادی میں شرکت کا وقت عین سر پر آ گیا۔ عزیزی وسیم چوہدری نے ہمیں اپنی گاڑی میں ہمارے میزبانوں کے ہاں پہنچایا اور ہم وقت پر رخصتی کی تقریب میں شریک ہو گئے۔ اللہ وسیم کو جزائے خیر دے۔

لنڈن میں ہمارا قیام ہمیشہ ہی لالہ جی عبد الکریم کے ہاں ہوتا ہے مگر اب کے اتنا کم تھا کہ کسی کی دعوت قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ہاں خالد اختر کا کہا کیسے ٹالتے کہ انہوں نے ناشتہ میں پائے کھلانے کا وعدہ کیا۔ جب سے دل کی تکلیف اور ڈاکٹروں کی طرف سے پائے کھانے کی ممانعت ہوئی ہے پائے کھانے کو ٹوٹ کر جی چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسی ترغیب ہو تو ہم کیسے انکار کر دیتے۔ البتہ یہ شرط لگائی کہ پائے کھلانے کے بعد انہیں ہمیں ہیتھرو ائر پورٹ تک بھی بروقت پہنچانا ہوگا۔ چنانچہ صبح ''پایوں'' سے ''شرف تلذذ'' حاصل کرنے کے بعد سیدھے ہوائی اڈہ پر پہنچے۔ خالد نے ہوائی اڈہ پر پہنچانے میں بڑی عجلت دکھائی۔ یہی سوچا ہوگا کہ اگر پائے کھا کر اس شخص کو ہائی کولیسٹرول کی پیچیدگیوں کا شکار ہونا ہی ہے تو دوسرے ملک میں جا کر ہو۔ ہم دوپہر کے وقت بخیریت فرینکفرٹ پہنچے اور اب تک اللہ کے فضل سے توانا اور تنا نٹے ہیں۔ اب بھی داؤ لگے تو ''پاؤوں'' سے دو دو ہاتھ کرنے سے نہیں چوکتے!

فرینکفرٹ میں اتوار کے روز دو بجے دوپہر تقریب تھی جس کے پروگرام میں کھانا بھی شامل تھا۔ ہم نے جانا رات کا کھانا ہوگا کیونکہ دو بجے دوپہر کا کھانا کون کھاتا ہے؟ اس لئے گھر سے کھانا وانا کھا کر اطمینان سے ہال میں پہنچے تو معلوم ہوا وہ لوگ کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا بھلے لوگو بسم اللہ کرو کیوں ہم جیسے ذیابیطس کے ماروں کے لئے اپنے کھانے کا خون کرتے ہو؟ ہمارے تو کھانے کے اوقات ہی نرالے ہیں۔ گھر میں بھی جب ہم ناشتہ کر رہے ہوتے ہیں سارا گھر خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ بھلا یورپ میں صبح پانچ بجے کوئی ناشتہ کیا کرتا ہے؟ دوپہر کا کھانا ہم نے عین چھ یا حد سات گھنٹے بعد کھا لیتے ہیں وہ وقت بھی شرفا کے کھانے کا نہیں ہوتا۔ علی ہذ القیاس۔ بہر حال لوگ کھانے سے فارغ ہو کر جماہیاں لیتے اور ''ڈکارتے'' ہوئے ہال میں پھر جمع ہوئے اور اجلاس شروع ہوا۔

میاں عبدالسمیع نون صاحب سرگودھا سے ''ٹوپیءصدارت'' کے طور پر پھندنے والی سرخ رومی ٹوپی پہن کر تشریف لائے تھے۔ چوہدری سر ظفر اللہ خاں کے بعد ہم نے مدتوں بعد کسی کو ویسی ٹوپی پہنے دیکھا مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ ہمارا خیال ہے چوہدری صاحب کے بعد دنیا سے اس ٹوپی کا رواج ہی اٹھ گیا۔ اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے! صاحب صدر نے اپنا خطبہءصدارت پہلی فرصت ہی میں ارشاد فرما دیا کہ خدا معلوم لوگ مجلس کے آخر تک بیٹھیں گے بھی یا نہیں؟ خطبہءصدارت کے بعد ادیب شہیر بھائی مسعود احمد خاں دہلوی نے ٹھیٹھ دلی کی بامحاورہ زبان میں اپنا مقالہ ارشاد فرمایا جو ادیبوں کی ذمہ داریوں کے موضوع پر تھا۔ بھائی مسعود احمد خاں دہلوی دلی والوں کی آخری یادگار کے طور پر رہ گئے ہیں۔ ان جیسی زبان کون لکھے گا؟ اشرف صبوحی نہ رہے، شاہد احمد دہلوی نہ رہے۔ اب لے دے کے شان الحق حقی رہ گئے ہیں یا بھائی مسعود احمد خاں دہلوی اللہ انہیں سلامت رکھے۔ ان کی زبان کا چٹخارہ! سبحان اللہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!!

اجلاس شروع ہونے سے پہلے عزیزی عرفان احمد خاں نے کہ مجلس کے میزبان تھے ہمیں پوچھا آپ کا لیکچر کتنی دیر کا ہے؟ ہم نے کہا میاں جتنا وقت تمہارے پاس ہے اس کے مطابق کمی بیشی کی جا سکتی ہے کوئی لکھا ہوا مقالہ تو ہے نہیں۔ چنانچہ کہنے لگے آپ کلاس لیکچر دیجئے۔ مطلب یہ تھا چالیس منٹ بولئے۔ اور ہم نے اللہ کے فضل سے اپنا لیکچر ختم کیا تو عین انتالیس منٹ اور ساٹھ سیکنڈ ہوئے تھے۔ لیکچر کیا تھا جدید

شعرا کا مختصر تعارف اور ان کے اشعار ہی تھے جو لوگ سنتے اور سر دھنتے رہے کہ ان لوگوں کا نام سنا نہ کلام کہیں پڑھا مگر شعر کس بلا کے ہیں! ہم نے انہیں صرف یہ بتایا کہ جماعت احمدیہ اس باب میں کسی سے ہیٹی نہیں فرق صرف یہ ہے کہ ہم لوگ عام ادبی محاذوں پر ''محاذ آرائی'' سے دور رہ کر اپنا کام کئے جاتے ہیں!

اس کے بعد مشاعرہ ہوا۔ یہ تو میزبان کا فرض تھا کہ شعرا کو وقت کا بتا دیتے کہ ایک معین وقت کے بعد ہال خالی کرنا ضروری ہے نہ بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں پڑھنے والے شعرا کو گلہ ہوا کہ ہمیں کماحقہ سنا نہ گیا حالانکہ کسی شاعر نے بھی تین غزلوں سے کم شعر نہیں سنائے تھے۔ اگر چہ ہم ذاتی طور پر بہت خوش ہوئے کہ زیادہ شعر سنانے سے بچ گئے کہ ایک سے زیادہ غزلیں سنانا ویسے ہی طبیعت پر گراں گذرتا ہے۔ خدا جانے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو سٹیج پر آجائیں تو جانا پسند نہیں فرماتے۔ ہمیں یاد ہے ہم نے ایک مشاعرہ میں شعرا کی کثیر تعداد کے پیش نظر میزبان ہونے کے ناطے یہ پابندی لگا دی کہ کوئی صاحب ایک نظم یا غزل سے زیادہ نہ سنائیں۔ ہمارے ایک دوست نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ صرف ایک غزل ارشاد فرمائی جس میں بلا مبالغہ ستر شعر تھے۔ ہال یہاں بھی ''کھچا کھچ'' بھرا ہوا تھا مگر آدھا حصہ بالکل خالی تھا۔ اس شتر گربہ کا مطلب یہ ہے کہ خواتین نے اپنے والے آدھے حصہ کو پر کرنے کی بجائے پچھلی سیٹوں پر دبک کر بیٹھنے اور اپنے ''کھسر پھسر کرنے کے نسائی حقوق'' کو محفوظ رکھنے کو ترجیح دی۔ اس نسائی حصے میں بزرگ شاعر جناب غلام محی الدین صادق اپنی چھتنار ریش مبارک سمیت اکیلے ہی پر کر کے بیٹھے رہے اور حق بھی یہی ہے کہ وہ حصہ ان کی بھرواں ریش مبارک کی وجہ سے بھرا بھرا نظر آتا رہا۔ منتظمین ان کے عصائے پیری سے ڈرتے رہے اور انہیں یہ کہنے کی جرات نہ کر سکے کہ حضرت یہ حصہ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔

ان کے عصائے پیری سے یاد آیا کہ اپسالا یونیورسٹی میں ہمارے فارسی کے ایک بزرگ رفیق کار جن کا خاندانی نام ''جواں مردی'' ہے ایک بار گر کر پاؤں کی ہڈی تڑوا بیٹھے۔ کچھ عرصہ کے بعد یونیورسٹی تشریف لائے تو ایک ہاتھ میں عصا تھا دوسرا ہاتھ اپنی اہلیہ خانم جواں مردی کے کاندھے پر رکھے ہوئے تھے۔ سٹاف روم میں داخل ہوئے تو ہم نے کہا ''سبحان اللہ آپ کے ایک ہاتھ میں عصائے پیری ہے اور دوسرا ہاتھ آپ نے عصائے جواں مردی پر رکھا ہوا ہے''۔ سب لوگ ہنسنے لگے پروفیسر صاحب نے فرمایا ''میں

نے اپنے خاندانی نام کا اس سے بہتر ''سجع'' پہلے نہیں سنا'' یہاں بھی جناب غلام محی الدین صادق صاحب کی وجہ سے وہ خالی حصہ ''سجا'' ہوا تھا۔

اس فرض سے ادا ہو جانے کے بعد ہمارے پاس فرینکفرٹ میں اور کوئی کام کرنے کا نہیں تھا۔ اپنے پوتے شاہد منصور اور اس کی نئی نویلی دلہن سے فون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ انس اور اس کی بیوی پہلے ہی آ کر ہمیں مل چکے تھے۔ اس لئے ہم نے معاذ اللہ کو فون کیا کہ ہم فارغ ہیں آ جاؤ۔ معاذ اللہ بھٹی ہمارا چہیتا شاگرد ہے۔ سکھیکی کے قریب کا بڑا زمیندار مگر گردش روزگار کہ اب یہاں جرمنی میں آیا بیٹھا ہے وہ جرمنی اور سویٹزرلینڈ کی سرحد پر واقع شہر فرائی برگ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا وہ پہلی فرصت میں آ گیا اور ہم نے رخت سفر باندھا۔ آٹو باہن پر دوڑتے بھاگتے کوئی تین چار گھنٹوں میں فرائی برگ پہنچے۔ اس کے چھوٹے بھائی کے ہاں جھانکا۔ وہ عزیز بھی ہمارا شاگرد ہے۔ پھر معاذ اللہ کے گاؤں پہنچے۔ مدتوں کا کیا ہوا وعدہ پورا ہو گیا۔ معاذ اللہ پاکستان میں جب کبھی ہمیں سکھیکی سے گزرتے ہوئے دیکھتا اصرار کرتا کہ میرے گاؤں چلیں۔ ہم عدیم الفرصت ہونے کا بہانہ کر کے آئندہ آنے کا وعدہ کر لیتے۔ چنانچہ ہم نے گاؤں پہنچتے ہی اسے کہا لو بھئی ہمارا وعدہ پورا ہو گیا ہم تمہارے گاؤں آ گئے ہیں۔ واقعی گاؤں، کھیتوں اور انگور کے باغوں کے درمیان مختصر سی آبادی، صاف ستھری، آلائشوں سے مبرا۔ اس کی بیوی ہمارے ایک اور شاگرد ڈاکٹر عبدالخالق مانگٹ کی بہن نکلی دوہرا رشتہ ہو گیا۔ ساجدہ پروین نے ہماری خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اللہ اس کو جزائے جزیل دے۔

میاں بیوی نے اپنا ماسٹر بیڈ روم ہمارے لئے خالی کر دیا اور ہم چار دن اور چار راتیں اس پر قابض رہے۔ کھانے میں بٹیر کا گوشت، مکئی کی روٹی، سرسوں کا گندلوں والا ساگ، ہر نعمت ملتی رہی جو شہروں میں نہیں ملتی۔ بالکل ایسے لگتا تھا کوٹ مراد میں زمیندار معاذ اللہ بھٹی کے ہاں بیٹھے ہیں۔ جس روز گئے تھے اس روز تو کسی اور جگہ جانے کی گنجائش نہیں تھی ورنہ ہم اتنے ''مائل بہ سیر'' تھے کہ سیر پر چل پڑتے تو بعید نہ تھا۔ کچھ معاذ اللہ آتے ہوئے ایک طرف اشارہ کرتا تو کہتا بس اس پہاڑی کے پیچھے سوئٹزرلینڈ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور فرانس تو انگوروں کے اس باغ کے عقب میں دھرا رکھا ہے وہ سامنے جو اونچی پہاڑی نظر آ رہی ہے وہ آسٹریا کا علاقہ ہے۔ ہم رات کو سوئے تو انہیں ملکوں کے خواب دیکھتے رہے۔

اگلے روز صبح سویرے یورپ کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ بازل کے راستے سویٹزرلینڈ میں داخل ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو بے پناہ قدرتی حسن عطا کر رکھا ہے۔ سکینڈے نیویا بھی کوئی کم خوبصورت نہیں مگر سویٹزرلینڈ اور آسٹریا کا حسن حسنِ بے پرواہ ہے اور بے محابا مگر ان لوگوں نے قبلہ شیخ منظور الٰہی کے قول کے مطابق حسنِ فطرت کو تسخیر کر رکھا ہے یعنی پانی ہے تو قابو میں ہے، پہاڑ ہیں تو ان کے نیچے سے سرنگیں بنا کر فاصلے کم کر رکھے ہیں۔ اگر چہ ان پہاڑوں کے اوپر سے گزرنا ہوتا تو فطرت کے اور حسین مناظر دیکھنے کو ملتے۔ بازل شہر میں تھوڑی دیر رکے۔ گاڑی ایک جگہ پارک کی۔ شہر کے وسط میں گھومنے پھرنے کا ارادہ کیا مگر دیکھا کہ ایک طرف جائیں تو اتار ہی اتار ہے۔ ظاہر ہے واپس آتے ہوئے وہی اتار چڑھائی میں بدل جائے گا تو کیا ہوگا؟ ہمیں دل کی بیماری کے ہاتھوں ہر وہ کام کرنا منع ہے، جس میں سانس چڑھنے کا اندیشہ ہو کیونکہ سانس چڑھے تو اس کے اکھڑنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ بھاگ سکتے ہیں نہ سیڑھیاں چڑھ سکتے ہیں نہ سویٹزرلینڈ کے شہروں میں پا پیادہ سیر کر سکتے ہیں۔ اس لئے پتھر کو بھاری جانا چوم کر چھوڑ دیا حالانکہ شہر بہت خوبصورت تھا ۔ جوانی میں آئے ہوتے تو شہر گردی کا لطف اٹھاتے۔ ناچار پھر ہائی وے پر پہنچ گئے اور آگے کا رخ کیا۔ پروگرام تھا کہ ایلپس کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کریں گے۔ سڑک پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی چلی جاتی ہے اور اونچے نیچے پہاڑوں کا سبزہ ء بیگانہ، جھیلوں میں منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔ یکا یک سامنے ایک فلک بوس پہاڑ آ جاتا، سڑک اس کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے گویا راستہ تلاش کر رہی ہے پھر زن سے ایک لمبی سرنگ میں داخل ہو جاتی۔ عام سرنگیں پانچ پانچ چھ چھ کلومیٹر لمبی تھیں اور چھوٹی سرنگوں کا تو حساب نہیں۔ مگر ہمیں سرنگوں اور پہاڑوں کے ساتھ سڑک کی آنکھ مچولی اچھی لگی حتیٰ کہ ہم ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں سوئے ہوئے شہر فلیومسر برگ پہنچے۔ دریا جو ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا اسے عبور کیا، شہر میں داخل ہوئے اور پھر اللہ دے اور بندہ لے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی۔ بل کھاتی ہوئی صاف ستھری سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ نیچے فلیومسر برگ کا شہر کھلونا سا دکھائی دینے لگا۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر گھاس کے قطعے تھے مگر لگتا تھا انہیں بھی باقاعدہ تراش کر ہموار کیا گیا ہے۔ واقعی یہ لوگ حسن فطرت کو تسخیر کرنے کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔ اوپر پہلی چوٹی پر پہنچے تو ایک ہوٹل تھا ''میٹ وائس'' جو ٹورسٹوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔ انفرمیشن والوں

سے پوچھا تو معلوم ہوا ایک دن کا کرایہ کوئی ہزار ڈالر کے قریب ہے۔ توبہ توبہ! یہ کون لوگ ہیں جو ٹھہرے ہوئے ہیں؟ سب کے سب کروڑ پتی تو ہو نہیں سکتے مگر حسن ذوق کے لحاظ سے کروڑ پتی ضرور تھے۔ رک کر، تھم کر، دم لے کر، قدرت کے حسن کی داد دینا جانتے تھے۔ ہماری طرح عجلت اور غریب الوطنی کے مارے ہوئے نہیں تھے۔ آگے گئے تو لوگوں کے جھنڈ کے جھنڈ پہاڑ پر ہائیکنگ کرتے نظر آئے۔ پیادہ پا چل کر حسن فطرت سے لطف اندوز ہونے والے ہاتھوں میں ہائیکنگ والی چھڑیاں، پاؤں میں مناسب جوتے یا جوگر، کاندھوں پر تھرموس میں پانی یا کافی۔ ہم ہوتے ہوتے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سے آگے ہائیکنگ والوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ آگے سر بفلک چوٹی تک جانے کے لئے چیئر لفٹ ہے۔ ہمیں کیبل رائڈ کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا خود ڈرائیو کر کے پہاڑ کے دوسری طرف جا پہنچنے کا۔ چنانچہ کچھ دیر کے لوگوں کو واپس اپنی اپنی بسوں کوچوں میں بیٹھتے دیکھا اور سفر کی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ سردیوں میں یہ سارا علاقہ ایک عظیم الشان گلیشیئر بن جاتا ہے۔ پہاڑی سے اترتے ہوئے حسن کا نیا پہلو آیا۔ وہی رفتہ رفتہ قریب ہوتی ہوئی چوٹی اب ہوتے ہوتے دور اور اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم پھر ہائی وے پر آ گئے اور اگلی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ پہاڑ، سبزہ، پانی اور تہ بہ تہ ہوتی ہوئی ڈھلوانوں پر انگور کے باغات، ہزار بادہء ناخوردہ در رگِ تاک است!

ایلپس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک مقام پر ''لی سٹن ٹائن'' کا نشان ملا معلوم ہوا یہ منی سی ریاست یعنی پرنسی پیلیٹی ہے جیسی فرانس میں مناکو ہے۔ اس کے دارالحکومت ''وادوز'' میں پہنچے۔ ایک بس سٹاپ پر رک کر کچھ معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو ایک نوجوان ملا۔ اس نے بتایا کہ یہ پرنسپیلیٹی رقبہ کے لحاظ سے کوئی زیادہ بڑی نہیں مگر امیر پرنسپیلیٹی ہے۔ دنیا کے لوگ اپنی دولت ہمارے پاس امانت رکھواتے ہیں اور ہم امین لوگ ہیں۔ اس نوجوان نے ایک مبلغ کے جذبہ سے ہمیں اپنے وطن کے بارہ میں معلومات بہم پہنچائیں۔ سکریٹریٹ ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا جو ہمارے لاہور کی فری میسن ہال جتنی ہو گی۔ بنکوں کی البتہ بھرمار تھی۔ وادوز پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑ بھی ایسا عمودی طور پر بلند ہوتا ہوا کہ چوٹی کو دیکھنے کے لئے دستار تھامنا پڑے۔ عمودی پہاڑ کے اوپر ایک مخروطی چوٹی پر حکمران جوڑے کا قلعہ ہے۔ میاں، بیوی، ہز ہائی نس آدم ثانی اور ان کی بیگم ہر ہائی نس ماری، دنیا میں زیادہ مشہور و معروف تو نہیں لیکن

لوگوں میں مقبول و محبوب ہیں۔ ہم نے مشکل سوس نام اپنی اور قارئین کی آسانی کے لئے مختصر کر کے لکھ دیئے ہیں یہ آدم اور ان کی حوا پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے اپنی رعایا کو دیکھتے رہتے ہوں گے۔ صاف ستھرا شہر ہے۔ ٹورسٹوں کا ازدحام رہتا ہے۔ اس ملک کا اپنا دستور ہے، اسمبلی ہے، جمہوریت ہے، بادشاہ سلامت آئینی حکمران ہیں۔ دولت کی ریل پیل ہے۔ راوی چین لکھتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ سویٹزرلینڈ میں دنیا کی آدھی جائز و ناجائز دولت چھپی ہوئی ہے اس آدھی میں لی سٹن ٹائن کو برابر کا شریک جانئے۔ ابھی پچھلے دنوں جرمنی کے سابق چانسلر ہیلمیٹ کوہل صاحب پر الزام تھا کہ آپ نے اپنی پارٹی کے لئے کوئی خفیہ فنڈ اکٹھا کیا تھا وہ سویٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع ہے۔ سویٹزرلینڈ والوں نے کہا ہاں ہے مگر آپ کو اس سے کیا؟ کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ ملین مارک کی وہ رقم اپنے اکاؤنٹ سے غائب ہے۔ پھر معلوم ہوا غائب نہیں ہوئی تھوڑا سا سفر کر کے لی سٹن ٹائن تک پہنچ گئی ہے اور لی سٹن ٹائن کے ساتھ جرمنی والوں کا کوئی ایسا معاہدہ نہیں کہ وہ اس رقم کا حساب مانگ سکیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ ایسی ہی خبریں پاکستان کے بعض سیاست دانوں کی دولت کے بارہ میں بھی تھیں۔ کوئی اخباری نمائندہ ہمیں پاکستانی لباس میں چلتا پھرتا دیکھ کر یہ خبر بھی اڑا سکتا تھا کہ اس نے بچشم خود پاکستانی ''سیاست دانوں'' کو لی سٹن ٹائن کی سیر کرتے دیکھا ہے مگر لمبے اکاؤنٹ رکھنے والے یوں چہل قدمیاں تھوڑے ہی کیا کرتے ہیں۔ ہم نے بازل میں ایک عرب شہری کو فرلانگ بھر لمبی لیموزین میں بینک کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ ان کی لیموزین کے پارک ہو جانے اور ان کے قدم رنجہ فرما کر دفاتر میں غائب ہو جانے تک باقی تمام کاریں پارکنگ کے باہر انتظار کرتی رہیں۔ ہمارے بھی دس منٹ اس انتظار میں ضائع ہوئے تھے مگر ہمارے دس منٹوں کا عرب کے پٹروڈالر سے کیا مقابلہ؟

''لی سٹن ٹائن'' کی پرنسپیلیٹی دیکھ کر ہمیں اپنے برطانوی ہند کی ریاستیں یاد آئیں جن میں سے ہر ایک اپنے زعم میں خود مختار تھی اور ان کے حکمران دولت و ثروت کے صید زبوں تھے اور سوائے اسے ضائع کرنے کے اور کوئی مشغلہ نہیں رکھتے تھے نظام کی ریاست حیدر آباد ریاستوں میں سب سے بڑی تھی۔ جوش صاحب نے لکھا ''وہ عُجب اور خود پسندی میں اتنے بڑے تھے کہ بندے نہیں خدا معلوم ہوتے تھے'' مگر ہم نے یورپ کی اس خود مختار ریاست کے حکمرانوں کے اخلاق کے بارہ میں رعایا کو رطب اللسان پایا۔ ان کی

تصویر بھی دیکھی ۔ نہایت شریف میاں بیوی لگتے ہیں ۔ مسکین صورت لوگ ہیں اور انسان لگتے ہیں ۔ ان لوگوں نے رعایا کو یورپ کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچا رکھی ہے ۔ لوگ تھوڑے ہیں مگر مطمئن اور مسرور ہیں ۔ وادوز ایک چھوٹا سا شہر ہے مگر اس میں چار مختلف فرقوں کے گرجے نظر آئے ۔ آزاد خیال اور کشادہ دل لوگ لگتے ہیں ۔ ہمارا قیام وادوز میں زیادہ نہیں رہا مگر ہم پہاڑ کے اوپر بادشاہ سلامت کے محل تک ضرور گئے ۔ کوئی پہرہ وہرہ بھی نہیں تھا ۔ عام سا گھر لگتا تھا ۔ ہر چند قلعہ تھا مگر قلعوں والی قدامت کے سوا اور کوئی چیز اس میں ہیبت والی نہیں تھی ۔ ساز و سامان بھی ایک عام متوسط خاندان کے سامان جیسا لگتا تھا ۔ معاذ اللہ کہنے لگا ہم یہاں کیوں نہ آ گئے ؟ خواہ مخواہ جرمنی کے سمندر میں گم ہو گئے ہیں ۔ یہاں کم از کم اپنی انفرادیت تو قائم رہتی ۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں --- الخ ! "لی سٹن ٹائن" کی یہ ریاست آسٹریا اور سویٹزرلینڈ میں گھری ہوئی ہے ۔ معاذ اللہ کو اس بات پر حیرت ہوتی رہی کہ جنگ میں جرمنی نے اس پر قبضہ کیوں نہ کر لیا ؟ ہمارا خیال ہے اتنی منی سی ریاست کو ہڑپ کر جانے کو ان لوگوں نے اپنی ہتک جانا ہوگا ۔ اس ریاست کی ساری آمدنی دودھ ، دہی اور پنیر کی برآمد پر ہے ۔ مصنوعات کے نمونے دیکھے تو گایوں کے گلے میں باندھی جانے والی گھنٹیوں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہ آئی یا ایک دو بگل تھے وہی ، سینگوں کے بنے ہوئے بگل ، جو چرواہے اپنے جانوروں کو اکٹھا کرنے کے لئے پھونکتے ہیں ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ سرسبز و شاداب علاقہ پہاڑوں ، وادیوں ، دریاؤں سے بھرا پڑا ہے ۔ سارا ملک ایک چراگاہ معلوم ہوتا ہے ۔ سردیوں میں برف سے ڈھک جاتا ہے تو لوگ گاڑیوں کو تج کے گیراجوں میں بند کر دیتے ہیں اور سلیج (برف پر کھینچنے والے تختے) پکڑ لیتے ہیں ۔ زندگی کا کاروبار چلتا رہتا ہے یہ لوگ اپنے آپ کو "چھٹیاں گزارنے کا ملک" کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں ۔

واپسی پر ہم نے ہائی وے چھوڑ کر عام سڑک لے لی تا کہ آسٹریا کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سمندر نما سلوش سی نامی جھیل کے کنارے کنارے چلیں اور جرمنی کے بلیک فارسٹ کا کچھ حصہ جس میں جھیل ٹی ٹسی شامل ہے دیکھ سکیں ۔ اس سفر میں فاصلہ کچھ بڑھ گیا مگر بلیک فارسٹ میں جھیل ٹی ٹسی کے کنارے رکے تو یوں لگتا تھا جیسے خوابوں کے کسی ملک میں آ گئے ہیں ۔ جھیل کے کنارے منا سا شہر آباد ہے ۔ دنیا بھر کے ٹورسٹوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے ۔ سنا ہے برسوں پہلے ہوٹلوں کی بکنگ ہو جاتی

ہے۔ہم پہنچے تو شام کا جھٹ پٹا ہو چکا تھا اس لئے ماحول اور بھی خواب گوں بن گیا۔ کچھ دیر وہاں رکے۔ ان رنگوں کو آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کی جو دور اوپر جنگل کے گھنے درختوں کی چوٹیوں پر ڈوبتے سورج کے دھنک رنگوں میں بنتے بگڑتے دکھائی دے رہے تھے اور نیچے جھیل کے گہرے پانی میں ان کا عکس اپنا جادو جگا رہا تھا۔ کسی نے کیا خوبصورت بات کہہ رکھی ہے کہ نقاشِ فطرت سے بڑا رنگوں کا جادوگر اور کوئی نہیں۔

ہم ٹی ٹسی سے واپس چلے تو لمبے سفر کی تکان اپنا اثر دکھانا شروع کر چکی تھی مگر اونچے سر بفلک پہاڑوں کے درمیان بے حیثیت چیونٹی جیسی سڑک رینگتی جا رہی تھی۔ ایسے سر بفلک پہاڑوں کے درمیان بے حیثیت اور حقیر سڑک کا ایک نظارہ ہم نے وینکوور کے راکیز کے سفر کے دوران دیکھا تھا۔ دونوں جانب پر ہیبت پہاڑ اور درمیان میں گھری ہوئی حقیر سڑک جو پہاڑ کے اوپر سے یقیناً محض سیاہ لکیر دکھائی دیتی ہوگی۔ بلیک فارسٹ میں بھی کچھ دور تک سڑک کا یہی عالم رہا پھر جیسے پہاڑوں کی ہیبت نے راستہ چھوڑ دیا اور ہم واپس اس زمین پر دوڑنے لگے۔ بلیک فارسٹ جرمنی کا قابل دید حصہ ہے جسے جرمنوں نے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ اونچے پہاڑ سر بفلک دیو ہیکل درخت، جھیلیں اور پہاڑوں کے ساتھ ساتھ اور کہیں کہیں پہاڑوں کے اندر سرنگوں میں دوڑتی ہوئی ریلیں عجیب نظارہ ہے۔ اللہ نے چاہا تو پھر کبھی صرف اس علاقہ کی سیاحت کے لئے آئیں گے۔

واپس گھر پہنچے تو تھک کر چور تھے۔ معاذ اللہ اگلے روز کسی اور جگہ سیر کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ہم نے کہا میاں توقف کرو۔ ایک دن آرام کریں گے پھر فرانس کا رخ کریں گے۔ فرانس میں بھی سٹراسبرگ کا جہاں ان لوگوں نے یورپ کا نیا دارالحکومت بنا رکھا ہے۔ یورپ کی اسمبلی، یورپ کا سیکریٹیریٹ وغیرہ۔ اگرچہ متحدہ یورپ کاغذوں پر وجود میں آچکا ہے مگر بعض ممالک ابھی تک یورپ کی ایک کرنسی اور ایک حکومت میں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً ہمارے پاس جو پاسپورٹ ہے اسے یوروپین پاسپورٹ کہتے ہیں۔ ہم یورپ میں کہیں بھی سفر کریں تو ایسے ہی ہے جیسے ہم اپنے ملک کے اندر سفر کر رہے ہیں مگر کرنسی مختلف ہے، کرنسی کی قدر بھی مختلف ہے۔ انگلستان بھی ابھی تک یورپ کی متحدہ کرنسی میں شامل نہیں۔ اسی طرح یورپ کے ایک ملک کا یوروپین ویزا سویڈن، برطانیہ جیسے ملکوں میں کارآمد نہیں۔ ان ملکوں کا علیحدہ ویزہ لینا پڑتا ہے۔

یورپ کی کرنسی جسے ایکو کہتے تھے اب ''یورو'' کہتے ہیں ابھی پوری طرح رائج نہیں ہوئی۔ ہم نے امتحان کے طور پر کچھ کرونز تبدیل کروائے کہ دیکھیں جرمنی یا انگلستان میں کام آتے ہیں یا نہیں۔ کام نہیں آئے۔ یہ بھی محض تکلف تھا ورنہ ہم نے جرمنی سویٹزرلینڈ کے سفروں کے دوران جرمن مارک یا سوس مارک کی شکل تک نہیں دیکھی۔ ہمارے میزبان ہی ہمارے متکفل ہوتے رہے۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

ایک دن کا وقفہ دے کر فرانس کی طرف چلے۔ یورو پارک تو ہمارے رستہ میں تھا کیونکہ معاذ اللہ نے ہائی وے کی بجائے عام سڑک سے سفر کرنا پسند کیا تھا۔ دریائے رائن جو کسی مقام پر آسٹریا اور سویٹزرلینڈ کے درمیان سرحد بن جاتا ہے کسی مقام پر جرمنی اور فرانس کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے، آڑے آیا مگر ہم زن سے اس پل کو طے کر گئے۔ لیجئے فرانس شروع ہو گیا۔ وہی علاقہ جہاں سے جرمنی نے فرانس پر قبضہ کرنے کی طرح ڈالی تھی۔ تحدیثِ نعمت میں ایک جگہ چوہدری صاحب نے لکھا ہے کہ وہ ''جنگ کے بعد میدان جنگ دیکھنے گئے مگر میدان جنگ زیر کاشت تھا''۔ ہم نے بھی وہی عالم دیکھا۔ ہر طرف مکئی کی فصل کھڑی تھی۔ لمبا میدانی علاقہ ہے۔ حد نگاہ تک کھیت نظر آئے اور ان کھیتوں میں اکا دکا چھوٹی چھوٹی آبادیاں۔ ایک گاؤں میں بھی جھانکا۔ جنگ کے زمانہ کی ایک تباہ شدہ عمارت کو گاؤں والوں نے محفوظ کر رکھا ہے۔ اچانک ہمیں خیال آیا کہ ابھی پچھلے دنوں ہم نے ایک برطانوی جرنیل جنرل سرجان ہیکٹ کی ایک کتاب پڑھی ہے ''میں اجنبی تھا''۔ یہ صاحب برٹش پیراٹروپ بریگیڈ کے بریگیڈیئر تھے اور جنگ کے آخری زمانہ میں دشمن کی صفوں کے پیچھے اپنے چھاتہ بردار اتارتے ہوئے طیارہ کے زخمی ہو جانے کے بعد خود بھی زخمی ہو گئے تھے اور اسی علاقہ میں کود گئے تھے۔ یہاں کے ریڈ کراس ہسپتال میں ان کی دیکھ بھال ہوتی رہی تا آنکہ ان کے فوجیوں کی خفیہ سروس نے انہیں ہسپتال سے بحفاظت ''اغوا'' کر لیا اور دریائے رائن کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ڈچ مہاجر فیملی کے پاس چھپا دیا اور پھر مناسب انتظامات کرنے کے بعد انہیں دشمن ملک سے نکال لیا۔ وہ صاحب بعد میں جنرل بنائے گئے اور نیٹو کی برٹش فوجوں کی کمان کرتے رہے۔ اس گاؤں کے ہر مکان پر ہمیں یہی شبہ ہوتا رہا کہ یہی وہ مکان نہ ہو۔ و اللہ اعلم۔ مطالعہ میں آنے والی اجنبی کی اجنبی کتاب نے ہماری سیر کو ایک معنویت دے دی۔

چھوٹے چھوٹے کئی گاؤں دیکھنے کے بعد ہم نے سٹراسبرگ کی راہ لی۔ ہائی وے اختیار کرنے کی وجہ سے

فاصلہ مختصر ہو گیا۔ سٹراسبرگ خوبصورت شہر ہے۔ پرانی تاریخی عمارتوں کا شہر۔ یورپ والوں نے اسے نئی یورپی یونین کا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ بھی شاید اس شہر کی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے کیا ہے۔ کچھ دیر شہر میں گھومتے رہے۔ پارکنگ کی بڑی دقت ہوئی۔ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتے تھے مگر ارد گرد پارکنگ نہیں مل رہی تھی۔ ایک جگہ ایک دو گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے عقب میں گاڑی کھڑی کر کے کھانے بیٹھ گئے۔ یکا یک خیال آیا کہ ہم نے گاڑی غیر مناسب جگہ پر پارک کر رکھی ہے۔ پردیس میں اگر پولیس والے ''کرین'' کے ذریعہ گاڑی اٹھا کر لے گئے تو کس سے داد فریاد کریں گے؟ ہم نے دل کو بہترا سمجھایا کہ گاڑی میں کلثوم نواز شریف تھوڑے ہی بیٹھی ہیں کہ پولیس والے کرین سے کام لیں گے۔ (اب تو یہ سارا قصہ ہی داستانِ پارینہ ہوا۔)

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ معاذ اللہ گاڑی کو کہیں مناسب جگہ لے جا کر پارک کر دے اور ہم وہیں بیٹھ کر کھانے کے آنے کا انتظار کریں۔ معاذ اللہ گیا تو ایسا گیا کہ ایک گھنٹہ تک واپس ہی نہ آیا ہم اپنی جگہ بہت پریشان کہ خدا معلوم کیا ہوا وہ جوان کدھر گیا؟ خدا خدا کر کے آیا تو اس وقت تک کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر اس بات سے اطمینان ہوا کہ اسے کوئی ایک کلومیٹر دور پارکنگ مل گئی ہے اور اب گاڑی کے کرین سے اٹھائے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم تو اپنے حصے کا کھانا کھا چکے تھے معاذ اللہ کو ٹھنڈا کھانا زہر مار کرنا پڑا۔ اس کے بعد یورپین پارلیمنٹ کی نئی بلڈنگ کی تلاش میں نکلے۔ جس سے راستہ پوچھیں وہ کھیسیں نکال دے کہ جرمن آتی ہے نہ انگریزی۔ فرانسیسی ہمیں نہیں آتی تھی۔ کس سے پوچھیں کیسے پوچھیں؟ بذات خود کوشش کی تو ہر پھر کر ایک ہی چوک میں پہنچ جاتے رہے۔ آخر تنگ آ کر فرائی برگ کی راہ پکڑی۔ اتفاق ایسے ہوا کہ ایک موڑ مڑے تو سامنے یوروپین پارلیمنٹ کی شیشے کی بنی ہوئی عمارت آ گئی رشید قیصرانی یاد آ گیا۔ ایک عمر جستجو میں گذاری تو یہ کھلا۔ وہ میرے پاس تھا میں جسے ڈھونڈتا رہا۔

بس ایک موڑ کا فاصلہ تھا۔ اترے۔ سکریٹریٹ کی عمارت کے اندر جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ پہلے سے وقت لینا پڑتا ہے۔ سامنے سارے ملکوں کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف دریا کا کنارہ ہے دوسری جانب سبزہ زار ہے۔ خوب صورت جگہ ان لوگوں نے چن رکھی ہے۔ پارلیمنٹ کی نئی عمارت بن رہی ہے اور تقریباً مکمل ہے۔ یہ عمارت شیشہ کی بنی ہوئی لگتی ہے۔ یعنی اس میں باہر کا سارا حصہ شیشے کا ہے، شیشہ کیا

فائبر گلاس ہوگا۔ چمکتی دمکتی گول عمارت ہے۔ قریب بہتے ہوئے دریا کے پانی میں اس کا عکس بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے کہا اس عمارت کے لئے یورپ والوں نے میٹیریل خوب چنا ہے کیونکہ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر نہیں پھینکے جاسکتے اس لئے ممبر ممالک کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جسے دوسرے سنگ زنی سے تعبیر کریں۔ پچھلے دنوں یورپی یونین کا جو وفد چیچنیا کے مسئلہ کا جائزہ لینے کے لئے روس گیا اس کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے اس پارلیمنٹ میں ایسی ہی قانون سازیاں ہوں گی جو کسی کی طبع نازک پر گراں نہ گذریں۔ یہ عمارت دیکھنے کے بعد سٹراسبرگ میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اس لئے واپس ہائی وے پر آئے اور الٹی سمت میں ہائی وے پر چڑھ گئے۔ جب کوئی پچیس تیس کلومیٹر سفر کر چکے تو نشان راہ نظر آیا۔ لکھا تھا پیرس چھ سو کلومیٹر! اب کیا ہو؟ مزید دس بارہ کلومیٹر جانا پڑا تب باہر نکلنے کی سبیل ہوئی۔ دوسری جانب سے اسی ہائی وے پر دوبارہ روانہ ہوئے اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد اپنی صحیح منزل کی جانب گامزن ہوئے۔ رستہ میں رکے۔ کافی وغیرہ پی اور تازہ دم ہو کر جرمنی کی سرحد میں داخل ہوئے فرائی برگ تک پہنچتے تھکاوٹ بہت ہوگئی تھی معاذ اللہ کا خیال تھا ہمیں مزید ایک دو قابل دید مقامات کا سفر کرنا چاہیئے جن کی گنجائش وقت کے لحاظ سے موجود تھی مگر ہم نے ہتھیار ڈال دیئے کہ ہماری توانائی میں گنجائش نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر نے بڑی اچھی ہدایت کر رکھی ہے کہ ''کسی صورت میں بدن کی آواز کو نظر انداز نہ کرو'' یعنی جسم کہے کہ تھک گیا ہوں تو اس کو مزید مت آزماؤ۔ گھر واپس آئے۔ اگلے روز گاؤں کے میئر صاحب نے ازراہِ بندہ پروری ہمیں ملاقات کے لئے وقت دیا۔ ان سے ملے، بھلے آدمی تھے۔ انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے تھے۔ نہیں یہ بات ہم نے غلط کہی۔ انہوں نے دو لفظ انگریزی کے بھی بولے تھے۔ ابتداء میں ویلکم کہا تھا اور رخصت ہوتے ہوئے تھینک یو۔ ان سے ملے۔ تصویر کھینچوائی کہ یادگار رہے اور اپنی دانست میں اس گاؤں سے رخصت ہونے کے انتظامات مکمل کر لئے۔ اگلے روز ہمیں فرینکفرٹ واپس جانا تھا۔ معاذ اللہ تو ہمیں واپس ''گھر'' تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہم نے کہا نہیں بس بہت ہو چکی اب یہاں سے انٹرسٹی ایکسپریس میں بٹھاؤ۔ فرینکفرٹ تک تین گھنٹے جانے کی اور تین گھنٹے واپس آنے کی ڈرائیو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے اصرار پر وہ مان گیا۔ چنانچہ ہم نے اس کے ساتھ قریب کے ریلوے سٹیشن پر جا کر ریزرویشن کروائی اور سٹیشن سے ہی عزیزی عرفان احمد خاں کو اپنی آمد کے وقت

سے مطلع کیا تا کہ وہ سٹیشن سے ہمیں وصول کر کے واپس شکیل کے گھر پہنچا دے جہاں ہم نے چھاؤنی چھا رکھی تھی یعنی نہ صرف یہ کہ خود وہاں ٹھہرے تھے بلکہ ہمارے مہمان بھی اسی گھر میں ٹھہرتے اور مبشرہ کی مہمان نوازی سے متمتع ہوتے تھے۔

گاڑی کا وقت ہوا تو دیکھا کہ معاذ اللہ اپنی زمینداروں والی ڈانگری پہنے کھڑا ہے اور ساجدہ بی بی ڈرائیور بنی کھڑی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہم نے درمیان میں نیند کی جھپکی لی تھی تو اس دوران دونو میاں بیوی اپنے کھیتوں کی جانب نکل گئے تھے اور اب ساجدہ ڈرائیو کریں گی تا کہ واپس آ کر میاں صاحب اپنے کام میں جت جائیں۔ ساجدہ نے ہمیں فرائی برگ سٹیشن تک پہنچایا۔ معاذ اللہ اسی لباس میں ہمارے ساتھ تھا۔ جب تک گاڑی میں ہمیں سوار نہ کروالیا ساتھ کھڑا رہا اور ساجدہ بچاری باہر گاڑی میں بیٹھی انتظار کرتی رہیں کیونکہ پارکنگ کا مسئلہ یہاں بھی بدستور تھا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ میاں بیوی اور ان کے بچوں نے ہماری خاطر داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

انٹرسٹی ایکسپریس نے دو گھنٹے اور کچھ منٹ میں ہمیں فرینکفرٹ لا اتارا۔ ہمیں یورپ کے ریلوے سٹیشنوں پر اس بات پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ سامان اٹھانے والی ٹرالیوں کو حاصل کرنے کے لئے سکے ڈالنے پڑتے ہیں۔ اب مسافر کے پاس سکے نہ ہوں تو کیا کرے؟ ائر پورٹوں والے اتنے مہربان ہیں کہ وہاں ٹرالیاں عام اور مفت دستیاب ہوتی ہیں۔ (بات پرانی ہوئی اب ایر پورٹ والے بھی ریلوے والوں کی طرح چالاک ہو گئے ہیں) ریلوے والوں میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہے یا ضرورت سے زیادہ سمجھدار ہیں کہ ہر مسافر کو ہمارے ملک کے سکے ضرور جیب میں رکھنے چاہئیں! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزیزی عرفان احمد خاں کو ہمارا سامان بڑی دور تک اٹھا کر لانا پڑا مگر آفرین ہے کہ ماتھے پر شکن نہیں پڑی ورنہ اتنا تو پوچھ ہی سکتا تھا کہ اتنے سامان کے ساتھ سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر اسے اندازہ تھا کہ ہمارے سامان میں سامان کم اور کتابیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ اس لئے ہم جہاں جائیں کتابوں کی دکانیں جھانکتے پھرتے ہیں

فرینکفرٹ پہنچے تو اپنے پوتے سے رابطہ ہو گیا۔ شام کو وہ اپنی دلہن کو لے کر آ گیا ہم نے دس برس کے بعد اسے دیکھا تھا۔ ماشاء اللہ شاندار نوجوان نکلا ہے۔ اس کی دلہن طاہرہ بھی ماشاء اللہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ! اللہ انہیں زندگی دے۔ اگلے روز ہم ان کے ہاں گئے۔ ایک وقت کا کھانا کھایا اور دعائیں

دیتے لوٹے کہ اللہ گھر بسائے رکھے اور خوشیوں سے معمور رکھے۔ شام کو ہمیں حلقہء ارباب ذوق والوں نے بلا رکھا تھا مگر ہم نے معذرت کر دی تھی۔ اب عرفان احمد آڑے آ گیا کہ وہ ہماری جانب سے دعوت قبول کر چکا ہے اس لئے جانا چاہیئے۔ چنانچہ گئے۔ پاکستانی قونصل خانہ والوں نے انہیں اپنا کمرہ اجلاس کے لئے دے رکھا تھا۔ گنے چنے چند اہل ذوق تھے۔ کاروائی کم باتیں زیادہ ہوئیں۔ بہر حال اہل ذوق سے مل کر خوشی ہوئی۔ اجلاس کے بعد بھائی مسعود احمد خاں دہلوی کے ہاں حاضری دی اور ان کی قلعہء معلیٰ کی زبان کے مزے لئے۔ میاں عبد السمیع نون صاحب سے ملاقات نہ ہو سکنے کا دکھ ہے۔ صرف فون پر ''اے لو'' ''ہے لو'' ہوئی۔ بہر حال چودہ روز کے اس سفر کے بعد اگلی صبح فرینکفرٹ سے لندن اور لندن سے سٹاک ہالم پہنچ گئے۔ غالب نے کہا تھا۔ ''ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے''۔ ہم اس میں تحریف کے مرتکب ہو رہے ہیں سفر تمام ہوا پر تھکان باقی ہے!

ذرا اوسلو تک

سکینڈے نیویا کے سارے ملک ہی خوب صورت ہیں مگر ناروے اپنے پہاڑوں' سمندروں' فورڈوں' برفوں اور آدھی رات کے سورج کی وجہ سے دنیا میں منفرد ہے۔ نارتھ پول کا وہ حصہ جس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ناروے ہی میں ہے۔ اگرچہ سویڈن کو بھی حصہ رسدی خورشیدِ نصف شب میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ملا ہے مگر "نورد کیپ" کا وہ مخصوص علاقہ ناروے کی تخصیص ہے اس لئے ناروے سکینڈے نیویا کے دیگر ممالک سے "مزید" خوب صورت ہے۔ اس تخصیص میں ایک اور اضافہ ہونے والا ہے یعنی دنیا کے شمال ترین علاقہ میں خدا کا جو گھر تعمیر ہوگا وہ یہیں نورد کیپ میں ہوگا اور اس کی تعمیر کا سہرا جماعت احمدیہ کے سر بندھے گا۔ اپسالا میں مسجد تعمیر ہوئی تو اس بات کا بہت چرچا کیا گیا کہ یہ مسجد نارتھ پول کے قریب ترین علاقہ کی مسجد ہے مگر نورد کیپ میں جو اللہ کا گھر بنے گا وہ فی الحقیقت نارتھ پول کے عین وسط میں بنے گا۔ زمین خریدی جا چکی ہے نقشہ بن رہا ہے کوئی دن کی بات ہے کہ اس علاقہ میں اللہ کا نام پانچ وقت بلند ہوا کرے گا۔ نارتھ پول پر پہلی اذان بھی جماعت احمدیہ ہی نے دی تھی جب چند برس قبل حضرت امام جماعت احمدیہ نورد کیپ تشریف لے گئے تھے اور وہاں جمعہ پڑھایا تھا۔

"فورڈ" اصطلاح میں اس منظر کو کہتے ہیں جہاں سمندر دور تک پہاڑوں کے اندر تک گھستا چلا گیا ہو اور یوں محسوس ہو جیسے سمندر پہاڑوں میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے مقامات پر سمندر کا پانی بھی بہت پرسکون ہو جاتا ہے کیونکہ باہر کے کھلے سمندر کا جوار بھاٹا یہاں تک نہیں پہنچتا۔ یہ فورڈز بہت صحت افزا مقام سمجھے جاتے ہیں جن پر پہاڑوں اور سمندروں کا موسم یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔ بھلے زمانوں میں جرمنی کے قیصر ولیم ناروے کے فورڈز ہی میں آ کر اپنا شاہی یاچ Yacht یعنی جہاز لنگر انداز کرتے اور سیر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ قبلہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب نے تحدیثِ نعمت میں قیصر ولیم ثانی کے یاچ کے "سوگن فورڈ" میں لنگر انداز ہونے اور قیصر ولیم سے آمنا سامنا ہونے کا ذکر کیا ہے۔ سویڈن سے جاتے ہوئے ہم ایک ایسے ہی فورڈ سے گذرے وہاں سمندر دو پہاڑوں کے اندر اتنا محصور ہے کہ

چھوٹا سا دریا لگتا ہے۔ اس مقام پر ناروے والوں نے جرمنی کے بحری بیڑے کو اپنی توپوں کی زد پر رکھ لیا تھا اور اس بیڑے کے لئے آگے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ ہم نے ذرا سی دیر کو رک کر ان توپوں کے آثار دیکھے جو ناروے والوں نے یادگار کے طور پر محفوظ کر رکھے ہیں۔

باہر کے بادشاہ تو یہاں کے فورڈوں میں سیر و تفریح کے لئے آتے تھے خود یہاں کے بادشاہ کے بارہ میں مشہور ہے کہ بہت سادہ تھے۔ سیر کے لئے اپنے شہر کے عام باغ میں جا بیٹھتے تھے۔ ایک بار ہمارے بر صغیر کا کوئی بڑا آدمی سرکاری سفر پر ناروے آیا تو یہ لوگ اسے اسی باغ کی سیر کروانے کے لئے لے گئے۔ وہ بہت سیخ پا ہوا اور کہنے لگا مجھے کسی خاص جگہ کی سیر کرواؤ جہاں تمہارے بادشاہ اور شہزادے جاتے ہوں۔ آخر ہم بھی تو تمہیں تاریخی محلات اور باغوں کی سیر کرواتے ہیں۔ میزبانوں نے کہا ہم نے تو ما حضر پیش کر دیا وہ دیکھیں سامنے ایک بڈھا بیٹھا ہے۔ کہنے لگے ہاں بیٹھا ہے اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں وہاں لے کر چلو جہاں فقیر نہیں جاتے بادشاہ جاتے ہیں۔ میزبان نے کہا یہ جو بڈھا آپ کے سامنے بینچ پر بیٹھا ہے یہ اتفاق سے ہمارا بادشاہ ہے۔ وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ یہاں اپسالا میں بھی ہم نے ایک روز دیکھا کہ پرانے قلعہ کے سامنے سڑک کے کنارے ایک جوڑا ٹہل رہا ہے لوگ باگ بڑے جوش خروش سے ہاتھ ہلاتے ان کے پاس سے گذر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہمارے سویڈن کے بادشاہ سلامت اور ملکہ چہل قدمی فرما رہے ہیں۔ حفاظتی انتظامات ہوں گے ہمیں تو نظر نہیں آئے حالانکہ اسی سادہ زندگی کی وجہ سے سویڈن والے اپنا ایک وزیر اعظم قتل کروا بیٹھے تھے۔ اولف پالمے سوشل ڈیموکریٹ وزیر اعظم تھے اور عام عوام میں بہت مقبول تھے۔ ایک روز سینما سے رات کو فلم دیکھ کر نکلے اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر پیدل ہی اپنے گھر کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ بڑی سڑک پر پہنچے تو قاتل نے انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا آج تک ان کے قتل کا معمہ حل نہیں ہوا۔ ہم فورڈوں کے ذکر سے چلے تو کہیں کے کہیں نکل گئے باگ موڑ کر واپس اپنے مضمون کی طرف آ رہے ہیں۔

ہم دس سال سے سکینڈ ینویا میں بیٹھے ہیں مگر اوسلو تک صرف دو بار گئے ہیں۔ دونوں بار اپنے شاگرد اور ٹی آئی کالج کے اولڈ بوائے، سعید انجم کی دعوت پر۔ ایک بار اس کی زندگی میں دوسری بار اس کے مرنے پر۔ یہی زندگی کا کاروبار ہے۔ پہلی بار واپس آکر جی چاہا کہ اوسلو کا سفر نامہ لکھیں مگر کچھ ایسی مکروہات حائل

ہوئیں کہ موقع نہ ملا۔ وقت گذر گیا تو ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ مشتے کہ بعد از جنگ والا سلسلہ نہ ہو تو بہتر ہے ۔اس لئے کچھ نہ لکھا۔ اس کے بعد باوجود خواہش کے اوسلو تک جانا نہ ہو سکا تا آنکہ سعید انجم کی وفات کا حادثہ پیش آ گیا۔ وہ جانبہار خود بھی اوسلو سے باہر کوپن ہیگن میں راہی عدم ہوا مگر اس کی تدفین کے لئے تو ہمیں جانا ہی تھا۔ گئے۔ مٹھیوں میں خاک بھر کر دوست آئے بہر دفن۔ زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے۔

پہلی بار اوسلو گئے تو ایک مشاعرہ کی دعوت پر گئے مگر سعید انجم کے ہاں قیام کیا کہ اصل مقصد اس سے ملاقات تھا سعید جدید افسانہ نگاروں میں منفرد تھا علامتی افسانہ میں تو اس نے ایسا کمال حاصل کیا کہ اس کا افسانہ ''نیک بندوں کا زیور'' اردو کا بہترین علامتی افسانہ شمار کیا جاتا ہے۔ ہم سائیں سچا کے ساتھ اس کی فیملی کے ساتھ گئے تھے فیملی کا قیام کہیں اور تھا سعید کے ہاں ہم تھے اور سائیں سچا کہ کچھ وقت ادب کی باتوں میں گذار سکیں۔ اگلے روز مشاعرہ پڑھا تو اجنبیوں کی طرح پڑھا کیونکہ میزبان ہمیں پہچاننے سے انکاری تھے۔ البتہ انور مسعود اور عطاء الحق قاسمی بہت حیران ہوئے کہ ہم سکینڈ نیویا میں رہتے ہیں اور اوسلو والے ہمیں نہیں جانتے پہچانتے۔ اگرچہ عطاء الحق قاسمی ناروے میں پاکستان کے سفیر بن کر آ گئے تو انہیں بھی ہمیں پہچاننے میں دقت ہونے لگی۔ اب کے برس برمنگھم میں ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے خوب پہچانا۔ ہم نے کہا دونوں کی بہتری اسی میں ہے جان پہچان تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو جانے پہچانے ہوں اپنے شعروں کی وجہ سے یا اپنی پی آر کی وجہ سے۔ ہم دونوں باتوں سے محروم و نابلد ہیں۔ اب سعید کی وفات پر جانا ہوا تو سب لوگوں نے پہچان لیا بلکہ منتظمین مشاعرہ نے چار سال پہلے نہ پہچاننے پر معذرت بھی کی کہ افسوس ہے کہ ہم آپ کی قدر افزائی نہ کر سکے۔ ہم نے کہا بہت شکریہ کہ چار سال بعد آپ نے پہچان لیا نہ پہچانتے تو ہم آپ کا کیا بگاڑ لیتے؟ فرق صرف یہ تھا کہ اس موقعہ پر ہم ان کے مہمان نہیں تھے فہیم شاہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہیں ہم سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ؟ جی یہ لفظ ہم نے یونہی استعمال نہیں کیا۔ مغرب میں جو لوگ مشاعرے پڑھنے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں بسا اوقات وہ منتظمین کے لئے بلائے بے درماں بن جاتے ہیں۔ دو تین برس پہلے لندن میں تو باقاعدہ ایسا حادثہ ہو گیا کہ اردو کے دو بڑے شعرا کو منتظمین نے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور ایک معین وقت تک ان کے ہوٹل کا سارا

خرچ بھی ہوٹل والوں کو ادا کر دیا۔ شعرا کو ان کا مقررہ معاوضہ بھی ادا کر دیا۔ اب شعرا پانچ ستاروں والے ہوٹل میں قیام فرماتے تھے اور ہر دوسرے شخص کی دعوت قبول کر کے مشاعرے پڑھتے دعوتیں اڑاتے اور معاوضے وصول فرماتے پھر رہے تھے۔ جب میعاد سے زائد قیام کے بعد ہوٹل سے جانے لگے تو ہوٹل والوں نے کرایہ طلب کیا تو شعرا ہکا بکا ان کا منہ دیکھنے لگے۔ منتظمین سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے فلاں تاریخ تک کرایہ اور معاوضہ ادا کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ اس وقت کے بعد آپ ٹھہرنا چاہیں تو اپنے خرچ پر ٹھہر سکتے ہیں۔ لہذا ہم تو سبک دوش ہو چکے ہیں۔ شعرا نے کہ پاکستان کے نمائندہ اور مشہور شاعر شمار ہوتے ہیں بہت واویلا کیا کہ ہمیں تو اتنا معاوضہ بھی نہیں ملا جتنا کرایہ آپ لوگ مانگ رہے ہیں۔ وہ تو خدا بھلا کرے پاکستان کے ہائی کمشنر کا کہ وہ آڑے آئے اور شعرا کا بل سفارت خانے کے ہنگامی فنڈ سے ادا کر کے ان بزرگوں کی جان چھڑائی۔ اخباروں میں اس بات پر بڑا فضیحتا ہوا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اب شعرا کو لوگ بلانے سے ابا کرنے لگے۔ ان باتوں سے ہم نے خوب عبرت پکڑ رکھی ہے۔ مشاعروں میں تو مارے باندھے جانا پڑتا ہے کیونکہ گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔ لوگوں کو بڑے شاعر نہیں ملتے تو ہم جیسے بھس پر گذارا کرتے ہیں مگر اس کے علاوہ ہمارے شاگردوں کا اپنا ذوق ہے جو ہمیں دور دراز کے علاقوں تک بلاتے اور جی کڑا کر کے ہمارا '' کلام بلاغت نظام'' سنتے بھی ہیں۔ اسی لئے ہم باہر کے حلقوں میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ دعوتیں تو بہت آتی ہیں مگر ہم پیشہ ور شاعروں کی طرح ہر مشاعرہ میں کود نہیں پڑتے سال میں ایک دو مشاعرے پڑھ لیں تو ہماری حرص پوری ہو جاتی ہے کہ یہی رفتار ہماری شاعری کی ہے۔ دو یا حد تین غزلیں سالانہ۔

پہلی بار اوسلو گئے تو سعید نے اپنی بساط کے مطابق ہمیں خوب سیر کروائی اوسلو ایسا شہر ہے جو پہاڑوں پر اور وادیوں میں آباد ہے اونچ نیچ اور اتار چڑھاؤ یہاں بہت ہے۔ ہم نے دوسرے دن ہی اعلان کر دیا کہ بس بھر پائے ہم ایسے شہر میں نہیں رہ سکتے جہاں آدمی پیادہ پا چل ہی نہ سکے۔ چار گز زمین بھی سیدھی اور ہموار نہیں۔ ہم ہیں کہ چہل قدمی کے بغیر ہمارا گذارا نہیں۔ نہ چلیں تو محاورہ کے مطابق بھی اور ویسے بھی ہمارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ذیابیطس کے اور دل کے مارے ہوئے ہیں دونوں بیماریوں کا بہترین پرہیز اور علاج پیدل چلنے میں مضمر ہے اس لئے پیدل چلتے ہیں اور اپسالا میں بھی انتظار حسین کی

زبان میں پا پیادہ تخ تخ کرتے پھرتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے سویڈش دوست شاعر لارش بیکسٹروم کی پچھترویں سالگرہ پر اخبار میں ایک مضمون چھپا تھا اس کا عنوان تھا ''سائیکل پر شہر گردی کرنے والا شاعر''۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اپسالا کے کسی رہنے والے نے ہمارے مرنے یا جینے پر کوئی مضمون لکھا تو اس کا عنوان ہوگا ''پا پیادہ چلنے والا پروفیسر''۔ بس یوں سمجھئے کہ اوسلو ہمارے مزاج کا شہر نہیں ہے۔

اب کی بار جانے سے پہلے ہم نے سید فہیم شاہ سے کہہ دیا کہ ہم اس کے ہاں ٹھہریں گے کیونکہ سعید کے ہاں تو ٹھہرنے کا موقع نہیں۔ تعزیت کے لئے آنے والوں کا ہجوم ہوگا اور ہمارے اعصاب ہجوم کا دباؤ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی آخری رسومات میں شرکت کریں گے مگر قیام ایسی جگہ رکھیں گے جہاں پر آرام میسر ہو۔ رشید اس کا بھائی ہمارا دوست ہے۔ نعیم برادر خورد ہمارا شاگرد ہے مگر ہمارا اندازہ صحیح تھا کہ دونوں تعزیت کرنے والوں کے ساتھ اور تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف ہوں گے انہیں تکلیف دینا مناسب نہیں۔ ہم لوگ کار کے ذریعہ کوئی چھ گھنٹے کا سفر کر کے گئے تھے تعزیت کے فرض سے ادا ہوئے سعید کی بیوی طلعت سے تعزیت کی بچوں یاسر اور حنا کو پیار کیا۔ اتنے میں ہمارے طے شدہ پروگرام کے مطابق فہیم ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ اگلے روز اس کی تدفین میں شریک ہوئے اور یوں اس منفرد صاحب اسلوب افسانہ نگار کو مٹی میں دفن کر آئے۔ جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے۔

فہیم شاہ نے ماشاء اللہ داڑھی ترک اور توند چھوڑ رکھی ہے۔ ''فارغ البال'' بھی حد سے سوا ہے مگر الحمد للہ کہ طبیعت میں مزاح اور بردباری بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح کالج کے اور ہمارے پڑوس کے زمانہ میں تھی۔ بیوی اس کی ہمارے قادیان کی بوٹی ہے۔ اس کے ابا اب بھی وہاں درویش ہیں۔ یہ بوٹی کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا کہ فہیم کے والد قبلہ سید عبد اللہ شاہ صاحب کلر سیداں کے رہنے والے تھے ہمارا آبائی وطن بھی پوٹھوہار ہے اس لئے قبلہ محترم شاہ صاحب جہاں ملتے جب ملتے یہی فرماتے تھے کہ تم ہمارے ''وطناں دی بوٹی ہو'' اس لئے ہمیں پیارے ہو۔ روفی ہمارے ''وطناں دی بوٹی'' ہے اس لئے ہمیں اور بھی اچھی لگی۔ اس نے خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اللہ اسے جزا دے۔

موقع سیر کا تھا نہ مشاعروں کا مگر دونوں کی دعوتیں پے بہ پے آنے لگیں۔ ہم نے مشاعروں سے تو سختی سے انکار کر دیا مگر سیر کی دعوت کو رد نہ کیا صرف اتنی شرط لگائی کہ جو بھی سیر کے لئے اوسلو سے باہر لے کر نکلے وہ

پہلے درامن لے کر چلے کہ وہاں بھی ہماری ربوہ کی ایک بیٹی بچاری حال ہی میں اپنے شوہر کی وفات کے حادثہ سے دوچار ہوئی ہے اس سے ٹیلیفون پر تو ہم تعزیت کر چکے تھے مگر ناروے میں آ کر اس کے گھر نہ جانا ہمیں اچھا نہ لگا وہاں پہنچے تو نبیلہ نے پہلی بات ہی یہ کہی کہ میں اس انتظار میں تھی کہ آپ میرے ہاں تعزیت کے لئے کب آئیں گے؟ اگر آپ میرے ہاں آئے بغیر چلے جاتے تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ ہم نے اس سے کہا بیٹی ہم یورپ میں آ تو گئے ہیں مگر ابھی اتنے یورپین نہیں ہوئے کہ اپنے کلچر کے سب قرینے بھول جائیں۔ اس بچی کے میاں فوزی صاحب سے ہمارا تعارف نہ تھا مگر بیٹی تو اپنی ہی تھی اس کے ہاں کیسے نہ جاتے؟ ہاں درامن جانے سے پہلے فوزی صاحب کی قبر پر فاتحہ کے لئے حاضری دے کر گئے تھے۔ نبیلہ رفیق ہمارے بزرگ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ایم سی کی بیٹی ہے۔ ایم سی سے یاد آیا کہ ایک بار ایک سینئر فوجی افسر ربوہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ گول بازار سے گذرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ ایک کلینک پر کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد ایم سی لکھا ہؤا ہے۔ رک گئے کہنے لگے یہ کون ڈاکٹر ہیں؟ مجھے ان سے ملواؤ۔ اندر گئے تو ڈاکٹر صاحب کو انہوں نے باقاعدہ ملٹری والا سیلیوٹ کیا حالانکہ خود حاضر سروس بریگیڈیر تھے۔ کہنے لگے تمہیں معلوم ہے یہ ایم سی کیا ہوتا ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ ملٹری کراس کا مخفف ہے اور بہادری کا تمغہ ہے۔ صرف اس شخص کو انگریز دیتے تھے جس نے جان جوکھوں میں ڈال کر کوئی نمایاں کام کیا ہو۔ لو، ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ یہ کوئی ڈاکٹری ڈپلومہ ہوگا اب معلوم ہؤا کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب تو باقاعدہ تمغہ یافتہ ڈاکٹر ہیں۔ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد۔ ڈاکٹر صاحب پہلے قادیان میں درویشوں کی خدمت کرتے رہے پھر ربوہ میں اہالیانِ ربوہ کی خدمت کرتے کرتے وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

درامن' اوسلو کے نواح کا شہر ہے کوئی پچاس ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ سعید کے ساتھ ہم درامن کی مشہور زمانہ SPIRAL یعنی پہاڑ کے اندر بنی ہوئی وہ سرنگ جو اندر ہی اندر بل کھاتی پہاڑ کی چوٹی پر جا نکلتی ہے دیکھ چکے تھے۔ جس طرح گلہری درخت پر چڑھے تو سیدھی نہیں چڑھتی۔ درخت کے گرداگرد چکر لگا کر اوپر چڑھتی ہے درامن والوں نے یہ جدت روا رکھی ہے کہ بجائے باہر سڑک تعمیر کرنے کے پہاڑ کے اندر بل کھاتی سرنگ تعمیر کر رکھی ہے ہم اس سرنگ کو ایک بار دیکھ چکے تھے اس لئے ہم نے قدم آگے بڑھائے۔

اسلام صاحب ہمارے رہنما بھی تھے اور کار چلانے والے بھی۔ فہیم اور میں محض مسافر اور تماشائی تھے ہم نے اسلام صاحب کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ جہاں چاہیں لے جائیں۔
درامن سے آگے بڑھے اور طویل وعریض جھیل کے گرداگرد لمبا چکر کاٹ کر اس مقام پر آ گئے جہاں پہاڑ کی چوٹی سے لوگ پیراشوٹ جمپ کرتے ہیں۔ سردیوں میں یہی پہاڑ سکی والوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور وہ پہاڑ کی چوٹی سے سکی کرتے کرتے جھیل کی ترائی تک اترتے اور زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ چلنے سے پہلے روفی نے آلوؤں والے پراٹھے بنا کر ساتھ کر دیئے تھے کہ جہاں بھوک لگے ان سے دو دو ہاتھ کر لیں چنانچہ جھیل کے خوب صورت کونے پر پہاڑ کے عین دامن میں پانی کے کنارے بیٹھ کر کافی لی اور پراٹھوں سے حظ اٹھایا۔ بھوک چمکی ہوئی تھی سامنے جھیل میں راج ہنسوں کے جوڑے تیر رہے تھے اوپر سروں پر رنگ برنگے پیراشوٹ منڈلا رہے تھے موسم بھی اللہ کے فضل سے بہت خوش گوار تھا بہت لطف آیا پیٹ پوجا کے بعد پہاڑ پر چڑھنے کی ٹھانی۔ آگے ایک ٹال سپاٹ تھا یعنی اوپر جانے سے پہلے اس سڑک والوں کو نذرانہ دینا تھا۔ دیکھا کہ کوئی آدمی وہاں متعین نہیں۔ اترے آگے فارم پڑے تھے اور پلاسٹک کے لفافے۔ ایک بکس تھا لکھا تھا فارم پر اپنی گاڑی کا نمبر لکھیے اور ٹول کی فیس اس لفافے میں ڈال کر بکس میں ڈال دیجیے۔ شکریہ۔ ہم نے فارم پر کیا فیس کے پیسے اس لفافے میں ڈال کر بکس میں ڈال دیئے اور اوپر چڑھنے لگے۔ سڑک چھوٹی تھی۔ راستہ خطرناک بھی تھا خوب صورت بھی۔ مڑتے بل کھاتے پہاڑ کی چوٹی کا رخ کیا ایک ذرا سی جگہ پارکنگ کی ملی تو رک گئے اور پیراشوٹ والوں کو دیکھنے لگے جو بڑے مزے سے فضاؤں میں تیر رہے تھے اور درختوں میں الجھنے سے بچتے بچاتے پھر رہے تھے ہمارے رہنما اسلام صاحب بڑے خطر پسند نکلے۔ جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے وہاں جنگلے سے باہر صرف پاؤں ٹکانے کی جگہ ہے ورنہ نیچے تک عمودی چٹان ہے اگر خدانخواستہ ذرا پاؤں پھسلے تو آدمی نیچے تک گرتا چلا جائے اور اس کا انجر پنجر بکھر جائے۔ مگر اسلام صاحب فہیم سے اصرار کرنے لگے کہ میں اس ذرا سی جگہ میں پاؤں ٹکا کر کھڑا ہوتا ہوں آپ تصویر کھینچیں فہیم تصویر کھینچتے ہوئے ڈر رہا تھا مگر اسلام صاحب تصویر کھنچواتے ہوئے نہ ڈرے۔ ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ یہ جو ہر جگہ اور ہر وقت ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ لگتا ہے یہ شاید ''اسلام'' کی فطرت میں ودیعت ہے کہ ہر وقت خطرے ہی میں رہتا ہے اور خطر پسند ہے۔ خطر پسند

طبیعت کو ساز گار نہیں۔ وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد۔ ہم تو سمجھے تھے اسلام صاحب نام کے ''اسلام'' ہیں وہ تو فی الحقیقت اسم با مسمیٰ نکلے۔

پیراشوٹ رنگ برنگے تھے ایک دو پیراشوٹ سویڈن کے جھنڈے کے رنگ کے تھے یعنی زرد اور نیلے جو یقیناً سویڈش پیراشوٹر ہوں گے۔ کچھ دیر رک کر ان کا نظارہ کیا۔ آگے بڑھے تو وہ جگہ آ گئی جہاں سے پیرا شوٹ والے چھلانگ لگاتے تھے۔ دیکھا کہ دو تین پیراشوٹر قطار میں کھڑے ہیں۔ پیراشوٹ کا سارا بیرا فرنیلیا تیار ہے صرف دو قدم بھاگنے اور پیراشوٹ کھولنے کی کسر ہے وہ فضا میں تیرنے لگتے ہیں۔ یہ نظارہ بڑا دلچسپ تھا کچھ دیر رک کر دیکھتے رہے اور پیراشوٹروں کو فضاؤں میں تیرتے اور پھر دور نیچے صاف جگہ پر میدانوں میں اترتے دیکھتے رہے کیسا خطرناک کھیل ہے مگر خطروں سے مردانہ وار ٹکرانا ہی تو زندگی ہے۔ آگے چلے تو سڑک ایک موٹل میں گھس گئی معلوم ہوا یہ مہنگا موٹل نئے شادی شدہ جوڑوں کے ہنی مون کا مقام ہے۔ وہ لوگ دنیا سے دور پہاڑ کے اوپر آ جاتے ہیں جہاں بہ قول اقبال'' دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو''۔ یہاں دامنِ کوہ کی بجائے کلّہ ءکوہ تھا اور جھونپڑے کی بجائے اچھا خاصہ پانچ ستاروں والا ہوٹل۔ دوست لواحقین دولہا دلہن کو یہاں تک چھوڑنے آتے ہیں دعوت میں کھاتے پیتے ہیں اور پھر دونوں کو چھوڑ کر پہاڑ سے نیچے اتر جاتے ہیں کہ لو اب زندگی کا پہاڑی راستہ خود طے کرو۔ بسم اللہ مجرٖہا و مرسٰہا۔

ہم واپس اترے۔ پٹرول سٹیشن سے پٹرول لیا۔ اسلام صاحب نے اس سٹیشن پر کام کرنے والی لڑکی سے شناسائی بگھارنے کی ناکام کوشش کی۔ ہم نے طعنوں پر دھر لیا تو فرمانے لگے میں اسی مقام پر اپنے ابتدائی زمانہ میں رہ چکا ہوں۔ یہ بچی اس وقت بہت چھوٹی تھی اور بھولی بھالی۔ ہم نے کہا اس کی شکل و صورت سے یہی لگتا ہے کہ چھوٹی تو یقیناً ہو گی مگر بھولی والی بات بھول جایئے۔ اتنی بھولی بھی نہیں لگتی۔ چلئے خاموشی ٹوٹنے کی کوئی صورت بھی نکل آئی ورنہ ہم لوگ اس نظارہ سے اتنے متاثر تھے کہ دم بخود بیٹھے تھے۔ واپسی کا سفر ایسے وقت میں شروع ہوا جب سڑکوں پر رش شروع ہو چکا تھا۔ کچھ راستہ بھی پہاڑی تھا ۔اترتی چڑھتی بل کھاتی سڑک کبھی فراز کبھی نشیب۔ ساتھ ساتھ جھیل۔ بائیں طرف پہاڑ کی فصیل۔ چلتے باتیں کرتے ایک ''سرِ راہ شیوسک'' پر رکے کہ ذرا چائے وائے ہو جائے مگر وہ تو اسلام کے اور فہیم کے

دوست نکلے اور مخلص احمدی۔ فرمانے لگے نورڈ کیپ کے سفر میں میں حضرت صاحب کے قافلہ کے ساتھ بطور باورچی گیا تھا۔ وہاں حضرت صاحب نے قافلہ والوں کی دعوت کی تو فرمانے لگے اب ہم دو باورچی آپ کے لئے کھانا پکائیں گے چنانچہ میں نے اور حضرت صاحب نے مل کر کھانا پکایا۔ یہ سناتے ہوئے ان کی آواز رندھ کر گلے میں اٹک گئی۔ ابھی کچھ دن پہلے حضرت صاحب نے ایم ٹی اے پر اپنی اردو کلاس کو ناروے کی تصویریں دکھاتے ہوئے ایک مقام دکھایا اور فرمایا اس مقام پر یہ جو مکان ہے اسمیں ہم لوگ ٹھہرے تھے اور میں نے چوہدری انور حسین صاحب کو دال پکا کر کھلائی تھی۔ وہ ہونٹ چاٹتے رہ گئے تھے کہ اتنی لذیذ دال تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کھائی۔ خیر جملہ معترضہ برطرف۔ ہم ان کے ہاں بیٹھے چائے وغیرہ پی اور پھر واپسی کی راہ پکڑی ہمارے وہاں بیٹھے ہوئے سویڈن کی تین چار کاریں بھی وہاں رکیں اور پھر آگے بڑھ گئیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی پیراشوٹ جمپ کے لئے ادھر کا رخ کر رہے تھے وہ جگہ اہلِ ذوق میں خاصی مقبول لگتی ہے۔

اگلے روز اوسلو کی سب سے مشہور جگہ دیکھنے کا پروگرام تھا یعنی اوسلو کا سکی جمپ۔ ہلال کی شکل کا بنا ہوا یہ سکی جمپ اوسلو کا سب سے مشہور اور سب سے اونچا مقام ہے۔ رات کی تاریکی میں بھی یہ سکی جمپ روشن رہتا ہے اور سردیوں میں تو آباد بھی رہتا ہے مگر ہم ایسے موسم میں گئے تھے کہ سکی کا موسم نہیں تھا۔ بل کھاتی سڑک کے ساتھ ہم بھی بل کھاتے اوپر سکی جمپ تک پہنچ گئے۔ دور سے جو منا سا ہلال لگتا تھا قریب سے ایک عظیم الشان ڈھلوان نظر آیا سکی کرنے والے اس ڈھلوان کے اوپر سے سکی کرتے ہوئے نیچے سامنے بنے ہوئے تالاب میں جا گر رکتے ہیں جو سردیوں میں برف کا میدان بنا ہوتا ہے اور یہ کھیل برفانی کھیلوں میں بہت مشہور کھیل اور تفریح سمجھا جاتا ہے۔ سکی میں تو ہمارے سویڈن والے بھی کسی سے ہیٹے نہیں بلکہ سردیوں کے اولمپک کھیلوں میں سکی کی چمپین خاتون ہمارے سویڈن ہی کی ہیں۔ سویڈن ہی کی کیا ہمارے اپنے شہر اپسالا ہی کی ہیں۔ یہ سکی جمپ دنیا کا سب سے اونچا سکی جمپ ہے اور اپنی ساخت کے اعتبار سے بھی نرالا۔ دوسرے لوگ بھی چاہیں تو بنالیں مگر اوسلو جیسی بلندی کہاں سے لائیں اس لئے اہلِ ذوق اوسلو میں آتے اور اس جمپ سے سکی کرنے کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہم نے سکی تو نہیں کی البتہ اس کے ریستوران میں بیٹھ کر ایک وقت کا کھانا ضرور کھایا اور اوپر سائیڈ ریلنگ پر کھڑے ہو کر فہیم سے سکی

جمپ کھیل کے قواعد سنتے رہے مگر اس کا علم بھی محض سماعی ہے عملاً وہ بھی سکی کہاں کرتا ہوگا؟ اس دوران سکول کے بچوں سے لدی پھندی بسیں بھی آئیں۔ بچے اس مقام کی سیر کر کے پھولے نہ سماتے ظاہر ہے واپس جا کر اپنے ہمجولیوں کو دنیا کے مشہور ترین سکی جمپ کی روداد سنائیں گے۔ اتفاق یوں ہے کہ ہم پہلی بار آئے تھے تو سعید باوجود خواہش کے ہمیں سکی جمپ نہ دکھا سکا تھا اب فہیم اور اسلام نے وہ کسر پوری کر دی۔ اس کے بعد ہم اوسلو میں تعمیر ہونے والی مسجد دیکھنے گئے۔ اس مسجد کا کافی حصہ بن چکا ہے مگر شاید اسے مکمل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ یہاں بھی سویڈن کی طرح ہر کام سہج سہج اور دھیمے دھیمے ہوتا ہے۔ ترت پھرت ہمارے مشرق والوں کے حصہ میں ہی رہ گئی ہے ہاں پری فیبر یکیڈ یعنی پہلے سے بنے بنائے گھر ہوں تو ان کی تعمیر میں تھوڑا وقت لگتا ہے کہ ہر چیز ایک سائز اور معیار کے مطابق پہلے سے تیار شدہ مل جاتی ہے مگر خاص نقشہ والی عمارتیں وقت لیتی ہیں کیونکہ انہیں رک رک کر قدم بہ قدم چلنا پڑتا ہے۔ جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھی۔ سعید کے گھر الوداعی ملاقات کے لئے گئے۔ طلعت اور بچوں کو خدا حافظ کہا اور گلے روز بس میں بیٹھ گئے۔ نہایت آرام دہ بس تھی۔ وقت پر چلی وقت پر سٹاک ہالم پہنچایا اور سٹاک ہالم سے ہم ایک گھنٹہ میں واپس اپنے گھر پہنچ گئے۔

اوسلو میں دعوتوں کا موقعہ نہیں تھا اس کے باوجود لوگ دعوتیں دیتے جاتے تھے ہم نے صرف اپنی بے بی یعنی فرزانہ کی دعوت قبول کی وہ بھی اس لئے کہ فرزانہ سے کوئی تیس پینتیس برس بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہمارے قبلہ وکعبہ سید عبداللہ شاہ صاحب کی بیٹی اور ہماری چھوٹی بہن ہے۔ شادی کے بعد اپنے میاں نثار شاہ صاحب کے ساتھ ناروے آ بسی۔ فہیم کے گھر ہمیں ملنے آئی تو ہم حیران رہ گئے۔ وہ ننھی سی بے بی ماشاء اللہ بڑے بڑے بچوں کی ماں بنی ہوئی ہے۔ شکل وصورت سے تو اسی طرح معصوم اور پیاری لگی۔ طبیعت میں اپنے بڑے بھائی جان یعنی ہمارے یار بو جان سے ملتی ہے اس کا کہا کیسے ٹالتے؟ پھر اپنے بہنوئی نثار شاہ صاحب سے ملاقات کا پہلا موقعہ تھا اور بے بی کے بچوں سے ملنے کا بھی اس نے دعوت میں بڑا تکلف روا رکھا تھا۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ دوسری بہنوں شاہدہ کی بیٹی اور راشدہ کا بیٹا دونوں آپس میں بیاہے ہوئے ہیں وہ بھی اس دعوت میں آ گئے اس طرح قبلہ شاہ جی عبداللہ شاہ صاحب کا ناروے کا سارا خاندان اکٹھا ہو گیا۔ ایسی یکجائی بہت غنیمت ہوتی ہے پھر یا قسمت یا نصیب۔ بھلا گردش فلک کی

چھین دیتی ہے کسے انشا۔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ اب واپس گھر آ بیٹھے ہیں تو فہیم اور روفی کے چھوٹے چھوٹے بچے یاد آ رہے ہیں۔ عدنان اور صائمہ۔ اس کی بیٹی تو ہماری نواسی جیسی موٹی تازی اور گول مٹول ہے۔ بڑے بیٹے کا نام بھول گیا ہے۔ شاید عثمان ہے؟ اللہ انہیں زندگی دے اور ماں باپ کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ آمین۔

ناروے والوں کا شکوہ کئی سال سے چلا آ رہا تھا کہ ہم نے ابھی تک ناروے کے بارہ میں کچھ نہیں لکھا۔ خاص طور سے ہمارا یار محمد احمد منیر تو بہت ناراض رہتا ہے حالانکہ ہم اس کی اقتدا میں بہت نمازیں پڑھ چکے ہیں۔ چلئے اب وہ شکوہ دھل جانا چاہئے مگر اس سفر میں ایک تاریخی واقعہ بھی ہوا ہم ہمیشہ اپنے شاگردوں کا شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ پہچاننے پر اصرار کرتے ہیں اور ہمارے حافظہ کا امتحان لیتے رہتے ہیں۔ اس سفر میں اپنے ایک شاگرد کا سامنا ہوا۔ وہ تعزیت کے لئے سعید انجم کے ہاں آیا تھا۔ کسی نے تعارف کروایا۔ ہم نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا کہ وہ ہمارا شاگرد بھی تھا اور محلہ دار بھی۔ دو برس ہم دار البرکات میں اس کے محلہ دار رہے تھے اور دو برس ہی وہ عزیز ہمارا شاگرد بھی رہا تھا۔ ہم نے پوچھاز کریا ٹھیک ہو؟ ابا راضی ہیں؟ کہنے لگا معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہم اس کا منہ دیکھنے لگے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہمارے کسی شاگرد نے ہمیں نہ پہچانا ہو یا پہچاننے سے انکار کر دیا ہو۔ ہم بہت خفیف ہوئے۔ مجلس میں کسی حاضر شخص نے ہمارا تعارف کروایا تب بھی ان کے چہرے پر اعتنا کی کوئی دھاری نمودار نہ ہوئی۔ معلوم ہوا اپنے ابا سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ یہ ۱۹۵۲ کی بات ہے ہم نور ہسپتال میں کلرک تھے۔ ایک صاحب جواب جرمنی میں مقیم ہیں اپنے کسی بچے کی دوا لینے کے لئے ہسپتال تشریف لائے۔ پرچی پر نام لکھنا اور پرچی کو درج کرنا ہمارا کام تھا۔ ہم نے پوچھا مریض کا کیا نام ہے؟ سوچ میں پڑ گئے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولے براہونسیان کا بچوں کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔ ہم نے پرچی پر دختر فلاں یا پسر فلاں لکھ دیا۔ دوائی وغیرہ لینے کے بعد تشریف لائے کہنے لگے ہاں نام یاد آ گیا ہے لکھ لیجئے۔ یہ حضرت انہیں صاحب کے صاحبزادے تھے باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ یہاں تھوڑا تھوڑا کیا پورا پورا سے بھی آگے کا مقام تھا۔ جرمنی گئے تو انہی بزرگ کی طرف سے ان کی کتاب کسی دوسرے کے ہاتھ تحفۃً موصول ہوئی۔ ہم نے رسید بھیجی تو لکھا الحمد للہ کہ آپ کو ہمارا

نام یاد رہ گیا ورنہ آپ کے خلف الرشید تو ہمارا نام بھولے بیٹھے ہیں۔ ناروے کے ساتھ یہ تاریخی یاد بھی وابستہ ہے جو ناروے کو کبھی بھولنے نہیں دے گی۔

سر بریدہ کی واپسی

بات سجاد ملک کے ٹیلیفون سے شروع ہوئی اور ہوتے ہوتے ہمارے کینیڈا کے دوسرے سفر تک پہنچ گئی ہمیں قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ اتنی جلدی ہمیں دوبارہ کینیڈا لانے لیجانے کا بندوبست کر دے گا اس کی قدرتیں بھی عجیب ہیں اور انسان چاہے بھی تو اس کی بے انتہا مہربانیوں کرمفرمائیوں کا احاطہ نہیں کر سکتا و ان تعدو نعمت اللہ لا تحصوہا۔

ایک روز اچانک سجاد ملک کا کینیڈا سے فون آیا کہ وہ چوہدری محمد علی صاحب کو اور ہمیں کینیڈا بلانا چاہتا ہے ہمیں فرصت ہے؟ ہم نے کہا فرصت؟ تم بلا کے تو دیکھو ہم کیسے اڑ کر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ لندن کا ویزا لگوا کر اپنی طرف سے تیار ہو گئے لندن کا ویزا اس لئے کہ کینیڈا والوں نے یہاں سٹاک ہالم میں اپنا سفارت خانہ تو کھول رکھا ہے مگر ویزا سیکشن لندن میں ہے وہی اپنے سکھ بھائی بندوں کی طرح کہ کالج لاہور میں بنایا تھا تو کالج کا ہوسٹل امرتسر میں کھول دیا تھا کہ کسی بھائی کی حق تلفی نہ ہو۔ کینیڈین حکومت نے بھی ایسا ہی انتظام کر رکھا ہے۔ سفارت خانہ سٹاک ہالم میں اور ویزا سیکشن لندن میں۔

پھر ایک روز اچانک عزیزی نعیم کا جرمنی سے فون آ گیا کہ آپ کینیڈا جانے کو تیار ہیں؟ ہم نے کہا 'تیار سے تیار ہیں'۔ اس نے کہا تو آپ فوراً لندن پہنچیں اور مکرم چوہدری محمد علی صاحب کا ویزا لگوائیں کیونکہ کینیڈا والوں نے ویزا لگانے سے انکار کر دیا ہے۔ ہم نے سوچا ہم چوہدری صاحب کے ویزہ کا کیا انتظام کریں گے اسی بہانہ لندن چلتے ہیں وہاں جماعت برطانیہ چوہدری صاحب کے ساتھ جو شام منانے کا اہتمام کر رہی ہے اس میں شرکت کریں گے چوہدری صاحب سے ملاقات بھی ہو جائیگی ہم خرما و ہم ثواب۔ لندن پہنچے چوہدری صاحب سے ملے ابھی ان کے کمرہ ہی میں بیٹھے تھے کہ مکرم بشیر الدین سامی صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ مکرم امیر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر زحمت نہ ہو تو ذرا سی دیر کو تشریف لائیں۔ ہم نے سوچا کہ مکرم امیر صاحب تو قبلہ قاضی محمد اسلم کے ناطے سے ہمیں خوب جانتے ہیں اس طرح تکلف سے بلانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ بہر حال حاضر ہوئے۔ ایمبیسیڈر آفتاب احمد خاں

صاحب فرمانے لگے' آج چوہدری محمد علی صاحب کے ساتھ ایک شام کا اہتمام ہے۔ کیا آپ اس مجلس میں چوہدری صاحب کا تعارف کرواسکیں گے'؟ ہم نے کہا کیوں نہیں۔ پھر ہم نے قبلہ امیر صاحب کو بتایا کہ مکرم بشیر احمد رفیق صاحب اس بارہ میں کل شب ہی ہمیں حکم دے چکے ہیں کہ ہم لندن ذرا سوچ سمجھ کر آئیں کیونکہ ہمیں چوہدری صاحب کا تعارف بھی کروانا ہوگا لہذا ہم نہ صرف تیار ہیں بلکہ اس حد تک تیار ہیں کہ چوہدری صاحب کا تعارفیہ لکھ بھی رکھا ہے۔ وہ تعارفیہ ہمارے کام آ گیا چوہدری صاحب کا تعارف ہم کیا کرواتے کہ وہ اپنا تعارف آپ ہیں۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ اس تعارف کا ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ سیدی حضرت اقدس کے جلو میں سٹیج پر بیٹھنے اور حضور کے قرب سے متمتع ہونے کا موقع مل گیا قبلہ امیر صاحب تعارف کے ایسے موقعوں پر ہمیں یاد کرلیا کریں ہم سر کے بل آئیں گے آزمائش شرط ہے۔ ہم نے ایک روز قبل قبلہ محترم مولینا محمد احمد صاحب جلیل مدظلہ کا ویزا لگوایا تھا اگلے روز چوہدری صاحب کے ویزے کے لئے پہنچے تو امیر صاحب کینیڈا کی طرف سے تاکیدی فیکس بھی پہنچ چکا تھا قبلہ چوہدری صاحب کا ویزا بھی لگ گیا اور ان لوگوں نے چوہدری صاحب سے ویزے کی جو فیس وصول کی تھی وہ بھی واپس کردی۔ ہم نے کہا اب قابو آئے ہو نا کینیڈا والو! محترم چوہدری صاحب کا ویزا لگنے کی دیر تھی کہ ہم نے سیدنا حضرت اقدس کی خدمت میں اجازت کی درخواست پیش کردی حضور نے از راہِ بندہ پروری اجازت مرحمت فرمادی صرف اتنی پابندی لگائی کہ ویک اینڈ سے پہلے سفر نہ کریں۔ ہم نے خوش خوش چوہدری صاحب کو حضور کی اجازت کا فرمان سنایا تو چوہدری صاحب حسبِ دستور سابق پسر گئے کہ وہ خود حضور سے اجازت طلب کریں گے تب اپنا پروگرام معین کریں گے۔ چوہدری صاحب نے خدا جانے کیا اجازت طلب فرمائی اور کیسے فرمائی کہ حضور کا ارشاد آیا' جب تک اپنا کام مکمل نہیں کرلیتے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'۔ چلئے چھٹی ہوئی جب تک چوہدری صاحب اپنا کام ختم نہیں کریں گے جا نہیں سکتے اور کام ختم کرنا چوہدری صاحب کی سنتِ جاریہ نہیں۔ ہم سویڈن سے جا کر لندن میں بیٹھے تھے گویا مسلسل سفر میں تھے اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو ہم واپس سویڈن آجاتے اور پھر چوہدری صاحب کا کام ختم ہونے پر دوبارہ رختِ سفر باندھتے یا سیدھے کینیڈا چلے جاتے اور وہاں بیٹھ کر چوہدری صاحب کی آمد کا انتظار کھینچتے عزیزی نعیم۔ سے مشورہ مانگا تو اس نے کہا آپ سیدھے کینیڈا چلے جایئے عزیزی سید شکیل

احمد برطانیہ ہی میں ہے وہ دو دن میں کینیڈا کے کاغذات پہنچا دے گا چنانچہ عزیزی شکیل ہمارا کینیڈا کا پروانہ لے کر برمنگھم پہنچ گیا اور تیسرے روز ہم ٹورنٹو پہنچ گئے ہمیں اللہ تعالی کی مہربانی کے سوا اور کچھ سمجھ نہیں آئی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ بات سجاد ملک کے فون سے شروع ہوئی ہیمبرگ سے کسی اور نے لندن جانے کو کہا اور فرینکفرٹ سے کوئی اور ہمارا کینیڈا کا پروانہ لے کر برمنگھم پہنچ گیا۔ کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما۔

عزیزی مہدی تو ہمارے پہنچنے کے دو چار دن بعد ہی جرمنی بھاگ لیا کیونکہ اسے وہاں جرمنی کے جلسہ میں تقریر کرنا تھی مگر ہمیں بھی اللہ تعالی نے فارغ نہیں بیٹھنے دیا۔ ایڈمنٹن البرٹا سے کہ کینیڈا کا ''تیل کا کنواں' کہلاتا ہے عزیزی ہشام ملک کا فون آیا کہ کیا آپ اب کے برس ہمیں خدمت کا موقعہ نہیں دیں گے؟ ہم نے کہا کیوں نہیں دیں گے تم آزما کے تو دیکھو۔ دوسرے دن ہی ایڈمنٹن کا جانے کا انتظام ہوا اور تیسرے دن ہم ایڈمنٹن پہنچ گئے۔ مری گرانئ رفتار پر نہ کر تنقید۔ تو دیکھ یہ میں کہاں آ گیا کہاں سے چلا۔ ایڈمنٹن میں عزیزی ہشام ملک تو خیر ہمارا شاگرد تھا۔ زیادہ کھد بد اپنے دوست مرزا محی الدین سے ملنے کی لگی ہوئی تھی کیونکہ یہ شخص اچھا بھلا بایالوجی کے کسی میدان میں پی ایچ ڈی تھا اب سننے میں آیا تھا کہ ہومیوپیتھی کے کسی میدان میں بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری لئے بیٹھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے طور اطوار دیکھیں کہ ہومیوپیتھی نے اس بھولے بھالے (اس میں بھلا مسکرانے کی کیا بات ہے؟) شخص پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں ؟

ایڈمنٹن پہنچے تو سب سے زیادہ خوشی قبلہ پروفیسر مرزا منظور احمد صاحب سے مل کر ہوئی۔ مرزا صاحب ہمارے استاد پروفیسر صوفی بشارت الرحمٰن مرحوم کے برادر نسبتی ہیں۔ مگر انہیں قبلہ صوفی صاحب کے مزاج سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ نہایت خندہ رو اور خندہ پرور شخصیت نکلے۔ ہمیں اس لئے بھی اچھے لگے کہ ہمارے ساتھ ذرا سی بھی شناسائی نہیں تھی اس کے باوجود ملنے کے لئے تشریف لائے اور ٹوٹ کر ملے فرمانے لگے بس آپ سے الفضل کا رشتہ ہے ورنہ اس سے پہلے ہم کبھی نہیں ملے۔ قبلہ مرزا صاحب کی زندہ دلی کے بارہ میں بہت کچھ سن رکھا تھا ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ لوگ دوسروں کے مزاج کا صرف ایک ذرا سا ادراک ہی حاصل کر پاتے ہیں اصل جوہر تو عند الملاقات ہی کھلتے ہیں۔ مرزا صاحب سے

مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اے کاش ان سے اور ملنا ہوتا اور ملنا ہوتا۔ بہت جی خوش ہؤا حالی سے مل کر۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ اللہ تعالی انہیں خوش وخرم اور صحت وسلامتی سے رکھے آمین۔(اس کتاب کے مرتب ہوتے وقت مرزا صاحب وہاں چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا)۔ الفضل کی قوت کا بھی اس روز اندازہ ہؤا کہ یہ بظاہر چھوٹا سا پرچہ کتنا بے پناہ توانا پرچہ ہے۔ مقبول چوہدری صاحب بھی تھے مقبول صاحب کے بارہ میں ہشام نے پوچھا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا صورت شنا سا ہے باجوہ خاندان میں سے لگتے ہیں وہ واقعی باجوہ خاندان میں سے تھے اور خود ان کے قول کے مطابق سکول کے زمانہ میں یعنی ۱۹۵۷۔۱۹۵۸ ہمارے اتنے سے شاگرد رہے تھے کہ انہیں یہ ضرور یاد تھا کہ ہم کلاس میں سوائے شعر سنانے کے اور کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے ہم نے جھٹ اپنے اس گناہ کا اعتراف کیا اور انہیں اپنا سچ مچ کا شاگرد مان لیا مقبول صاحب تو بہت دلچسپ نکلے ان کے جوہر اگلے روز کھلے جب ہمیں ان کے ساتھ کینیڈین راکیز کے طویل سفر کی رفاقت اختیار کرنا پڑی یہ شخص تو مروت اور خلوص کا پتلا نکلا (یہ لفظ زبر سے بھی پڑھا جا سکتا ہے) ہمارے دوست مرزا محی الدین کی ہومیو پیتھی کا امتحان بھی ہو گیا۔ مقبول نے ازراہِ تفنن مرزا صاحب سے کہہ دیا کہ کوئی ایسی دوا ایجاد نہیں ہوئی جس سے بیوی مطیع و فرماں بردار بن جائے؟ مرزا صاحب نے کہا کیوں نہیں میں نہ صرف ایسی دوا ایجاد کر چکا ہوں بلکہ میری جیب میں بھی موجود ہے آپ چاہیں تو آج ہی آزما بھی سکتے ہیں۔ ہمارا جی تو چاہا کہ محی الدین سے پوچھیں یہ دوا صرف دوسروں کی بیویوں پر کیوں اثر کرتی ہے؟ مگر ہم چاہتے تھے کہ ذرا بات بڑھے تاکہ مرزا محی الدین کی ہومیو پیتھی کے کچھ اور گوشے سامنے آئیں مگر معلوم ہوتا ہے مقبول صاحب اسی ایک نسخہ پر مطمئن ہو گئے 'تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیء داماں بھی تھا'۔

ہشام ہمارے بزرگ مکرم ومحترم ملک سیف الرحمٰن مرحوم مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا بیٹا ہے۔ نہایت زندہ دل اور شوخ۔ کہنے لگا ہم آپ کے شاگرد تو رہے ہیں مگر ہمیں آپ کی باتیں کبھی سمجھ نہیں آتی تھیں۔ ہم نے کہا درست کہتے ہو جس کچی عمر میں تم ہمارے شاگرد رہے ہو ہماری پکی باتیں تمہیں کہاں سمجھ آتیں؟ اگر سمجھ میں آ گئی ہوتیں تو آج اس احترام سے نہ ملتے جس احترام سے مل رہے ہو۔ دلیل اس بات کی یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے قول کے مطابق غالب واحد شاعر ہے کہ جس کا کلام سمجھ میں نہ آئے تو دونا مزا

دیتا ہے۔ ہماری استادی کا بھی یہی عالم رہا ہے۔ جن شاگردوں کو ہماری باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں وہ ہمارے زیادہ گرویدہ ہوتے تھے۔ ہم شاگردوں کے معاملہ میں اللہ تعالی کے فضل سے بہت ہی خوش نصیب رہے ہیں اور ہیں۔ ملک صاحب سلسلہ کے مفتی تھے۔ جامعہ کے پرنسپل بھی رہے۔ سلسلہ کے بزرگوں میں سے تھے مگر ہمارے ساتھ ہمیشہ محبت کا سلوک فرماتے تھے فرماتے تھے تم میرے بیٹوں کے استاد ہو اس لئے میرے دل میں تمہارا بہت احترام ہے اب ایسی محبتیں کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟

کینیڈین راکیز کی سیر پر روانہ ہوتے ہوئے یہ طے پایا تھا کہ راستہ میں کھانے پینے کا جو سلسلہ ہوگا اس کی ذمہ داری مرزا محی الدین پر ہوگی۔ چنانچہ یہ سوچ سوچ کر جان ہلکان ہوتی رہی کہ کہیں ایسا نہ ہو کھانے کا وقت ہو تو مرزا محی الدین جیب سے ہومیوپیتھی کی کوئی شیشی نکالیں اور کہیں حضرات ناشتہ تناول فرمایئے اور ہتھیلی پر کوئی کینیڈین 'کیوریٹو' قسم کی گولیاں رکھ دیں کہ 'نوشِ جان فرمایئے۔ کھائی نہ جا سکیں تو ان کا سونگھنا بھی مفید ہوتا ہے'۔ مگر اللہ نے بچا لیا۔ محی الدین نے پراٹھے پکوا رکھے تھے۔ دو تین قسم کا سالن بھی بندھا ہوا تھا۔ چائے بھی تھی اور اس بات کے علی الرغم تھی کہ محی الدین خاندانی طور پر چائے سے بیزار ہے۔ سفر پر روانہ ہوئے تو طے پایا کہ اولیں پڑاؤ پر رک کر ناشتہ کیا جائیگا چنانچہ اولیں پڑاؤ پر ہی ہم سب لوگ ناشتہ سے کیا دوپہر کے کھانے سے بھی فارغ ہو لئے۔ کینیڈین راکیز کے سلسلہ میں سیر کرتے ہوئے ہم لوگ جاسپر پارک کے ایک مقام پر رکے اور کیبل کار کے ذریعہ 'سیٹیاں بجانے والے' پہاڑ کی چوٹی تک بھی گئے راکیز کے سلسلہ کی یہ اونچی چوٹی دور دور تک کے مناظر پر محیط ہے پھر واپسی کا سفر شروع کیا تو سلسلہ در سلسلہ پہاڑوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے کولمبیا گلیشیر کے دامن تک پہنچ گئے رستہ میں ایک منی سی آبشار بھی دیکھی منی سی اس لئے کہ نیاگرا فالز دیکھنے کے بعد اس آبشار کو منی سی فال ہی لگنا تھا۔ جھیلوں اور پہاڑوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہم لوگ رات کے کھانے سے پہلے مقبول صاحب کے گھر پہنچ گئے اور مرزا محی الدین کی دوا استعمال نہ کرنیکے باوجود نہایت پرتپاک استقبال سے دوچار ہوئے مسز مقبول نہایت سمجھدار اور مہمان نواز خاتون نکلیں۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ مقبول صاحب راستہ بھر جو قصیدہ پڑھتے رہے وہ محی الدین کی ہومیوپیتھی کی آزمائش کے لئے تھا اور بس ہمیں مقبول کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ میاں بیوی میں محبت بڑھانے کا یہ ایک نسخہ بھی بہت مفید ہوتا ہے اور زوداثر۔ کسی ہومیوپیتھی کی

دوائی کی ضرورت نہیں ہوتی!

اپنے بزرگ دوست تیمور احمد چغتائی صاحب سے ملنے کے لئے میں خود ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا تیمور صاحب لاہور پنجاب گورنمنٹ کے سکریٹیریٹ میں انڈر سکرٹری رہے۔ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں اس کمیشن کے نہایت ابتدائی زمانہ میں ڈائرکٹر فنانس رہے اور خدا معلوم کہاں کہاں رہے مگر احمدی رہے۔ ہر احمدی کی مدد کرنا اپنا فرض جانا اور اس فرض سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ ہمیں ان کی نوازشوں کا اندازہ تب ہوا جب خود ہمیں کالج کے نیشلائز ہونے کے بعد حکومتی سرخ فیتہ کے تلخ تر تجربات ہونا شروع ہوئے قبلہ صوفی بشارت الرحمٰن صاحب کے استعفیٰ اور استعفیٰ کی واپسی کے زمانہ میں تو ہمارا لاہور کے قیام کا اکثر حصہ تیمور صاحب کے دفتر میں گزرتا رہا تیمور صاحب چونکہ اس مشین کا حصہ تھے اس لئے دفتری اونچ نیچ سے خوب آگاہ تھے ان کی راہنمائی کے بغیر سکریٹیریٹ میں ایک قدم چلنا بھی دشوار تھا تیمور صاحب نے اپنی خدمات کا دروازہ کسی پر کبھی بند نہیں کیا ہر احمدی ان کے دفتر میں جاتا اور ان کی شفقتوں سے متمتع ہوتا تھا ہم نے خود کئی ایسے ضرورت مندوں کو تیمور صاحب کے پاس بھیجا جن کی تیمور صاحب سے ذرا سی شناسائی بھی نہیں تھی مگر تیمور صاحب نے ان کی پذیرائی میں کبھی تساہل نہیں کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ تیمور صاحب کی بہو عزیزہ نسیم تو ہماری بھانجی ہے اس کے اصرار پر ہم اس کے گھر کھانا کھانے بھی گئے۔ جہانگیر سے بھی ملاقات ہوگئی۔ یک پنتھ دو کاج۔ ٹورنٹو سے چلتے ہوئے سید حسنات احمد نے ایک لفافہ ہمارے حوالہ کیا تھا کہ سید حمید احمد صاحب کو پہنچا دیں۔ حمید ہمارے لاہور کے زمانہ کے دوست ہیں اردو کے نامور ادیب سید شفیع احمد دہلوی کے اور اپنے شوہر سے بھی زیادہ نامور ماں یعنی بیگم شفیع کے بیٹے ہیں۔ سید حمید احمد تکلیف فرما کر کہیں باہر دور سے ہمیں ملنے کے لئے تشریف لائے وہی کھلکھلاتا مسکراتا چہرہ لاہور کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ہم بیگم شفیع کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ اپنے بیٹے کا دوست ہونے کے ناطے ہم پر بہت شفقت فرماتیں۔ ان کا دستکاری پریس آڑے وقت میں جماعت کے بہت کام آتا رہا۔ میکلیکن روڈ پر حمید کی رہائش تھی یا پریس تھا بہر حال حمید اور میکلیکن روڈ سے وابستہ یادیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ حمید سے مل کر بہت سی پرانی باتیں یاد آئیں جن کے دہرانے کا موقعہ ہے نہ محل۔ چھوڑیئے رات گئی بات گئی۔

جماعت احمدیہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ قادیان کے ایک قصبہ سے اٹھنے والی تحریک اس وقت سارے عالم پر محیط ہے اور دنیا کے ہر ملک میں احمدی آباد ہیں اور اپنے اپنے ملک کے وفادار شہریوں کی حیثیت سے زندگی کر رہے ہیں کہ یہی احمدیت کے بانی کی تعلیم ہے۔ اس کتاب کا موضوع احمدیوں کے سماجی، معاشرتی اور دینی رویوں کا جائزہ لینا ہے اس جائزہ کی بنیاد قادیان اور ربوہ کے ماحول کے مطالعہ پر رکھی گئی ہے۔ وہ ماحول کیا تھا اس میں کیسے لوگ بستے تھے اور ان کی زندگی کا محور کیا تھا۔ وہ لوگ بنیادی اسلامی اخلاق سے متصف تھے اور یہی ورثہ تھا جسے وہ اپنی نسلوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

ISBN 1-882494-24 5